قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

فروری 2020 قیمت 15 ₹

ماہنامہ
اردو دنیا
نئی دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

ماہنامہ اردو دنیا
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi
قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:22، شمارہ:02، فروری 2020

مدیر : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد
نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی
مشیر : حقانی القاسمی

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:

ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت-/15روپے   سالانہ -/150روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025
فون:49539000   شعبۂ ادارت:49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم نئی دہلی۔110066
فون: 26109746، فیکس:26108159
ای میل:sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ:110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔500002
فون:040-24415194

مشمولات

اداریہ
ہماری بات — 4
خطوط
آپ کی بات — قارئین کے خطوط — 5
زبان و تعلیم
تدریس زبان اردو میں طرز ہائے تحقیق — جرار احمد — 7
نقد و نگاہ
ہری چند اختر کا نثری اور شعری اسلوب — خواجہ محمد اکرام الدین — 11

'امراؤ جان ادا' اور 'شاہد رعنا' میں نظریاتی بعد — مورا کامی آسوکا — 15
جموں و کشمیر میں ہم عصر اردو ڈراما — محی الدین زور کشمیری — 19
افسر میرٹھی کی ادبی بصیرت اور قومی نصاب تعلیم — ریاض احمد — 22
ہندوستانی مشترکہ تہذیب اور اردو سفرنامہ — الطاف احمد — 25
ترکی میں اردو زبان و ادب — امتیاز رومی — 30
یاد نظیر
نظم جدید میں نظیر کا پرتو — علیم صبا نویدی — 33
برج دیش کا سچا عاشق نظیر اکبرآبادی — نعیمہ جعفری پاشا — 35

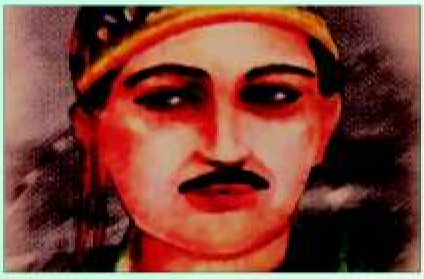

خراج عقیدت
نورالحسن نقوی — مصباح احمد صدیقی — 39

شفیع جاوید: اوراق زندگی — سید مسعود حسن — 42

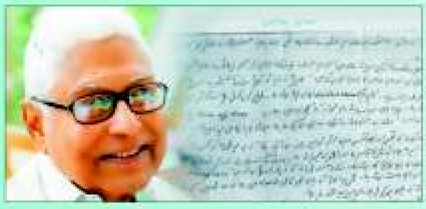

خصوصی گفتگو
اردو اور یونانی لازم و ملزوم ہیں: حکیم سید احمد خاں — عبدالحی — 45
عالمی ادبیات
ولیم شیکسپیئر کا ڈرامہ میکبتھ — محبوب حسن — 47
ابوعثمان الجاحظ: شخصیت اور ادبی امتیاز — نایاب حسن — 51
نیا آسماں نئے ستارے
اکبرالہ آبادی اور نظریۂ ڈارون — عبدالرحمٰن — 54
سوشل میڈیا اور اردو افسانہ — محمد علیم اسماعیل — 57
جنوبی ہند میں آن لائن اردو رسائل اور ویب پورٹل — ایس ٹی نوراللہ — 61
شخصیت
اختر مسلمی کا انداز شعروسخن — سلطانہ فاطمہ واحدی — 64
ناموس کا شاعر: معراج فیض آبادی — شرافت حسین — 66
جگن ناتھ آزاد کی تنقید نگاری — رئیس احمد گنائی — 68
سائنس
انفارمیشن ٹکنالوجی و سائنس کی حیرت انگیزیاں — مظہر حسنین — 71
کمپیوٹر
ریویو اور ویو — 74
کتابوں کی دنیا
تعارف و تبصرہ — ادارہ — 77

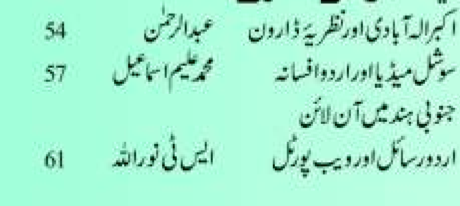

خبر نامہ
اردو دنیا کی خبریں — ادارہ — 85

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

دل چسپ کہانیاں

معلوماتی مضامین

ہنسنے ہنسانے کی باتیں

ماہنامہ

بچوں کی دنیا

دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں

قسط وار ناول

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

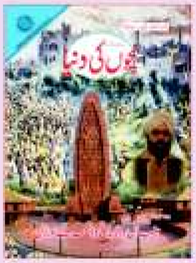

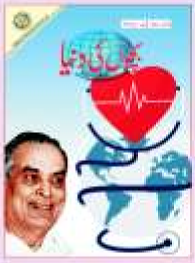

سب سے زیادہ چھپنے والا بچوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ:10 روپے　　سالانہ:100 روپے

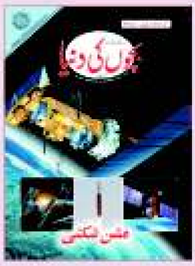

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002 فون:24415194 - 040

ہماری بات

اردو وہ زبان ہے جس کا دوسری زبانوں سے اجنبیت یا غیریت کا رشتہ نہیں ہے۔ ہر زبان اس کے لیے محبوب ہے اور دنیا کی بیشتر زبانوں سے اس نے اپنے رشتے اتنے مضبوط کیے ہیں کہ ان زبانوں کے بہت سے الفاظ و افکار بھی زبان اردو کا حصہ بن گئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے اس زبان کا عوام سے گہرا تعلق رہا ہے۔ عوامی بولیاں اور الفاظ بھی اس زبان میں شامل ہوتے رہے ہیں اور اس طرح اس کی لسانی ثروت میں اضافہ ہوتا رہا ہے۔ جذب و انجذاب کی یہی قوت ہے جس کی وجہ سے اردو نہ صرف زندہ و تابندہ ہے بلکہ پوری دنیا میں اپنی زندگی کا ثبوت بھی دے رہی ہے۔ برصغیر سے باہر اردو کی جونئی بستیاں آباد ہو رہی ہیں وہ بھی اس کا ثبوت ہیں۔

اردو نے معاشرتی اور لسانی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں اور تغیرات کو ہمیشہ قبول کیا ہے اور کسی بھی سطح پر یہ منجمد نہیں رہی ہے اور شاید یہی اس کی زندگی کا راز بھی ہے کہ یہ بدلتے وقت کی ہر آہٹ کو محسوس کرتی ہے اور ہر اس لفظ اور فکر کو قبول کرتی ہے جس سے اس کے سرمایے میں اضافہ ہو۔

اردو کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس میں بہت سارے الفاظ ہندی اور سنسکرت کے ہیں۔ فارسی اور عربی الفاظ کی بھی اچھی خاصی تعداد ہے۔ اب لسانیات کی سطح پر جو تحقیقات ہو رہی ہیں ان سے بھی بہت سے حقائق سامنے آرہے ہیں۔ اردو نے علاقائی ہندوستانی زبانوں سے بھی الفاظ لیے ہیں، خاص طور پر گجری، راجستھانی، مراٹھی اور دیگر زبانوں کے الفاظ بھی اردو میں شامل ہوتے رہے ہیں۔ اس طرح دیکھا جائے تو اردو کا جہاں علاقائی زبانوں سے بہت گہرا رشتہ ہے وہیں عالمی زبانوں سے بھی اس کا گہرا تعلق ہے اور اس تعلق کو استحکام ان تراجم کی وجہ سے بھی ملا ہے جو عالمی ادبیات یا علاقائی ادبیات کے حوالے سے اردو میں ہوتے رہے ہیں۔ دراصل کسی بھی زبان کو وسعت اور ترقی اسی وقت ملتی ہے جب وہ دوسری زبانوں سے لسانی اور فکری سطح پر اپنا مضبوط رشتہ قائم کرتی ہے۔ اردو نے اوّل دن سے ہی یہ محسوس کر لیا تھا کہ اگر اس زبان کو زندہ و متحرک رہنا ہے تو دوسری زبانوں کے علمی اور ادبی ذخیرے کو اردو میں منتقل کرنا ہوگا چنانچہ ترجمے کے بہت سے ادارے قائم ہوئے اور ان اداروں کے ذریعے بہت سی علمی اور فنی کتابوں کے اردو میں ترجمے کیے گئے۔ فورٹ ولیم کالج، دہلی کالج، دارالترجمہ عثمانیہ، شمس الامرا کا دارالترجمہ، سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی وغیرہ نے اس سمت میں بہت مثبت اور اہم رول ادا کیا ہے۔ جو زبان پہلے صرف قصیدہ، مثنوی، مرثیہ اور غزل میں محدود ہو کر رہ گئی تھی وہ رفتہ رفتہ علمی زبان بھی بنتی گئی۔ سائنسی اور سماجی علوم کے ترجمے اس زبان میں ہوئے اور ترجمے کی وجہ سے اس کا افادی دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔

آج اردو زبان کو آپ کم مایہ نہیں کہہ سکتے کیونکہ یہ وہ زبان ہے جس میں جہاں عالمی ادبیات کے شاہکار کے تراجم موجود ہیں، وہیں مختلف علوم و فنون کے ترجمے بھی اس زبان میں کیے گئے۔ ترجمے کا عمل جاری ہے، مختلف زبانوں سے ترجمے آج بھی ہو رہے ہیں اور خوشی کی بات یہ ہے کہ مطالعاتِ ترجمہ کے شعبے بھی قائم ہیں جہاں ترجمے کے نظری اور عملی مباحث پر گفتگو ہوتی ہے وہیں ترجمے کے دیگر مسائل پر بھی غور کیا جاتا ہے۔

ترجمے نے جہاں ہمیں بہت سے الفاظ و افکار دیے ہیں وہیں ثقافتی سطح پر بہت سے شکوک وشبہات اور بدگمانیوں کو بھی دور کیا ہے۔ دراصل ترجمہ کے ذریعے ہی ہم کسی قوم یا معاشرے کے مزاج سے آگاہ ہوتے ہیں اور ان کے علمی آثار اور ثقافتی بیانیے سے بھی ہماری واقفیت ہوتی ہے۔ آج جبکہ مختلف قوموں کے درمیان کشمکش اور تصادم ہے تو ایسے میں ترجمہ ایک ایسا وسیلہ بن کر سامنے آیا ہے جس کے ذریعے ہم اس تصادم کا خاتمہ کر سکتے ہیں اور تفاہم کی فضا قائم کر سکتے ہیں۔ اس لیے آج ضرورت ہے کہ ترجمے پر زیادہ زور دیا جائے۔ خاص طور پر ہندوستانی تناظر میں اس کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے کیونکہ ہندوستان کی بہت سی علاقائی زبانیں ہیں جن میں بیش قیمت علمی و ادبی ذخیرہ موجود ہے مگر ہماری رسائی ان ذخیروں تک نہیں ہے۔ ترجمے کے ذریعے ہم ان علاقائی زبانوں سے نہ صرف قریب ہو سکتے ہیں بلکہ مشترکہ اقدار و افکار کی جستجو بھی کر سکتے ہیں۔

ہندوستان ایک کثیر لسانی اور تہذیبی ملک ہے، یہاں بہت سی ثقافتیں اور تہذیبیں ہیں اور ان تہذیبوں کے درمیان وحدت اور اشتراک کی تلاش صرف ترجمے کے ذریعے کی جاسکتی ہے۔ ماضی میں ترجمے نے ہی مختلف افکار و اقدار کے درمیان مماثلات اور مشترکات کی نشاندہی کی ہے۔ آج بھی ہم ترجمے کے ذریعے دوسری قوموں کے تہذیبی، معاشرتی اقدار و اطوار سے واقف ہو سکتے ہیں اس لیے آج ہمیں اپنے ترجمے کے دائرے کو اور وسیع کرنے کی ضرورت ہے۔

عقیل احمد

شیخ عقیل احمد

آپ کی بات

✍ 'اردو دنیا' دسمبر 2019 وصول ہوا۔ اس میں درجن بھر سے زائد مشمولات اور اُن کی ذیلی سرخیاں شامل ہیں۔ 'ہماری بات' کی تمام تر عبارت پر تہذیبی، لسانی اور نسلی انتشار و تصادم کے گھٹاٹوپ اندھیرے سایہ فگن ہیں۔ پر یہ بھی تسلی دی گئی ہے کہ ایسے ہی حالات میں ارباب قلم سماج کی مثبت رہنمائی کرتے ہیں اور اب بھی یہ مقتدر ہستیاں معاصر دنیا کے لیے روشنی کے مینارے ثابت ہوں گے۔ اگر ایسا ہوا تو زہے نصیب، ورنہ انسان اتنا نادان شاید کبھی نہ رہا ہوگا جتنا کہ آج علم کے شراروں میں گمراہ ہے۔

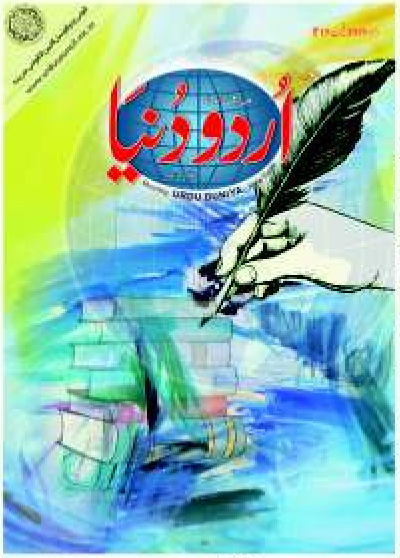

'خطوط' میں قارئین کے خیالات درج ہیں۔ کچھ خطوط میں توصیف کی گئی ہے، جبکہ چند مراسلوں میں مشورے بھی دیے گئے ہیں۔ اب دیکھیے ان میں کون سی باتیں قابل اعتبار و اعتنا ہیں۔ اُردو رسائل میں روایتی انٹرویو سے انٹرویو دینے والا اکثر اوقات زیر بحث مسئلہ یا موضوعات سے بُعد اختیار کر جاتا ہے اور جو معلومات فراہم کرتا ہے اُن میں سے بیشتر فرسودہ ہوتے ہیں۔ جبکہ 'اردو دنیا' کا مقصد اُردو زبان کے بنیادی مسائل سے واقفیت حاصل کرنا ہوتا ہے جس کی خاطر ہر شمارے میں 'سوالنامہ برائے انٹرویو' دیا جاتا ہے تاکہ قارئین اُردو زبان کی حقیقی صورتحال سے واقف ہو جائیں۔ اسی سوالنامے کے مطابق ص 8 پر جو معلومات دی گئی ہیں، ان کے مطابق اگر موجودہ صدی میں کوئی زبان سائنسی اور سماجی مواد سے محروم رہے تو گویا اس کا سب سے زیادہ نقصان اس کے قاری کو ہی ہوگا۔ اس لیے اُردو میں خواندگی کو وسعت دینے کے ساتھ ساتھ اس میں سائنسی و سماجی علوم کا مواد مہیا کر کے خوب ترقی دی جا سکتی ہے۔ دراصل اس تحریر میں وہی کچھ کہا گیا ہے جو 'اردو دنیا' کا عین مقصد ہے۔ 'نقد و نگاہ' میں چھ مقالے شامل ہیں۔ سبھی کی پیشکش عمدہ اور مقاصد واضح ہیں، لیکن ان میں بیشتر کو تنقیدی تصور کے بجائے خصوصیات کلام کی روایتی پیشکش پر محمول کیجیے اور کچھ مقالات کو کسی خطہ کی ادبی تاریخ کا جائزہ گردانا جا سکتا ہے۔ 'یادِ رفتگاں' کے ذیل میں تین ادبی شخصیات کے متعلق زندگی اور موت کے سفر پر تفصیلات درج ہیں۔ 'روشنی کے مینار' کے زیر سایہ دو روشن مینارے دراز کیے گئے ہیں۔

''خصوصی گفتگو' کے دوران ڈاکٹر عبدالحی نے محترم شفیق الحسن صاحب سے عمدہ گفتگو کی ہے۔ 'سلسلہ صحافت' میں بیسویں صدی کی عربی صحافت کا ذکر ہے۔ اگر متذکرہ بالا گفتگو کو بھی اسی سلسلۂ صحافت کے ذیل میں رکھا جاتا تو کیا مضائقہ تھا؟ خیر 'نیا آسمان نئے ستارے' میں پانچ مقالے دیے گئے ہیں۔ اُردو ادب میں ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ بالخصوص 'ترجمے کے ذریعہ اُردو کا فروغ' نہایت قابل تعریف مقالہ ہے جس کا لب لباب یہ کہ ترجمے کے ذریعہ علم و فن کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ اُردو دنیا میں اگرچہ کہ تراجم کا سلسلہ قدیم زمانے سے جاری ہے، تاہم اس کاز میں گہرائی و گیرائی کے ذریعہ مزید استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ 'کمپیوٹر' کے ذیل میں 'تبصرے اور حوالہ جات' خالص تکنیکی مواد ہے جو کمپیوٹر سیکھنے والے طلبہ کے لیے نہایت مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ 'کتابوں کی دنیا' کی سیر درکار ہو اور آپ حسب دلخواہ کتب خریدنا چاہتے ہوں تو زیر نظر شمارہ میں 'تعارف و تبصرہ' کے ضمن میں مندرج کوئی آٹھ ابواب کے ذیل میں 15 کتب پر دیے گئے تبصروں پر نظر دوڑائیں۔ اس سے آگے عالمی اُردو نامہ پیش نظر ہے جس میں دبئی میں منعقدہ تقریب اور شارجہ لائبریری سے متعلق خبریں درج ہیں اور پھر 'خبرنامہ' قومی اُردو کونسل کی سرگرمیوں میں اُردو تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں، خراج عقیدت اور وفیات کے بارے میں خبریں دی گئی ہیں۔ جناب شہنواز خرم صاحب، ریسرچ آفیسر قومی اُردو کونسل، نئی دہلی کی والدہ ماجدہ کے سانحہ ارتحال کے بارے میں پڑھ کر افسوس ہوا، پر کیا کر سکتے ہیں۔ ہر زندگی کا یہی مآل ہے۔ پروردگار مرحومہ کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین۔

✿ **مصطفی ندیم خان غوری**: بی 11، گرین ویلی، روضہ باغ، اورنگ آباد، مہاراشٹر

✍ 'اردو دنیا' دسمبر کے شمارے کے تمام تر مشمولات معیاری ہیں اور سرورق بھی خوبصورت ہے۔ مضمون 'ذرا سی دیر میں.....' پہلی بار ایک استاذ اور اس کے فرماں بردار شاگرد ظہیر حسن ظہیر ان دونوں کی باہم بے پناہ عقیدت اور محبت کی بخوبی عکاسی کرنے والا ہے اور مستزاد، اپنے موضوع کا ایک صاف شفاف آئینہ ہے۔ صفحہ 36 پر شعر 'کبھی تو کوئی.....' کے شاعر کا نام عرفان صدیقی ہے، جن کی شاعری پر ایک مکمل تنقیدی کتاب پانچ چھ برس قبل دہلی کے ایک مطبع سے شائع ہو کر مقبول عام بھی رہی ہے۔ ہر ایک شعر کے خالق کا حوالہ دینے سے اس شاعر سے قارئین کی واقفیت میں بھی اضافہ ہوا کرتا ہے۔ میری ایک اور تجویز ہے کہ ادارہ مستقبل میں کسی بھی ایک یا دو شعبوں میں دو ہم پیشہ اشخاص، دو پڑوسیوں، دو دوستوں۔ رشتے داروں اور اسی طرح دو ہم عصر اُدبا وغیرہ کے باہمی رشتوں کے بارے میں بھی مختلف مضامین شائع کرنے پر غور و خوض کرے۔

اسی شمارے میں ایک مشہور و مقبول عام صحافی جناب شفیق الحسن کے ساتھ ڈاکٹر عبدالحی کے موقر مشافہے میں معقول سوالات اور اتنے ہی مناسب جوابات کو پیش کیا گیا ہے۔ اس اعلیٰ و ارفع مصاحبے کے تحت عجلت میں ایک غلطی چلی گئی ہے۔ مثلاً صفحہ 45 پر ایک سوال ہے۔ ''کیا صرف اردو مسلمانوں کی زبان ہے؟'' اس سے تو یہ مفہوم اخذ ہوتا یا پھر ہو سکتا ہے کہ اردو زبان کے علاوہ بھی مسلمانوں کی دیگر کئی زبانیں قرار دی جا سکتی ہیں یعنی پنجابی، انگریزی، ہندی وغیرہ۔ اس ناچیز کی دانست میں فقرہ اس طرح ''کیا اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے؟'' ہونا تھا کیونکہ یہی مفہوم مقصود بھی تھا۔

جناب محمد اقبال نے گورونانک دیوجی پر ان کے 550 سالہ عرصہ ہو جانے اور اس سے متعلقہ متعدد تقریبات، جشنوں کے اہم موقع پر ایک برمحل مضمون پیش کیا ہے، جو کہ ادارے کی قابلِ مدح دور اندیشی کا مظہر ہے۔ اس ناچیز کی دانست میں اس مقالے میں زبان واملا کے معدودے چند اغلاط چلے گئے ہیں مثلاً صفحہ 37 پر 'جپ جی صاحب' کے شہرۂ آفاق مول منتر میں 'سیٖبھ' غلط لفظ کی بجائے 'سیٖبھم' لفظ ہونا چاہیے تھا۔ اگلے ہی صفحے پر 'ویدک' صفت کے بعد 'سنسکرِت' اسم کا درج کرنا مناسب تھا۔ صرف شری گورو گرنتھ صاحب ہی کو ایک 'استاذ' کا درجہ دیا گیا ہے (''گورو مانیو گرنتھ'')۔ جناب ڈاکٹر محمد اقبال نے پنجابی اشلوکوں کا نہایت صحیح ترجمہ پیش کیا ہے۔ ص 37 پر تیسرے کالم میں 'جات جنم....' والے اشلوک کے ترجمے میں 'تمہارے' صفت لفظ کی جگہ بطور عاجزی و انکساری 'تیرے' لفظ کا تصرف زیادہ موزوں ہوسکتا تھا۔

جناب ابواللیث جاوید نے ڈاکٹر اقبال جاوید کی مختلف الجہات شخصیت پر جامع مقالہ تحریر فرما کر ہماری واقفیت میں خاصا اضافہ کیا ہے۔ عالمی گاؤں کے تحت محترمہ سعدیہ صدف کا تحقیقی مضمون اردو کے تحفظ وفروغ جیسے اہم موضوع کے ساتھ کاملاً انصاف کرنے والا ہے۔ اس میں صفحہ 51 پر 'آریاؤں' کی بجائے 'آریوں' لفظ اور 'حب الوطنی' کی جگہ 'حب الوطن' لفظ کا استعمال درکار تھا ہندی لفظ 'اکھوا' کی جگہ 'انکھوا' چاہیے تھا۔ ان معدودے چند اغلاط کے باوصف یہ غضب کا ایک تحقیقی مضمون گردانا جائے گا۔

اسی صفحے کی آخری سطر میں معلومات کے تین ذرائع کا شمار کرتے وقت اردو، انگریزی اور ہندی کے رسم الخط کے ساتھ پنجابی زبان اور اس کے رسم الخط گرمکھی کو چھوڑ دینا صحیح نہیں ہے، کیونکہ اس میں بھی مختلف ویب سائٹوں میں مطلوبہ معلومات بآسانی دستیاب ہیں۔ آخری صفحے پر دوئم کالم میں 'آرا' جمع لفظ کی بجائے 'رائے' واحد لفظ کا استعمال ہی درکار تھا، کیونکہ ایک ہی رائے پیش کی گئی ہے۔

✪ **ڈاکٹر کرشن بھاؤک** : کوٹھی نمبر A-201، گورونانک نگر گلی نمبر K-18، A-201، پٹیالہ (پنجاب)

✍ 'اردو دنیا' دسمبر کا شمارہ بروقت موصول ہوا۔ ہماری بات کے تحت مدیر شیخ عقیل احمد نے زبان وادب کے مسائل اور حالات پر دانش ورانہ انداز میں گفتگو کی ہے۔ سماج میں محبت کے جذبوں کو عام کرنا ہے۔ ادیب وشاعر اپنی تخلیقات کے ذریعے یہ کام کر سکتے ہیں۔ مدیر کہتے ہیں ''آج جب کہ پوری دنیا میں انتشار کی ایک عجب سی کیفیت ہے تو ایسے میں اہل قلم کی ذمے داریاں اور بڑھ جاتی ہیں کہ وہ کبیر، بلھے شاہ، امیر خسرو اور دیگر صوفیوں سنتوں کی طرح محبت کا ساز چھیڑیں اور اپنے نغمے سے معاشرے کے اندھیرے کو دور کر کے روشنی پھیلائیں۔ مصباح انظر نے اپنے انٹرویو میں کہا کہ زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے سائنس اور ٹکنالوجی سے رابطہ ضروری ہے، ٹھیک ہے لیکن نئی نسل اردو سے نابلد ہوتی جارہی ہے۔ اردو والے اپنے بچوں کو انگلش میڈیم سے پڑھا رہے ہیں۔ اگر آج نسل نو اردو سے نابلد ہوگی تو آئندہ زمانوں میں اردو کے مستقبل کی کیا ضمانت ہے۔ ریاست تلنگانہ میں اردو کا موقف ٹھیک نہیں ہے جامعات میں ایم اے اردو کی 30 ستمبر تکمیل نہیں رہی ہیں۔ سوائے UoH اور اردو یونیورسٹی کے کیونکہ وہاں پر ایم اے، ایم فل، Ph.D طلبہ کے بالترتیب 15000,3000 اسکالرشپ دی جاتی ہے اس لیے سیٹ فل ہوجاتی ہیں۔ ریاستی جامعات میں طلبہ کو ایسی سہولت نہیں ہے، بہرحال اردو کے اساسی وبنیادی کام پر توجہ دینا وقت کی ضرورت ہے۔ معصوم شرقی نے خاموش غازی پوری ایک مقبول عوامی شاعر 1932۔ 1981 ان کی ادبی خدمات فکر وفن پر اچھا مضمون لکھا ہے۔ ابوبکر عباد نے ملک کی تعمیر وترقی میں اردو زبان وادب کا کردار میں زبان وادب کے رول کو اہم بتایا ہے۔ زبان وادب، ملک، قوم، معاشرہ وسماج کی تشکیل کرتے ہیں اور سنوارتے ہیں۔ اس کی اصلاح سے صحت معاشرہ بنانے کی کاوش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں ملک کے پہلے اردو شاعر حضرت امیر خسرو نے وطن عزیز کو نہ صرف ایک نئی زبان میں صوفیانہ شاعری، پہیلیاں اور کہہ مکرنیاں دیں بلکہ ہندوستانی موسیقی کو اپنی ایجاد کردہ متعدد راگ راگنیوں سے سجایا، اُسے مالامال کیا۔ فیروز عالم نے اختر شیرانی کی نظم نگاری جو رومانیت سے بھرپور ہے، اچھا تجزیہ کیا۔ سہیل عظیم آبادی کی خاکہ نگاری میں موصوف نے ان کے فن پر بحث کی ہے۔ قمر النسا نے لئیق صلاح کی علمی وادبی خدمات کو تفصیل سے پیش کیا ہے۔ عبدالحی نے شفیق الحسن کا جو انٹرویو لیا ہے وہ معلوماتی ہے۔ اردو زبان وادب کے بغیر ہماری شخصیت ادھوری ہے۔ اردو پڑھنے سے شخصیت سازی کردار سازی اور اخلاق سازی ہوتی ہے۔ سعدیہ صدف نے آج کے عالمی تناظر میں اردو کے تحفظ اور فروغ کی بات کی ہے۔ اس شمارے میں متنوع موضوعات پر مضامین ہیں جو ادبی بصیرت لیے ہوئے ہیں۔

✪ **ڈاکٹر محمد ناظم علی**: مکان نمبر 335-7-17، برہمن واڑی، یاقوت پورہ، حیدرآباد، تلنگانہ

✍ ماہنامہ 'اردو دنیا' زیر مطالعہ رہا اور پابندی سے مطالعہ کرتا آرہا ہوں۔ ڈاکٹر عقیل صاحب کے زیر سرپرستی اردو دنیا کو نئی روشنی ملی ہے۔ سارے مضامین ترتیب اور سلیقے سے مزین ہیں۔ اداریہ سے لے کر خبرنامہ تک تمام مواد معیاری اور معلوماتی ہیں۔ محمد دارا شکوہ بے حد معلوماتی مضمون ہے۔ اختر الایمان پہ جو مضمون قلم بند کیا گیا، کافی معیاری ہے۔ تبصرہ وتعارف بھی معلومات میں اضافہ کی کڑی ہے۔ اردو دنیا ہر زاویہ سے صوری اور معنوی اعتبار سے قابل تحسین ہے۔ میری نیک خواہشات اور نیک دعائیں اردو دنیا کے ہمراہ ہیں اور مستقبل میں بھی رواں دواں رہیں گے، ان شاء اللہ!

✪ **مختار میڈیکوز**: راجہ بازار، کولکاتا، مغربی بنگال

قلم کاروں سے گزارش

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں ہر شعبۂ حیات سے تعلق رکھنے والے افراد کے ذوق اور سطح کا خیال رکھا جاتا ہے۔ ادب کے علاوہ دیگر موضوعات پر بھی تحریریں شائع کی جاتی ہیں مگر ایسے مضامین کو ترجیح دی جاتی ہے جو سائنسی، سماجی، ثقافتی اور تعلیمی شعبوں میں ہونے والی ترقیات کا احاطہ کرتے ہوں یا روزگار کے حصول میں معاون وسائل کی نشان دہی کرتے ہوں۔ یہ ہر طبقے کا رسالہ ہے اسی لیے اس میں تنوع کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ ماہنامہ 'اردو دنیا' کی خوش بختی ہے کہ اسے ہندوستان بھر کے قلم کاروں کا تعاون حاصل ہے۔ ہر موضوع پر ہمیں مضامین ملتے رہتے ہیں۔ لیکن تمام مضامین کی فوری اشاعت ممکن نہیں ہے۔ اس لیے اب قلم کاروں سے گزارش ہے کہ اپنے مضمون کے ساتھ چند سطروں میں مضمون کے اہم نکات کی نشان دہی فرمادیں تاکہ ترجیحی طور پر مضمون کو شامل اشاعت کیا جاسکے۔ برائے مہربانی اپنے مضامین، خبروں اور خط کے ساتھ **اپنا موبائل نمبر اور مکمل پتہ مع پن کوڈ ضرور فراہم کریں۔** معاوضے کے لیے بھیجے گئے فارم میں اپنے قلمی اور بینک اکاؤنٹ میں درج نام کی الگ الگ نشان دہی کریں۔

جرار احمد

تدریسِ زبانِ اردو میں طرز ہائے تحقیق

تحقیق ایک ایسا شعبہ ہے جس سے دنیا میں روز بروز نئی نئی چیزیں منصۂ شہود پر آرہی ہیں۔ فی زمانہ جتنی بھی ترقیاں ہم دیکھ رہے ہیں اس کا پورا سہرا تحقیق کو ہی جاتا ہے اور آج بھی ہمارے محققین تحقیق کے ذریعہ نئے نئے دریچوں کو وا کر کے ہماری دشواریوں کو آسانیوں میں بدلنے کی راہ میں پیہم سرگرداں ہیں۔ تحقیق سے ہی چیزیں ابھر کر سامنے آتی ہیں، پھر وہی چیزیں ہمارے لیے وسیلہ بنتی ہیں اور انسانی حیات کو آسان تر بناتی ہیں۔ تحقیق کے لیے جن اشیا کا استعمال کیا جاتا ہے یا جن اشیا کو بروئے کار لا کر تحقیق کی جاتی ہے وہ تحقیقی وسائل کہلاتی ہیں (گرچہ یہ وسائل بھی کسی اور تحقیق کی رہین منت ہوتے ہیں) نیز محققین کو دوران تحقیق جن مشکلات اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ تحقیق کے مسائل کہلاتے ہیں۔

جب ہم اردو تحقیق پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ دیکھتے ہیں کہ اردو تحقیق کا دائرہ بھی بہت وسیع ہے اور ملک و بیرون ملک کی جامعات میں ہزاروں اسکالرس تحقیق کی راہ میں سرگرداں ہیں، لیکن بے چینی اس وقت محسوس ہوتی ہے جب ہم ان میں سے اکثر کو ایک رنگ سے رنگا ہوا دیکھتے ہیں مثلاً کوئی فیلوشپ کے لیے کر رہا ہے تو کوئی ڈگری اور اس طرح کی بہت سی وجوہات کا اندازہ ان اسکالرس کی تحقیق کو دیکھنے یا ان سے گفت وشنید کے بعد ہوتا ہے، ہمیں فیلوشپ اور ڈگری کی اہمیت سے انکار نہیں۔ علاوہ ازیں کوئی افسانہ نگاری پر تحقیق کر رہا ہے، کوئی ناول کے فن پر تو کوئی شخصیت شناسی وغیرہ پر، اس طرح کی تحقیق اپنی جگہ درست ہے، میری نظر میں آج کے اس جدید دور میں درج ذیل یا اس طرح کے جدید مسائل اور عنوانات پر تحقیق کی اشد ضرورت ہے۔

- موجودہ دور میں اردو تحقیق۔
- موجودہ دور میں تحقیق کے وسائل اور اردو۔
- موجودہ دور میں ٹکنالوجی شناسی اور اردو تحقیق میں اس کی اہمیت۔
- جدید ٹکنالوجی کے استعمال سے اردو اکتساب اور تحقیق وتدریس کو آسان تر اور مؤثر بنانا۔
- جدید آلات کا اردو لرننگ اور ٹیچنگ میں استعمال۔

درج بالا نکات پر میری نظر میں تحقیق کے لیے کوئی مائل نظر نہیں آتا ہے مگر ہو سکتا ہے کہ میری دانست سے باہر کچھ لوگ اس امر کی طرف مائل ہوں۔ اس سمت اس قدر کم رغبت ہونے کی وجہ نگراں بھی ہو سکتے کہ وہ اس کو غیر ضروری اور اردو زبان وادب سے الگ سمجھتے ہوں یا اس کی وجہ تکنیک سے بیزاری بھی ہو سکتی ہے اور اس بیزاری کی وجہ تکنیک سے ناواقفیت یا کچھ اور ہو سکتی ہے۔ بعض نگراں کے ساتھ ساتھ بعض اسکالرس کا بھی وہی حال ہے حالاں کہ ہر کوئی اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے کہ ٹکنالوجی کے بغیر آج کی زندگی ادھوری ہے بلکہ مفلوج کہوں تو بے جا نہیں اور اس سے بیزاری یا غفلت برتنے کی صورت میں ہم پچھڑ جائیں گے، بلکہ پچھڑ گئے ہیں۔ ان تمام چیزوں سے آگاہی کے باوجود اس امر پر تحقیق کر کے راہیں ہموار کرنے کے لیے بہت کم ہی لوگ آگے آرہے ہیں، جب کہ اگر ہم انگریزی زبان وادب کی بات کریں تو وہاں ٹکنالوجی کی طرف صرف رجحان ہی نہیں بلکہ وہ لوگ اردو کی بہ نسبت بہت زیادہ کام بھی کر چکے ہیں اور کر بھی رہے ہیں، شاید اس لیے کہ انگریزی زبان ٹکنالوجی کی زبان ہے یا پھر ٹکنالوجی میں انگریزی زبان کا استعمال ہوتا ہے جس کے نتیجے میں جو مقام ومرتبہ اور شناخت English Language Teaching(ELT) کو عالمی سطح پر حاصل ہے وہ Urdu Language Teaching (ULT) کو نہیں۔ ابھی تک یو ایل ٹی پر وہ کام نہیں ہوا جو ای ایل ٹی پر ہوا اور ہو رہا ہے۔ عالمی سطح پر ای ایل ٹی کی طرح یو ایل ٹی کی کوئی ویب سائٹ نہیں ہے کہ لوگوں کو اس سے آگاہی ہو۔ ای ایل ٹی کے لیے جتنی تحقیق ہوئی اور ہو رہی ہے وہ بھی پوسٹ گریجویٹ کی سطح پر، اردو میں یو ایل ٹی کے لیے پی ایچ ڈی کی سطح پر بھی اتنی ریسرچ میری معلومات کے حساب سے نہیں ہوئی ہے۔

اس وقت شاید ہی کوئی ایسی یونیورسٹی ہوگی جہاں پر ایم اے اردو کی سطح پر مقالہ (Dissertation) لکھا جا رہا ہوگا۔ جب کہ کئی ایک ایسی جامعات ہیں جہاں پر

ایم اے انگریزی، ایم اے سیاسیات، تاریخ، سوشل ورک وغیرہ جیسے دوسرے مضامین میں پی جی کی سطح پر بھی مقالہ لکھنا لازمی ہوتا ہے۔ اس ضمن میں یہ بات عرض کرتا چلوں کہ زیادہ تر ذہین و فطین طلبا پی جی کے بعد تنگی کی وجہ یا پھر جلدی پیسہ کمانے کی خاطر نوکری کے لیے چلے جاتے ہیں اور پی ایچ ڈی میں ایسے لوگوں کو داخلہ مل جاتا ہے جو گھر سے معاشی طور سے مضبوط ہوتے ہیں لیکن دماغی اور تعلیمی طور سے کتنے مضبوط ہوتے ہیں اس کے بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ پروفیسر گیان چند نے ایسے لوگوں کو 'بوالہوس' کہا اور یہ بھی کہا کہ ایسے لوگوں کو تحقیق کی راہ سے دور رکھا جائے۔ ایسی صورت میں اگر پی جی لیول پر ہی مقالہ لکھنا لازمی قرار دے دیا جائے تو ایسے ذہین و فطین طلبا سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے اور نوجوان نسل کے نئے دماغ نئی سوچ ان مقالوں میں قلمبند ہوں اور اس میں ہونے والے نادر اور اچھے کام کو پی ایچ ڈی میں آنے والے طلبا زیادہ بہتر طریقے سے آگے بڑھائیں تو ممکن ہے کہ اس طرح سے اردو تحقیق کا منظرنامہ سرعت کے ساتھ بدل جائے اور پوری دنیا اس سے فائدہ اٹھائے۔ مقالہ لکھنے سے طلبا کی سوچنے سمجھنے اور پڑھنے لکھنے کی صلاحیت میں بہتری ہوتی ہے اور ان مضامین کے طلبا بلا جھجک جدید آلات کی مدد سے سیمینار میں اپنا پیپر پریزینٹ کرتے ہیں اور ریسرچ میں داخلے کے بعد ان کے اعتماد میں اور اضافہ ہو جاتا ہے جبکہ دوسرے مضامین کے برعکس اردو میں پی جی کے طلبا کو مقالہ، سیمینار وغیرہ کا موقع نہیں دیا جاتا ہے یا پھر موقع مل جاتا ہے تو ان میں سے اکثر شرکت سے گھبراتے ہیں حتیٰ کہ پی ایچ ڈی میں داخلے کے بعد بھی ایک ڈیڑھ سال تک گھبراہٹ کا شکار رہتے ہیں۔ اردو طلبا کو اگر پی جی کی سطح سے ہی ان تمام چیزوں کا موقع دے دیا جائے اور ساتھ ہی ان کو موضوع کی آزادی کے ساتھ ساتھ آج کے زمانے کی تکنیک کی طرف ترغیب دی جائے تو یقیناً آئندہ کچھ سالوں میں اردو تحقیق کا منظرنامہ کچھ اور ہوگا اور تب کوئی یہ نہیں کہہ سکے گا کہ اردو کے طلبا اور اردو زبان کمتر ہے اور اردو زبان آئی سی ٹی کی زبان نہیں ہے۔

آج آئی سی ٹی کی اس صدی میں کسی بھی میدان میں تحقیق کرنے کے لیے وسائل کی کمی نہیں ہے اور اگر ہم مان بھی لیں کہ اردو میں کمی ہے تو اس کی وجہ کوئی دوسرا نہیں ہم خود ہیں کیوں کہ آج جو وسائل ہمارے سامنے موجود ہیں انھیں ہم خود اتنا استعمال نہیں کر پا رہے ہیں جتنا کہ ہمیں کرنا چاہیے۔ آج ہم کس حد تک اپنی تدریس و تحقیق اور ریسرچ پیپر کے لیے گوگل کے آلات جیسے گوگل فارم، اشتراکی اکتساب، گوگل سلائڈ/سائٹ، گوگل کلاس روم یا اس جیسے آئی سی ٹی کے آلات کا استعمال کر رہے ہیں؟ اسی طرح سے کتنے لوگ ہیں جو اپنی تدریس کو موثر بنانے کے لیے نئی نئی چیزیں، معلومات اور ویڈیوز کی تلاش و تحقیق کر کے ان کا کلاس روم میں استعمال کرتے ہیں؟ کتنے لوگ اس امر پر تحقیق کر رہے ہیں کہ کس طرح سے طلبا کی سننے، بولنے، پڑھنے اور لکھنے کی مہارتوں (Writing skills) کے ساتھ اردو میں لکھنے کی صلاحیت (Urdu Writing Competency) میں اضافہ کیا جا سکتا ہے؟ اور کس طرح سے ان سب معاملات میں جدید ٹکنالوجی سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے؟ اگر آپ کہیں گے کہ ان کا اردو ادب اور اردو والوں سے کوئی تعلق نہیں ہے تو میں آپ سے، سب سے پہلے یہی پوچھوں گا کہ ان سب کا انگریزی ادب اور انگریزی والوں سے کس طرح سے تعلق ہے؟ اگر یہ مان بھی لیں کہ ان سب کا اردو سے کوئی تعلق نہیں ہے تو اس طرح کا تعلق بنانے سے فائدے کے علاوہ اردو کا کیا نقصان ہے؟ جہاں تک میں سمجھتا ہوں اردو تحقیق کو اب اپنا رخ بدلنا ہی ہوگا۔

ناول، افسانہ، داستان وغیرہ پر بہت تحقیق ہو چکی اور ہو رہی ہے۔ اب ہمیں اس بات پر زیادہ سے زیادہ تحقیق کرنی ہوگی کہ کس طرح سے کسی افسانہ کو فلما کر اس کی تدریس کو موثر بنا سکتے ہیں، کس طرح سے کون سے طریقۂ کار، ماڈل اور اپروچ کے ذریعہ سے ناول، نظم وغیرہ کو پڑھائیں کہ اس کے تمام کردار و کیفیات اور مناظر طلبا کے اذہان و قلوب میں نقش ہوتے چلے جائیں۔ ان سب کے لیے اگر ہم آج کی تکنیک کا استعمال نہیں کریں گے تو یہ امر بہت مشکل ہوگا کیوں کہ آج کی یہ 4جی نسل سب سے زیادہ دلچسپی انھیں سب تکنیکی آلات میں لے رہی ہے تو کیوں نہ ہم انھیں آلات کا مثبت استعمال کر کے ان کے اکتساب میں اضافہ کا ذریعہ بنیں اور جب ہم ان تمام چیزوں کو نئے آلات اور تکنیک سے جوڑ دیں گے تو کوئی بھی شخص، کسی بھی وقت، کہیں سے بھی اکتساب کر لے گا، جو اردو لرنرس اور اردو سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے بھی اور اردو کے فروغ میں بھی معاون و مددگار ثابت ہوگا۔ جب ہم اسے آج کی نئی تکنیک سے مربوط کریں تو اس بات کا خاص خیال رکھیں کہ وہ مواد ایک سے زیادہ زبانوں میں ہو یا کم از کم انگریزی زبان میں بھی ہو اور ساتھ ہی اسے دوسری زبانوں میں ٹرانسلیٹ کرنے والے ٹول سے بھی جوڑ دیا جائے جیسا کہ آج کل اگر ہم کسی مواد کو کسی دوسری زبان میں دیکھتے ہیں تو وہاں ٹرانسلیٹ کا ایک بٹن ہوتا ہے اور جیسے ہی ہم اس پر کلک کرتے ہیں وہ پورا مواد کسی اور زبان سے انگریزی یا ہماری منتخب شدہ زبان میں ہو جاتا ہے ایسا کرنے سے پوری دنیا زبان کی قیود سے بالاتر ہو کر اردو ادب سے متعارف ہو جائے گی اور لوگ اس کی خوبیوں اور اس کی فکر و فلسفہ سے واقف ہو جائیں گے۔ اردو میں جو سرمایہ ہے وہ کسی اور ادب سے قطعاً کم نہیں ہے اگرچہ میں نے دنیا کے پورے ادب کا مطالعہ نہیں کیا ہے پھر بھی یہ بات بلا مبالغہ کہہ سکتا ہوں کہ ابن صفی جیسا جاسوسی ناول نگار کسی ادب میں نہیں، آج بھی کسی ادب میں دوسرا غالب، مشتاق احمد یوسفی وغیرہ پیدا نہیں ہوئے اسی لیے یہ اور ضروری ہو جاتا ہے کہ ان کی فکر ان کے فلسفہ کو دنیا کے سامنے لائیں، اس کے لیے ہمیں ریسرچ کرنی ہوگی اور وہ بھی روایت سے ہٹ کر۔

آج ہم کس حد تک اپنی تدریس و تحقیق اور ریسرچ پیپر کے لیے گوگل کے آلات جیسے گوگل فارم، اشتراکی اکتساب، گوگل سلائڈ/سائٹ، گوگل کلاس روم یا اس جیسے آئی سی ٹی کے آلات کا استعمال کر رہے ہیں؟ اسی طرح سے کتنے لوگ ہیں جو اپنی تدریس کو مؤثر بنانے کے لیے نئی نئی چیزیں، معلومات اور ویڈیوز کی تلاش و تحقیق کرکے ان کا کلاس روم میں استعمال کرتے ہیں؟ کتنے لوگ اس امر پر تحقیق کر رہے ہیں کہ کس طرح سے طلبا کی سننے، بولنے، پڑھنے اور لکھنے کی مہارتوں (Writing skills) کے ساتھ اردو میں لکھنے کی صلاحیت (Urdu Writing Competency) میں اضافہ کیا جاسکتا ہے؟

فی زمانہ وسائل کی کمی نہیں ہے اور اگر کمی ہوگی بھی تو استعمال نہ کرنے کی وجہ سے ہم اسے اجاگر نہیں کر پاتے ہیں، اگر استعمال کے ساتھ ساتھ ان کو اجاگر بھی کیا جائے تو وہ خامیاں اور کمیاں جلد دور ہو جائیں کیوں کہ اگر کوئی شخص وسائل بنا سکتا ہے تو اس میں پیدا شدہ خامیوں کو دور بھی کر سکتا ہے بشرطیکہ اسے ان خامیوں سے واقف کرایا جائے۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہم میں جو لوگ استعمال کرنا جانتے ہیں تو استعمال کے وقت اگر کوئی پریشانی یا رکاوٹ سامنے آتی ہے تو اس کو حل یا دور کرنے کے لیے کسی سے رجوع ہونے کی بات تو درکنار اس کے خالق کو

یہ بتانے کے لیے ایک ای میل تک نہیں کرتے ہیں جس سے کہ اس کے علم میں یہ بات آجائے اور وہ اس کی کو دور کردے، البتہ ہم اس کی خامیوں کا ڈھنڈورا ضرور پیٹتے ہیں۔

ہمیں اپنی تحقیق، اردو زبان وادب اور تدریس میں آئی سی ٹی کا استعمال کرنا ہی ہوگا اور جتنا بھی ممکن ہو ہمیں کرنا ہی چاہیے کیونکہ دوسرے میدان کے لوگوں پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ انہوں نے جدید تر تمام ٹکنالوجی کا استعمال کرکے اپنی زبان وادب کو اتنا فروغ دیا ہے کہ ہم اس کا عشر عشیر بھی نہیں دے پائے ہیں۔ اس تحریر کے لکھنے سے پہلے جب انٹرنیٹ کا سہارا لے کر اس عنوان پر مواد حاصل کرنے کی کوشش کی تو نہ کے برابر مواد حاصل ہوا۔ اس سے میں یہ نتیجہ ہرگز اخذ نہیں کروں گا کہ اس موضوع پر اردو میں بالکل کام ہی نہیں ہوا ہے مگر یہ ضرور کہوں گا کہ جو کچھ کام ہوا بھی ہے تو وہ سب شاید گم گشتہ فائلوں کی طرح دبا ہوا ہے، اگر اس مواد تک سب کی رسائی کو عام کردیا جائے تو آنے والے محققین کے لیے مشعل راہ ہوگا اور ان محققین کو پھر سے بنیادی طور سے کام کرکے وقت ضائع نہ کرنا پڑے گا، کیونکہ بار بار پہیے کی ایجاد (Reinventing the wheel) سے وقت کا زیاں اور پچھڑ جانے کے سوا کچھ اور نہیں۔

اردو میں بھی اردو زبان کی تدریس کے تعلق سے کام ہوا ہے مگر جس طرح سے ای ایل ٹی پر کام ہوا ہے اس طرح سے یو ایل ٹی پر نہیں ہوا ہے اور آج بھی خاطر خواہ ہوتا ہوا دکھائی نہیں دے رہا ہے یہی وجہ ہے کہ یو ایل ٹی اب تک اپنی پہچان نہیں بنا پائی ہے اور وسائل ہونے کے باوجود رکاوٹیں ہمیں زیادہ دکھائی دے رہی ہیں، اس ضمن میں یہی کہوں گا کہ ہم تمام اردو والوں کی ذمہ داری اور وقت کی اشد ضرورت ہے کہ ہم جہاں اپنی زبان وادب پر تحقیقی کام کرکے نئی چیزیں نئے پہلو اجاگر کریں، وہیں ہم اس امر پر بھی ریسرچ کریں کہ کس طرح سے یو ایل ٹی کو فروغ دیا جائے، کس طرح سے اردو تحقیق میں حائل رکاوٹوں کا سد باب کیا جائے، کس طرح سے آئی سی ٹی اور جدید ٹکنالوجی کی مدد سے اردو تحقیق کو آسان ترین بنایا جائے، کس طرح سے اردو زبان کی تدریس میں ٹکنالوجی کا استعمال کیا جائے، کس طرح سے ماضی میں ہوئی اور حال میں ہو رہی تمام تحقیقات کو منظر عام پر لاکر سب کی رسائی کو ممکن بنایا جائے۔

آج وسائل ہونے کے باوجود ہمارے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہم ان کو استعمال کرنا نہیں جانتے اور اگر جانتے ہیں تو اس حد تک کرتے نہیں جتنا کہ کرنا چاہیے مثال کے طور پر تحقیقی یا کسی بھی طرح کا سوالنامہ تیار کرنے کے لیے ہم میں سے کتنے لوگ گوگل فارم کا استعمال کرتے ہیں؟ اور اگر شاذ و نادر کوئی کر بھی لے تو اب جن سے ڈاٹا لینا ہے وہ اس سوالنامہ کو آن لائن پُر کرنے سے قاصر ہیں۔ ابھی تک اردو میں ادبی سرقہ کے لیے کوئی سافٹ ویئر میری معلومات کے مطابق موجود نہیں ہے، جس کی وجہ سے جانے انجانے میں آج بھی ایک جیسے کام ہو رہے ہیں۔ کیا مقالہ کے حوالہ جات کے لیے کوئی یکساں پیٹرن اردو میں موجود ہے؟ کیا اس ضمن میں عالمی سطح پر کوئی رہنما خطوط بنائے گئے ہیں کہ کس طرح سے حوالہ جات تحریر کرنا ہے؟ مقالے کا فونٹ سائز کیا ہوگا، لائننگ گیپ کتنا ہوگا، کتنی مقدار میں اقتباس اخذ کیا جاسکتا ہے؟ کیا کوئی ایسا میکانزم ہے، جس سے یہ پتہ چل سکے کی فلاں موضوع پر کتنے پیپر کتنی کتب شائع ہوئی ہیں؟ ریسرچ پرپوزل میں کتنے نکات ہوں گے وغیرہ۔ اس طرح کے اور بھی بہت سے ایسے مسائل ہیں جن کی وجہ سے آج اردو میں تحقیق اتنی آسان نہیں ہے جتنی کہ

> **ہم اس امر پر بھی ریسرچ کریں کہ کس طرح سے یو ایل ٹی کو فروغ دیاجائے۔ کس طرح سے اردو تحقیق میں حائل رکاوٹوں کا سد باب کیاجائے۔ کس طرح سے آئی سی ٹی اور جدید ٹکنالوجی کی مدد سے اردو تحقیق کو آسان ترین بنایا جائے۔ کس طرح سے اردو زبان کی تدریس میں ٹکنالوجی کا استعمال کیا جائے۔ کس طرح سے ماضی میں ہوئی اور حال میں ہو رہی تمام تحقیقات کو منظر عام پر لاکر سب کی رسائی کو ممکن بنایا جائے۔**

دوسری زبانوں میں ہے۔ وسائل کی قلت کثرت اور رکاوٹ پر بات کرنے سے قبل میں یہ جاننا چاہوں گا کہ جو وسائل ہیں کیا ہم ان کا کلی طور سے استعمال کر رہے ہیں؟ میری نظر میں سب سے بڑا مسئلہ ابھی یہی ہے کہ چاہے وسائل جتنے بھی کم ہوں نا کافی ہوں۔ ان نا کافی وسائل کو ہم پہلے کما حقہ استعمال تو کریں اور جب استعمال کرنے لگیں گے تو ضرور وسائل میں وقت اور ضرورت کے لحاظ سے ترمیم و اضافہ ہوگا کیوں کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔

اردو میں لینگویج ایجوکیشن (زبان کی تعلیم) یا پھر اردو لینگویج ٹیچنگ (یو ایل ٹی) کی طرف تحقیق کرنے کا رجحان پیدا کرنا ہوگا۔ کیا اردو ادب کا دائرہ دھیرے دھیرے کم نہیں ہو رہا ہے؟ اس کو بڑھانے کی جانب ہم فکر مند تو بہت ہیں مگر کتنے سنجیدہ ہیں؟ ہم بس یہ خبر سن کر ہی خوش ہو جاتے ہیں کہ اردو پڑھنے سے دماغ تیز ہوتا ہے، میرے جملے پر غور کریے کہ یہ خبر سن کر، پڑھ کر نہیں اور اگر کوئی پڑھ بھی لیتا ہے تو انگریزی یا پھر ہندی کے کسی اخبار میں۔ آج جتنی بھی زبانیں اگر زندہ ہیں تو اس کی ایک وجہ تحقیق ہے، کیوں کہ تحقیق ہمیشہ نئے نئے پہلو تلاش کرکے لوگوں کو اس زبان کی طرف مائل کرتی ہے۔ تحقیق ہی بتاتی ہے کہ کس طرح سے زبان کے دائرے کو وسیع کیا جاسکتا ہے، کس طرح کے طلبا کے لیے کس طرح کی دلچسپی کا سامان مہیا کرکے تعلیم اور زبان کی طرف انھیں راغب کیا جاسکتا ہے، اس لیے ہمیں فکر مند ہونے سے زیادہ عملی اقدام کرنے کی ضرورت ہے۔

انگریزی زبان میں ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ کے لیے بہت سارے آن لائن تعلیمی گیم اور اپلیکیشن موجود ہیں ایک زبان سے دوسری زبان کس طرح سیکھی جاسکتی اس کے لیے ویڈیوز اور ویب سائٹس موجود ہیں، جب کہ اردو میں اس کی تعداد بہت ہی کم ہے۔ ہمیں اس امر پر بھی تحقیق کرنی ہوگی کہ کیا وجہ ہے کہ لوگ اپنے کام کو دوسروں سے شیئر کرنا پسند نہیں کرتے؟ آخر کیوں لوگ چھپانے کی طرف مائل ہیں، No upload only download کا کلچر کیوں عام ہے؟

علاوہ ازیں انھیں میں کچھ ایسے ادیب بھی ہیں جو اپنی تحریر کو سوشل میڈیا پر شیئر کرکے سب کی رسائی عام کردیتے ہیں جو کہ بہت ہی خوش آئند اور لائق تحسین بات ہے۔

اردو کے حوالے سے اگر ہم Kindle کی بات کریں تو اردو کی بہت کم کتابیں کنڈل پر موجود ہیں اور اس میں بھی اکثریت ان کتابوں کی ہے جو پاکستانی ہیں۔ اگر ہم کنڈل پر توجہ دیں تو اس کا ایک فائدہ یہ ہوگا کہ دوسری عام کتابوں کی طرح اس کی کتب پر بھی بھروسہ کیا جاسکتا ہے کہ اس میں ترمیم نہیں کی جاسکتی ہے اور دوسرے یہ کہ انگریزی کی طرح اردو الفاظ پر بھی کلک کرکے ان کے معنی معلوم کیے جاسکیں گے بشرطیکہ ان کتابوں کو انگریزی کی طرح کنڈل ورژن میں تبدیل کیا جائے (لفظوں پر کلک کرکے معنی معلوم کرنے کا ایک نمونہ ریختہ پر بھی دیکھا جاسکتا ہے) اس کے لیے ضروری ہے کہ جو لوازمات اور قواعد وضوابط انگریزی کتب میں ملحوظ خاطر رکھے جاتے ہیں وہی تمام چیزیں اردو کتب کو بھی کنڈل ورژن میں تبدیل کرتے ہوئے رکھی جائیں۔ اس کے علاوہ آج بھی اردو کی بہت کم کتابیں امازون، فلپ کارٹ یا اس طرح کی دیگر سائٹس پر موجود ہیں ان سب کو بھی فروغ دینے کی ضرورت ہے تاکہ محققین، قارئین،

اورلرنرس کی رسائی آسان ہو۔

تعلیم وتحقیق کا مقصد طلبا کے اندر احساس ذمے داری پیدا کرنا بھی ہوتا ہے۔ کیا آج کے طلبا میں ہم ایثار و قربانی، محبت اور سماجی ذمہ داری کا احساس اپنی تدریس و تحقیق سے بیدار کر رہے ہیں؟ اس مقصد کے پیش نظر ہمیں اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے کہ ہمارے طلبا کی قرات کتنی اچھی اور اس کی زبان کتنی رواں ہے، اگر وہ انسانی مسائل سے لاپرواہی برتتے ہیں، سماجی بے حسی اختیار کرتے ہیں یا پھر اپنی رواں زبان اور خوش الحانی کا استعمال جرم کے ارتکاب، رشوت خوری یا ماحول میں بگاڑ اور فساد برپا کرنے کے لیے کرتے ہیں، بلکہ اگر اساتذہ اپنے طلبا کو دوسروں کے لیے آسانیاں پیدا کرنے والا، تمام عالم انسانیت کے لیے نفع بخش اور ایک ذمہ دار شہری بناتے ہیں تو یہ امر بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہوگا۔

تدریس بس ایک سادہ پروجیکٹ اور عمل نہیں ہونی چاہیے نہ ہی یہ کہ بس نقل کر کے ایک زبان سیکھ لی جائے اور وہی ایک سال والا تجربہ پچاس سال تک چلتا رہے، بلکہ ایسی ہونی چاہیے کہ طلبا کے اندر خود اعتمادی، تنقیدی سوچ پیدا ہو اور وہ تعمیری سماجی تبدیلی کے علمبردار بنیں۔ یہ سب تبدیلیاں ہم تبھی لاسکیں گے جب ہم اس ضمن میں ریسرچ کی راہ کو ہموار کریں گے اور ان مسائل اور دشواریوں کا سدباب کر کے ضرورتوں کا پتہ لگا کر ان کمیوں کو دور کرنے کے لیے عزم مصمم کرنے کے ساتھ ساتھ پیہم عمل کریں گے۔

آج بھی جب ہم اردو کے طریقۂ تدریس پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ کس حد تک اس میں تبدیلی آئی ہے؟ کیا اس میں مزید تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے؟ آخر کیوں آج بھی طلبا کلاس روم میں ایک دوسرے کی پیٹھ دیکھتے ہیں؟ آخر کیوں زیادہ تر اساتذہ اسی پرانے طریقۂ تدریس کا استعمال کر رہے ہیں؟ کیا اردو اسکولوں میں ٹکنالوجی موجود نہیں ہے؟ یا پھر اساتذہ ان کا استعمال کرنا نہیں چاہتے ہیں اور وہ یہ سوچتے ہیں کہ یہی پرانا طریقۂ تدریس کافی ہے، اس ضمن میں ہم جب انگریزی زبان کی تدریس پر نظر ڈالتے ہیں تو پاتے ہیں کہ اس میں بے پناہ تبدیلیاں ہوئی ہیں اور اس کے فروغ میں بہت زیادہ تحقیق بھی ہوئی ہے اور آج بھی ہو رہی ہیں۔ مثلاً ایک وقت تھا کہ پروڈکٹ اپروچ کے ذریعہ انگریزی زبان کی تدریس ہوئی پھر ایک نئی تحقیق سے ثابت ہوا کہ پروسیس اپروچ اس سے زیادہ موثر ہے لھذا اسے اپنا لیا گیا، اس کے بعد پروسیس جونر اپروچ اور اب پوسٹ میتھڈ کی بات چل رہی ہے، مگر میں یہ جاننا چاہوں گا کہ کیا اردو میں بھی کوئی ایسی ریسرچ ہوئی ہے جس میں کہا گیا ہو کہ اب تدریس اس طرح سے ہوگی اور طلبا اس طریقۂ تدریس کے اپنائے جانے سے زیادہ اکتساب کرتے ہیں وغیرہ۔ نیز یہ بھی جاننا چاہوں گا کہ کیا اردو کے تدریسی مواد میں کبھی تبدیلی ہوئی یا اردو کریکولم کو آئی سی ٹی فیملیئر بنانے کی جامع سعی کی گئی؟ کیا آج کے وقت، حالات اور طلبا کے مزاج کے مطابق اردو نصاب میں تبدیلی کی گئی؟ کیا جانچ کے لیے کوئی اور طریقہ اپنایا گیا؟ 'یہ بات عیاں ہے کہ بہت سے ملکوں میں معیار، جوابدہی اور اسسمنٹ تعلیمی انقلاب کا باعث بنا'۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ اردو تحقیق کا ٹرینڈ تبدیل ہو اور موجودہ مسائل پر تحقیق کی جائے۔ نیز ہماری تحقیق کا ایک مقصد یہ بھی ہونا چاہیے کہ کس طرح سے ایسی تدریس کی بنا ڈالی جائے جس سے کہ ہمارے طلبا اردو کے استاد کی حیثیت سے ایک قابل اور لائق وفائق استاد بنیں۔

آج ریڈی میڈ مواد کا کلچر عام ہے، مگر جب اردو میں ہم مواد کو تلاش کرتے ہیں تو بہت کم مواد ملتا ہے، سلائڈ شیئر یا اس طرح کی دوسری سائٹ پر دیکھتے ہیں تو وہاں بھی وہی حال ہے یا تو ہم اپنے مواد کی پیش کش کے لیے پاور پوائنٹ پریزینٹیشن نہیں بناتے ہیں یا پھر بناتے بھی ہیں تو اسے شیئر اس خوف سے نہیں کرتے ہیں کہ کوئی دوسرا چرالے گا یا پھر یہ سوچتے ہیں کہ محنت ہم کریں فائدہ کوئی اور کیوں اٹھائے، جب کہ ایسا بالکل بھی نہیں ہے کیوں کہ آپ کے کام کو کوئی ہو بہو نہیں لے سکتا ہے اور اگر کوئی لے رہا ہے تو یہ عمل اخلاقیات کے خلاف ہے، علاوہ ازیں ہمیں اس کا بھی پتہ لگانا ہوگا کہ اردو کلاس میں کس حد تک طلبا اور اساتذہ ٹکنالوجی کا استعمال کرتے ہیں۔

بہت سے مسائل کا حل ہم نے تلاش بھی کیا ہے جیسے ٹائپ اور کاتب کا مسئلہ بھی تقریباً حل ہی ہو گیا ہے۔ شودھ گنگا پر اب تمام مقالات کو اپلوڈ کرنا ہی ہوگا جس سے سب کی رسائی عام اور آسان ہو رہی ہے، ریختہ نے اپنی ویب سائٹ پر اتنی زیادہ کتب اپلوڈ کر دی ہیں جن سے اسکالرس کو سفر کی صعوبت اور خرچ سے بہت حد تک راحت ملی ہے۔ نیز کتب خانوں سے کسی کتاب کو حاصل کرنے میں چپلیں گھس جاتیں تھیں تب جا کر کہیں وہ کتاب ملتی بھی تھی تو بہت سی شرائط وغیرہ کے ساتھ، لیکن اب ای کتب کی سہولت سے اس قسم کی بہت ساری پریشانیوں سے اسکالرس اور قاری کو نجات ملی ہے۔ قدیم نسخوں کے ڈیجیٹلائزیشن سے محققین کو اور بھی مدد ملی ہے۔ مگر وہیں کچھ مسائل ایسے بھی ہیں جو لگتا ہے کبھی حل ہونے والے نہیں اور ان باتوں کو پروفیسر گیان چند نے 80 کی دہائی میں کہا تھا جیسے بہت ساری جامعات میں آج بھی بلاوجہ نگراں مقالہ روکے رکھتے ہیں، آج بھی ممتحن مہینوں مقالے دبا کر رکھتے ہیں، وائیوا کی تاریخ مقرر ہونا آج بھی مشکل امر ہے وغیرہ۔ ان تمام امور کے حل کے لیے غور و خوض کی اشد ضرورت ہے۔

اس ضمن میں شعبۂ اردو کے دائرے اور حدود کو وسیع

> آج ریڈی میڈ مواد کا کلچر عام ہے ۔ مگر جب اردو میں ہم مواد کو تلاش کرتے ہیں تو بہت کم مواد ملتا ہے ۔ سلائڈ شیئر یا اس طرح کی دوسری سائٹ پر دیکھتے ہیں تو وہاں بھی وہی حال ہے یا تو ہم اپنے مواد کی پیش کش کے لیے پاور پوائنٹ پریزینٹیشن نہیں بناتے ہیں یا پھر بناتے بھی ہیں تو اسے شیئر اس خوف سے نہیں کرتے ہیں کہ کوئی دوسرا چرالے گا یا پھر یہ سوچتے ہیں کہ محنت ہم کریں فائدہ کوئی اور کیوں اٹھائے ۔

تر کرنے کی ضرورت ہے، اگر ممکن ہو تو اسکول آف اردو لینگویج ایجوکیشن قائم کیا جائے، جس کے تحت مواد کو فروغ دینے، جانچ اور تعین قدر کا شعبہ، ٹریننگ اور ڈیولپمنٹ کا شعبہ، اردو کو آئی سی ٹی سے انضمام کا شعبہ وغیرہ قائم ہو، مزید برآں کہ آج کے اس دور میں اردو اساتذہ و محققین اور قارئین کی ذمہ داریاں اور بھی بڑھ گئی ہیں لھذا آج اردو میں آئی سی ٹی کے استعمال کے ساتھ ہمیں اس بات پر بھی غور کرنا ہوگا کہ کس طرح سے کولیبوریٹیو طریقۂ کار (Collaborative method) کو اپنا کر کو ٹیچنگ (Co-teaching) ٹیم ٹیچنگ (Team Teaching) اور ایک ساتھ مل کر تحقیق (Research Project) کے چلن کو عام کر کے طلبا کو ان کی ضرورت کے مطابق تدریس کی جاسکتی ہے۔ جب ہم اس میں کامیاب ہو جائیں گے تو یقیناً اردو اور اردو تدریس و تحقیق کے مسائل بہت حد تک کم ہو جائیں گے اور ساتھ ہی یہ قدم اردو کی نشاۃ ثانیہ ثابت ہو سکتا ہے کیوں کہ ایسا کرنے سے اردو کی رسائی لوگوں تک یا لوگوں کی رسائی اردو تک آسان ترین اور عام ہو جائے گی جس کے نتیجہ میں اردو کا بول بالا ہو جائے گا اور پھر یہ محبتوں کی زبان سارے عالم پر چھا جائے گی۔

کتابیات:

گیان چند جین (1978) یونیورسٹیوں میں اردو ریسرچ کے مسائل۔ 'حقائق'
ebooks-chand-gyan-haqaiq/ebooks/rekhta.org//:https

■

Jarrar Ahamad, Assistant Professor (Contractual)
Department of Education & Training
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad, Telangana-32
jarrarurb.rs@manuu.edu.in

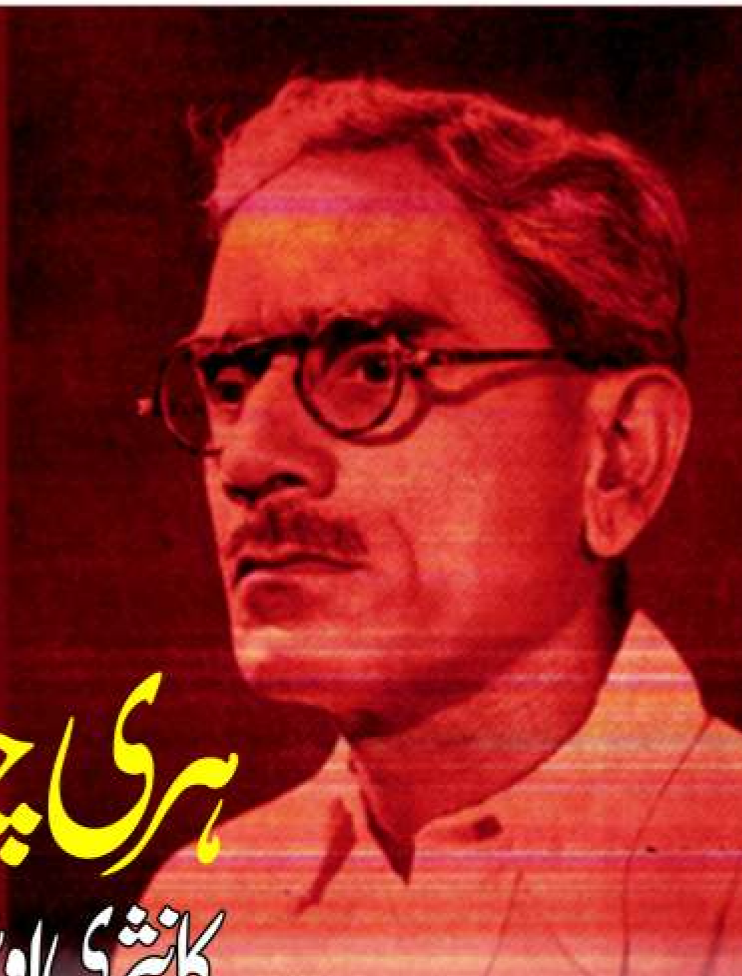

خواجہ محمد اکرام الدین

ہری چند اختر

کا نثری اور شعری اسلوب

بیسویں صدی کا نصف اول برصغیر ایشیا کی تاریخ، تہذیب اور ادب کے لیے انقلاب آفریں تغیرات کا زمانہ رہا ہے۔ اس پورے عہد میں ایشیا کے اس بڑے خطے میں زندگی کو یکسر تبدیل کر دینے والے ایسے ایسے واقعات رونما ہوئے ہیں جن کی بازگشت اب تک سنائی دے رہی ہے۔ اسی لیے اس عہد کو تغیرات کے عہد سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ان تغیرات نے جغرافیائی حدود بھی بدلے اور صدیوں کی تہذیب و ثقافت کو بھی متاثر کیا۔ اس تبدیلی نے کئی سطح پر انسانی المیے کو جنم دیا جسے تاریخ نے بھی محفوظ کیا ہے اور ادب نے بھی اس عہد کے کرب کو اپنے اندر سمویا ہے۔ ادب اور تاریخ میں ان سانحات کو درج کرنے کا طریقہ جداگانہ ہے۔ تاریخ میں سپاٹ حقائق کو پیش کیا جاتا ہے، جس میں اختلاف و اتفاق کی گنجائشیں موجود ہوتی ہیں۔ لیکن ادب میں ان سانحات کو جس طرح پیش کیا گیا ہے اس میں زندگی کے شش جہات پہلوؤں کو دیکھا جا سکتا ہے۔ اس دور کی ایک بڑی بات یہ ہے کہ اس دور میں زندگی کے تیزی سے بدلنے والے مطالبات کی طرح ادب کے نظریات بھی بدلتے گئے۔ ادب میں ایک دور ایسا بھی آیا کہ اس پر مقصدیت غالب آ گئی جس کے سبب ادبیت مجروح ہونے لگی۔ خاص طور پر اردو شاعری میں یہ تبدیلیاں بہت تیزی سے آئیں۔ غزل کی جگہ نظم نے لے لی، موضوع کی یکسانیت سے اسلوب شعر متاثر ہونے لگا۔ ادب منشور کے تحت لکھا جانے تو کہیں نہ کہیں تخلیقیت کا متاثر ہونا بھی فطری امر تھا۔ اسی لیے اس عہد میں مختلف ادبی نظریات کا ظہور میں آنا بھی فطری تھا۔

اسی دور تغیرات میں ایک صاحب طرز ادیب اور شاعر ادب کی دنیا میں قدم رکھتا ہے، جسے اقبال، سر عبدالقادر، ظفر علی خاں، راجہ نرندر ناتھ، رائے بہادر کنور سین، حفیظ جالندھری، جوش ملیح آبادی، جوش ملسیانی، عرش ملسیانی جیسے باکمالوں کی صحبت نصیب ہوئی۔ معاشرتی زندگی کی شعبدہ بازیوں سے دور رہنے والا سیدھا سادہ انسان جب شاعری کی دنیا میں داخل ہوتا ہے تو شاعری کے ایسے کرتب دکھانے لگا کہ عوام و خواص کا اس کی جانب مائل ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ لیکن تعجب اس بات پر ضرور ہے کہ ایسا باکمال شاعر ایسا بے پروا بھی ہوگا کہ اس نے اپنی تخلیقات کو سنبھال کر بھی نہیں رکھا۔ نثر و نظم میں فکر و فن کی نیرنگیاں بکھیرنے والا پنڈت ہری چند شرما جو بعد میں پنڈت ہری چند اختر کے نام سے مشہور و معروف ہوا۔ اس کی تحریریں اب تک زیور طبع سے آراستہ نہ ہو سکیں۔ ادب کے قارئین اور ناقدین ان کے نام سے کم ہی واقف ہیں۔ بھلا ہو عرش ملسیانی کا کہ انھوں نے ان کے بکھرے اوراق کو 'کفر و ایماں' کے نام سے شائع کر کے ادب میں ان کے نام کو جاوداں کرنے کی کوشش کی ہے۔ پنڈت ہری چند اختر کی تحریروں کی عدم دستیابی کی وجہ ہی ہے کہ ان کے نام چند ایسی کتابوں میں بھی نہیں، جن میں ضرور ہونا چاہیے تھا۔ اردو کے ہندو شعرا کی دو جلدوں میں ان کو جگہ نہیں مل سکی، اہل پنجاب کے شعرا پر کئی تحقیقی مقالے لکھے گئے مگر یہاں بھی ان کا تذکرہ نہیں ہو سکا۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان کی تحریروں کو جمع کرنے کی سنجیدگی سے کوئی کوشش نہیں ہوئی ہے۔ جبکہ ان کی شعری اور نثری تحریریں ایسی ہیں کہ انھیں ادبی کینن میں نمایاں جگہ ملنی چاہیے۔

تلاش بسیار کے بعد ان کی دو نثری تحریروں تک میری رسائی ہو سکی۔ ایک دیباچہ 'سوز و ساز' حفیظ جالندھری۔ (جو عثمانیہ بک ڈپو، عثمانیہ بازار، حیدرآباد دکن 1933) دوسرا بھی جوش ملسیانی کے مجموعۂ کلام پر مقدمہ ہے۔ ('جنون و ہوش' جوش ملسیانی، منشی گلاب چند سنگھ اینڈ سنز لمیٹڈ، نکلسن روڈ، دہلی) اس کی تاریخ اشاعت معلوم نہ ہو سکی۔ میں نے ان کی

انھیں دو نثری تحریروں اور شعری مجموعہ 'کفر و ایماں' پر اظہار خیال کیا ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قلیل سرمائے پر کیا گفتگو ہوگی مگر سچائی یہ ہے کہ ان کی نثر کے ایک ایک جملے پر رک کر غور و فکر کرنے کی دعوت ہے۔ عام طور پر لوگ انھیں شاعر کے طور پر جانتے ہیں مگر ابھی یہ عقدہ نہیں کھلا ہے کہ ان کی نظر ادبی نقد و تبصرہ پر بھی خوب گہری تھی۔ پنڈت ہری چند اختر کو مشرقی شعری روایات کا گہرا علم تھا۔ اپنے عہد کے تخلیقی منظرنامے پر بھی گہری نظر تھی۔ علم عروض پر انھیں مہارت حاصل تھی۔ وہ فی البدیہہ شعر بھی کہتے تھے۔ ان کی طبیعت میں حس مزاح بھی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ احباب کی محفلیں ان سے زعفران زار ہو جایا کرتی تھیں۔ بہ حیثیت انسان وہ اعلیٰ اقدار کے حامل تھے۔ یہ تمام صفات ان کی نثر میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ یہاں میں ان کی نثر (دونوں مقدموں کے حوالے سے) پر پہلے گفتگو کروں گا۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا وہ صاحب طرز ادیب ہیں۔ ان کے جملے بڑے بے ساختہ اور فطری نظر آتے ہیں۔ صاحب طرز ادیب کی صفت یہ ہے کہ ان کے جملے ساخت کے لحاظ سے منفرد بھی ہوں اور لفظ و معنی کے اعتبار سے مربوط بھی ہوں۔ اس میں شخصیت کا عکس بھی ہو اور اختصار و اجمال کی صفت سے متصف بھی ہو۔ ایک بڑی خوبی یہ بھی کہ وہ بولتے ہوئے جملے بھی ہوں۔ ذیل میں دیباچہ 'سوز و ساز' حفیظ جالندھری سے چند ایسے جملے ملاحظہ کریں:

''خوش گلو ایکٹروں اور فوق البھڑک سین سینری کے باوجود اس طرح ناکام نہ رہتا۔''[1]

اس جملے میں ان شاعروں کو طنز کا ہدف بنایا ہے جو کلام میں موضوع، نفس مضمون اور وزن کی باہمی مناسبت کا خیال نہیں رکھتے بلکہ خوش گلوئی سے کلام کے عیوب کی پردہ پوشی کرنا چاہتے ہیں اور مقبولیت کے بھی خواست گار ہیں۔ یہ محض ایک جملہ نہیں بلکہ اس میں ایک تنقیدی بصیرت بھی ہے۔ شعر کے حسن کا مشرقی معیار یہ ہے کہ اس میں وزن و معنی دونوں ہوں۔ صرف لفظوں کو سجانے سے کلام میں حسن نہیں آتا۔ اسی لیے وہ کلام کو عروس اور وزن کو زیور کہتے ہیں۔ ان کا یہ جملہ بھی دیکھیں:

''پس عروس خوب 'بازیور' ہو تو سبحان اللہ اور اگر بے زیور ہو تو بھی کوئی حرج نہیں۔ لیکن عروس کا خوب ہونا ضروری ہے بلکہ میرے خیال میں عروس خوب کو بھی زیور اسی صورت میں زیب دے سکتا ہے جبکہ وہ اس کے دوسرے تمام محاسن سے پوری پوری مناسبت رکھتا ہو، ورنہ زیور کی تو یہ صورت بھی ہو سکتی ہے کہ ایک پری چہرہ خاتون کو انگریزی لباس پہنا کر گلے میں سیر سوا سیر کی ہندستانی ہیکل باندھ دی جائے۔''[2]

ان کے جملے سے ملا وجہی کے اشعار یاد آتے ہیں جو انھوں نے 'در شرح شعر گوید' کے عنوان سے کہا تھا۔ وجہی نے وزن و آہنگ کے بارے میں کہا تھا:

اگر خوب محبوب جو سور ہے   سنوارے تو نور علی نور ہے

وجہی سے میر تک بلکہ پورے کلاسیکی عہد میں وزن و شعر کو ایک خاص اہمیت حاصل تھی۔ اسی نظریے اور تصور کی جانب ہری چند اختر نے ان جملوں سے متوجہ کیا ہے۔

اب اور جملے ملاحظہ ہوں:

''قبولیت کے پیدا ہونے کا وقت مقرر کرنا اور اس کے بڑھنے، پھیلنے، گھٹنے، سمٹنے سے اس کی عمر کا اندازہ لگانا سخت مشکل ہے۔''[3]

یہ جملہ حفیظ جالندھری کی مقبولیت کے حوالے سے اور تقابل میں ان شعرا کو طنز کا نشانہ بنایا ہے جو مقبولیت کے لیے طرح طرح کے حربے استعمال کرتے ہیں۔ اگر ایسے شاعروں کو مقبولیت مل بھی گئی تو وہ وقتی ہوتی ہے۔ اس جملے میں انھی باتوں کی جانب اشارہ کیا ہے۔ اسی مفہوم کے کچھ اور جملے ملاحظہ ہوں:

''پس جہان بزم شعر و سخن میں تعارف و تقریب کا تعلق ہے یہ کام باضابطہ کی حد تک انجام پا چکا ہے۔''[4]

''انھیں اہل بزم نے تسلیم کر لیا ہے یا نامطبوع اور نامقبول کہہ کر رد کر دیا ہے۔''[5]

حفیظ جالندھری کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے ادب کی اہمیت پر یہ بلیغ جملہ ملاحظہ ہو:

''کسی قوم کی تاریخ کو اگر اس کے سوانح حیات قرار دیا جائے تو لٹریچر کو اس کے خود نوشت سوانح حیات کہنا بالکل بجا ہوگا۔''[6]

بعض شعرا ایسے ہوتے ہیں جن کی قدر و منزلت کو لوگ نہیں پہچان پاتے۔ لیکن ایک دور ایسا آتا ہے کہ ان کی شاعری مقبول خاص و عام ہو جاتی ہے۔ ایسے ہی شاعروں میں ایک نام ہومر کا ہے۔ ہری چند اختر نے ہومر کے بارے میں لکھا ہے کہ:

جب زندہ تھے تو اس کے اشعار سن کر کوئی بھیک بھی مشکل سے دیتا تھا لیکن اس کے مرنے کے بعد ایک زمانہ ایسا آیا کہ یونان کے وہی سات شہر گلی کوچوں میں در بدر خاک بسر اٹھی ٹیکتا پھرتا تھا اس کی جائے ولادت کا فخر حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے سے لڑنے جھگڑنے لگے۔''[7]

اب شعری رویے کی کجی اور شعرا کی نمود و نمائش پر یہ جملے دیکھیں:

''ذکر پرست فاعلاتیوں کے جذبات کا احترام اس پہلو بھی رکھا گیا ہے۔''[8]

''مگر اس نمائش کا نتیجہ 'مغز ما خورد و حلق خود درید' کے سوا کچھ نہیں۔''[9]

''غزل کی مخالفت میں کچھ مدت سے ایک ہڑبونگ سی مچ رہی ہے اور مزہ یہ ہے کہ اس طوفان میں بعض سنجیدہ و فہمیدہ اشخاص کے پاؤں بھی اکھڑ گئے۔''[10]

دراصل یہ وہی زمانہ ہے جب ترقی پسندیت کے تحت غزل معتوب ہوئی اور بغیر کسی تامل کے غزل کو نشانہ بنایا جانے لگا تو ہری چند اختر نے یہ بات کہی۔ وہ کسی نظریے کے مخالف نہیں تھے مگر اس فیشن کے خلاف تھے۔ ان جملوں کے بعد ہری چند اختر کی تنقیدی بصیرت کو دیکھیں۔ ہری چند اختر مانتے ہیں کہ شاعری کی قدر و قیمت کی شناخت آسان نہیں، یہ بھی کوئی ضروری نہیں کہ کسی شاعر کو اس کی زندگی میں ہی شاعری کے سبب عزت و توقیر مل جائے لیکن اگر شاعری میں فنی جوہر موجود ہے تو کسی نہ کسی دن اس کی قدر و قیمت پہچانی جائے گی۔ اس بات کو کہنے کے لیے ہری چند اختر نے جو لب لہجہ اپنایا ہے اسے دیکھیں اور اندازہ لگائیں کہ نقد و تبصرہ کی یہ زبان کیسی شگفتہ ہے:

''اردو شاعروں میں غالب اور ذوق کو لیجیے۔ اپنی زندگی میں ذوق ملک الشعرا، خاقانی ہند تھا اور غالب مہمل گو۔ لیکن آج ملک سخن میں غالب کا سکہ رواں ہے اور ذوق کی شہرت آزاد مرحوم کا وہ سحر کار قلم بھی قائم نہ رکھ سکا جس نے اس ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو آفتاب عالم تاب ثابت کرنے کی کوشش میں اردو شاعری کو کم از کم پچاس سال پیچھے

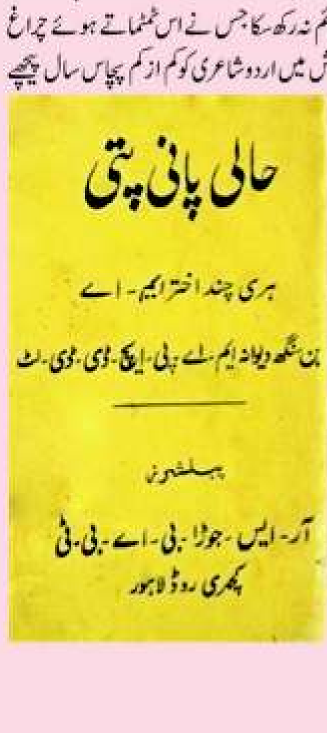

دھکیل دیا۔''[11]

اس اقتباس میں آزاد و حالی کا رنگ بھی ہے اور مروجہ تنقید پر طنز بھی ہے۔ ہری چند اختر، صاحبِ اسلوب اس لیے بھی ہیں کہ انھوں نے اپنی تحریروں میں تنقید اور طنز کا پیرایہ اپناتے ہوئے اپنی باتوں کو ثابت کرنے کا خوبصورت طریقہ نکالا۔ وہ اپنے عہد کے تنقیدی رویے سے مطمئن نہیں تھے اسی لیے انھوں نے اس پر گہرا طنز بھی کیا ہے۔ ان کی نظر مشرقی شعری و ادبی روایات پر بہت گہری تھی۔ ذیل کے اقتباس کو دیکھیں اور ہری چند اختر جو محض شاعر اور فی البدیہہ شاعر کے طور پر مشہور ہوئے ان کی تنقیدی بصیرت کو دیکھیں:

''ایشیائی نقاد یورپی عینک کے بغیر اپنی بصارت کو قابل اعتبار نہیں سمجھتے اور بعض اوقات تو انھیں اس عینک کے بغیر کچھ بھائی نہیں دیتا۔ غالب کی مثال سے جہاں وقتی رائے کی بے وقعتی کا اندازہ ہوتا ہے وہاں یہ راز بھی کھلتا ہے کہ بعض قابل قدر جد تیں قبل از وقت معرض وجود میں آ کر کچھ مدت کے لیے نا مطبوع بلکہ مردود ہو جاتی ہیں مگر وقت آنے پر ان کی ایسی قدر ہوتی ہے کہ ملک کے لٹریچر میں وہی جگہ حاصل ہو جاتی ہے۔''

اسی طرح اس زمانے میں ترقی پسندی کا زور تھا۔ لیکن اس کے متوازی رجحانات بھی اسی شدت سے موجود تھے۔ اس کشمکش ادب و شعر کے حوالے سے ہری چند اختر کہتے ہیں:

''آج کل ہر ادیب کو ترقی پسند یا رجعت پسند قرار دینا بھی فیشن میں داخل ہے۔ لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ جو لوگ اپنے آپ کو ترقی پسند کہتے ہیں وہ بھی ترقی پسند اور رجعت پسند کی کوئی واضح اور جامع تعریف اور ان دونوں گروہوں میں تمیز کے لیے کوئی کسوٹی نہیں پیش کر سکے۔''[13]

ہری چند اختر کو عروض اور شعری کمالات کا خوب علم تھا۔ ان کے ہم عصروں نے بھی اس کو تسلیم کیا ہے۔ اپنے عہد کے شعری رویے پر اظہار خیال کرتے ہوئے ہندستانی اوزان کو اپنانے کی وکالت کی ہے وہ لکھتے ہیں:

''ہندستانی موسیقی اور اردو شاعری کے تال سم میں بظاہر کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ ملکی ذہنوں سے غفلت بلکہ دانستہ بے اعتنائی روا رکھی گئی ہے حتی کہ ہندستانی گیت اردو شاعری کے نام نہاد عروضیوں کو اس لیے غیر موزوں معلوم ہونے لگتے ہیں کہ ان میں ملکی زحافات سے کام لیا جاتا ہے۔ کیا یہ افسوسناک بات نہیں کہ جو سُر اور تال ہندستانیوں کی روح میں بسے ہوئے ہیں ان کو اجنبی اور غیر مانوس گردانا جائے، اور غیر مانوس زیر و بم ہمارے اشعار کی موزونیت یا عدم موزونیت کا معیار بنا لیے جائیں؟''[14]

اس مقدمے میں جوش ملسیانی کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے صنف غزل پر بھی رائے دی ہے۔ اس رائے میں بظاہر کوئی نئی بات نہیں لیکن اس رائے سے پنڈت اختر کی شاعری کی فہم اور مشرقی شعری روایت کا احترام دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے تبصرے اور تنقید کے لیے جو زبان استعمال کی ہے اس کے اسلوب کو دیکھیں تو اندازہ ہوگا کہ یہ وہی اسلوب ہے جس کی آزاد نے ابتدا کی اور حالی تک تنقید میں تقریباً یہی اسلوب موجود ہے۔ اقتباس دیکھیں:

''حقیقت یہ ہے کہ غزل اپنی صورت و ترکیب اور نفس مضمون ہر دو اعتبار سے شاعری کی بنیاد بھی ہے اور معراج بھی۔ حسن بیان شاعری کا اہم ترین جزو ہے۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ حسن بیان ہی شاعری ہے۔ حسن بیان میں صدق محاورہ، زبان کی صفائی، بیان کی صفائی اور تازگی، حسنِ ترکیب، خوبیِ استعارہ، لطفِ تشبیہ، مضمون کے ساتھ الفاظ کی مطابقت وغیرہ سب کچھ شامل ہے اور ان کے علاوہ اختصار و جامعیت۔ ظاہر ہے کہ جب تک حسن بیان کے ان تمام اجزائے ترکیبی پر عبور نہ ہو شاعر اور اس کی

ہندستانی موسیقی اور اردو شاعری کے تال سم میں بظاہر کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ ملکی ذہنوں سے غفلت بلکہ دانستہ بے اعتنائی روا رکھی گئی ہے حتی کہ ہندستانی گیت اردو شاعری کے نام نہاد عروضیوں کو اس لیے غیر موزوں معلوم ہونے لگتے ہیں کہ ان میں ملکی زحافات سے کام لیا جاتا ہے۔ کیا یہ افسوسناک بات نہیں کہ جو سُر اور تال ہندستانیوں کی روح میں بسے ہوئے ہیں ان کو اجنبی اور غیر مانوس گردانا جائے، اور غیرمانوس زیر و بم ہمارے اشعار کی موزونیت یا عدم موزونیت کا معیار بنا لیے جائیں؟

شاعری دونوں ناکام رہتے ہیں۔''[15]

غزل کے موضوعات اور حسن بیان کے متعلق لکھتے ہیں:

''غزل کے مضامین میں جوشِ جذبات، جوشِ بیان، ہجر کا رونا، وصل کی آرزو، رشک و رقابت، سوز و گداز، نالہ و فریاد، شکوہ و شکایت، تانک جھانک، نامہ و پیام، رندی و مستی سب کچھ ہوتا ہے اور ہونا بھی چاہیے۔ سوز و رقت کے بغیر غزل لطیف ترین صنف شعر کی جگہ سیاست داں کی ڈائری یا پنساری کے بیجک بن کے رہ جائے۔ لیکن دوسری جانب وہ شاعر بھی قابل معافی نہیں جو غزل کو مرثیہ بنا ڈالتے ہیں اور اور اپنی قافیہ پیمائی کو ایسی رکیک اور مکروہ بوالہوسی سے آلودہ کرتے رہتے ہیں جس پر غنڈے، شہدے اور زنانِ بازاری بھی شرمسار ہوں۔''[16]

اب تک ہری چند اختر کی تنقیدی بصیرت اور تنقیدی اسلوب پر بات ہوئی اب اسی تنقیدی تحریر میں ان کے اسلوب کا ایک اور رنگ ملاحظہ کریں جسے پیکر تراشی پر محمول کر سکتے ہیں۔ ہری چند اختر جوش ملسیانی کا تعارف اس انداز سے کراتے ہیں:

''جن لوگوں نے اس سے پہلے جوش (ملسیانی) کو نہیں دیکھا تھا انھیں کچھ دیر کے لیے ضرور حیرت ہوئی ہوگی، درمیانے قد کا ایک سیدھا سادہ ادھیڑ آدمی، معمولی کپڑے کی پگڑی، قمیص اور دھوتی۔ دیسی جوتا، لباس کی وضع قطع خالص دیہاتی، شاعرانہ بناؤ نہ استادانہ تمکنت، نہ حاشیہ بردار، سراپا خلوص وانکسار، انداز میں دیہاتیوں کی سی اخلاص بھری سادگی اور بے تکلفی، ہونٹوں پر ہلکا سا متانت آمیز تبسم۔ صورت و شکل دیکھو تو زیادہ سے زیادہ ایک سفید پوش عامی کہہ سکیں۔ ہر شخص سے یوں ملتا ہے جیسے خود اسے بھی اپنے مرتبے اور علم کا احساس نہیں۔ بھلا اس وضع قطع اور انداز میں ناواقف لوگوں کو اس اشتیاق اور تعریف و توصیف کا جواز کہاں نظر آ سکتا تھا۔''[17]

ہری چند اختر کے نثری اسلوب کو آپ نے دیکھا۔ چند اقتباسات کی مثالوں سے اتنا تو اندازہ ہو جاتا ہے کہ ہری چند اختر کو نثر نگاری پر بھی قدرت حاصل تھی یہ اور بات ہے کہ ان کا بہت زیادہ نثری سرمایہ موجود نہیں لیکن ان چند تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ کلاسیکی نثر و نظم سے ان کو والہانہ لگاؤ تھا۔ ان کی نثر پر آزاد، حالی، شبلی اور نذیر کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔

جہاں تک شاعری کی بات ہے تو نثر کے مقابلے میں شاعری کا سرمایہ قدرے زیادہ ہے۔ لیکن وہ بھی محض ایک مجموعۂ کلام 'کفر و ایمان' موجود ہے جس کی ضخامت بھی سو صفحات سے کم ہے۔ کمیت کے لحاظ سے کم سہی مگر وقعت کے لحاظ سے کم نہیں ہے۔ اس مجموعے کو پڑھتے ہوئے ان کے اکثر اشعار ٹھہر کو بار بار پڑھنے اور غور کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ ان کے بعض اشعار تو ایسے ہیں جن کے متعلق میرا خیال ہے کہ یہ صرف ہری

نقد و نگاہ

چند اختر ہی کہہ سکتے ہیں۔ یہ اشعار دیکھیں جن میں ہری چند خدا سے مخاطب ہیں۔

تو مرے اعمال کا پابند نکلا حشر میں   اے خدا میرے خدا، تجھ کو خدا سمجھا تھا میں
زندگی بے شک ترا انعام ہے یارب مگر   سن سکے تو کچھ ترے انعام کی باتیں کریں

اب اقبال کے ان اشعار کو ذہن میں رکھیں۔

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم   بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

اسی زمین میں ہری چند کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

کہیں افراط مئے ہے چہرہ افروز   کہیں خون جگر باقی نہیں ہے
نمود خیر وشر کا یہ نتیجہ کس نے سوچا تھا   خدا مغرور، آدم جاں بلب، شیطان باقی ہے
مجال دم زدن کس کو ہے یارب   مگر یہ شان رزاقی نہیں ہے
ترے احکام کی دنیا، مرے اعمال کا محشر   یہاں میری، وہاں تیری خوشی سے کچھ نہیں ہوتا

اب یہ شعر دیکھیں۔

پتا بھی اگر ہلتا ہے تو اس کی رضا سے   اور بندہ گنہگار ہے، معلوم نہیں کیوں
رہیں دو دو فرشتے ساتھ تو انصاف کیا ہوگا   کسی نے کچھ لکھا ہوگا، کسی نے کچھ لکھا ہوگا
ملے گی شیخ کو جنت، مجھے دوزخ عطا ہوگا   بس اتنی بات ہے جس کے لیے محشر بپا ہوگا

یہ وہ اشعار ہیں جن میں شاعر کہیں خدا سے مخاطب ہے اور کہیں شوخی سے کلام کرتا ہے۔ یہ اسی قبیل کے اشعار ہیں کہ جن کے سبب اقبال پر بھی کفر کے فتوے لگے تھے۔ اسی لیے میں نے یہ کہا تھا کہ یہ وہ اشعار ہیں جو ہری چند اختر ہی کہہ سکتے ہیں۔ مگر ایسا نہیں کہ ان کو حلقۂ ادب میں معتوب قرار دیا گیا ہو بلکہ یہ ان کا شاعرانہ اسلوب ہے کہ ان اشعار میں بظاہر ایسی باتیں ہیں جو کفر کی سرحد تک جاتی ہیں لیکن اس کے معانی کئی دیگر مفاہیم کی جانب بھی رہنمائی کرتے ہیں۔ کچھ اشعار ایسے بھی ہیں جو موضوع کے اعتبار سے نئے تو نہیں ہیں لیکن اسلوب کے اعتبار سے منفرد ضرور ہیں۔ ملاحظہ ہوں ایسے اشعار۔

عبادت از پئے انعام زاہد   ہوس کاری ہے، مشتاقی نہیں ہے
کہہ دیا لا تقنطو اختر کسی نے کان میں   اور دل کو سر بسر محو تمنا کردیا
میکدے میں بیٹھ کر ایمان کی پروا نہ کر   یا اسے بھی ایک دو چلو پلا، دیوانہ کر
ابھی کیا شمع کیا پروانہ دونوں جل بجھے آخر   کوئی آتش فشاں ہوکر، کوئی آتش بجاں ہوکر

ہری چند اختر کے شعری اسلوب کی ایک اہم خوبی شوخی و ظرافت بھی ہے۔ ان اشعار کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ ان پر غالب اور مومن کے اثرات بھی ہیں۔ یہ اشعار دیکھیں۔

ہجر کی شب اِدھر اللہ، اُدھر وہ بت ہے   دیکھنا یہ ہے کہ اب کون بلاتا ہے مجھے
خدا محفوظ رکھے، یہ حسیں دل لے ہی لیتے ہیں   کسی پر مہرباں ہوکر، کسی سے سرگراں ہوکر
بزم دشمن ہے خدا کے لیے آرام سے بیٹھ   بار بار اے دل ناداں تجھے کیا ہوتا ہے
میری صورت، مری حالت، مری رنگت دیکھی   آپ نے دیکھ لیا؟ عشق میں کیا ہوتا ہے
ہم جو کہتے ہیں ہمیشہ ہی غلط کہتے ہیں   آپ کا حکم درست اور بجا ہوتا ہے
کسی کے حسن عالم تاب کی تنویر کے صدقے   کسی بدبخت کی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی
تلاش شمع سے پیدا ہے سوز ناتمام اختر   خود اپنی آگ میں جل جانے والے اور ہوتے ہیں

نادر موضوعات کے اشعار ملاحظہ کریں۔

حسن کو پہنا چکے جب خود نمائی کا لباس   عشق نے سر پیٹ کر پوچھا کہ یہ کیا کردیا
تری میعادِ غم پوری ہوئی، اے زندگی خوش ہو   قفس ٹوٹے نہ ٹوٹے، میں تجھے آزاد کرتا ہوں
جہاں تجھ کو بٹھا کر پوجتے ہیں پوجنے والے   وہ مندر اور ہوتے ہیں شوالے اور ہوتے ہیں

کچھ مشہور اشعار

شباب آیا، کسی بت پر فدا ہونے کا وقت آیا   مری دنیا میں بندے کے خدا ہونے کا وقت آیا
ہمیں بھی آپڑا ہے دوستوں سے کام کچھ، یعنی   ہمارے دوستوں کے بے وفا ہونے کا وقت آیا

اہل اقتدار پر طنز

دمادم شعبدے ہم کو دکھاتا ہے کوئی جلوہ   کہیں شیخ حرم ہوکر، کہیں پیر مغاں ہوکر

تعلی

مرا مضموں سوار توسن طبع رواں ہوکر   زمین شعر پر پھرتا ہے، گویا آسماں ہوکر

نئی ترکیبیں

وفا کی سسکیاں اس پر ہوس کے قہقہے توبہ   محبت کی فضا تھرا گئی کیا تم نہ آؤ گے
جمع ہیں سارے مسافر ناخدائے دل کے پاس   کشتیٔ ہستی نظر آتی ہے اب ساحل کے پاس

ہندو مذہب کے فلسفے (گنگا کی پاکیزگی کا یہ تصور)

یہ ترے دست کرم کو کھینچ لے گا ایک دن   اے خدا رہنے دے دستِ دعا ساحل کے پاس

نئی ترکیبات

خلوص عارضی وہ بھی بہ قیمت ڈھونڈنے نکلے   تماشا نامراد آیا، تمنا سوگوار آئی

فی البدیہہ اشعار

مزہ جینے کا آخر دل لگانے پر ہی ہوتا ہے   فدا صاحب کسی پر دیکھ لینا تھا فدا ہوکر

ہری چند اختر کی شاعری اور نثری تحریریں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک صاحب طرز ادیب تھے مگر سنجیدگی سے اگر اس جانب مائل ہوتے تو وہ ادب کے سرمائے میں گرانقدر اضافہ کر سکتے تھے مگر جس قدر بھی ان کی نگارشات موجود ہیں ان کی قدر و قیمت بھی کسی طور کم نہیں ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کو یکجا کر کے کلیات کے شکل میں شائع کیا جائے۔

حواشی

1۔ دیباچہ 'سوز و ساز' ص 18، عثمانیہ بک ڈپو، عثمانیہ بازار، حیدرآباد دکن 1933
2۔ دیباچہ 'سوز و ساز' ص 17، عثمانیہ بک ڈپو، عثمانیہ بازار، حیدرآباد دکن 1933
3۔ دیباچہ 'سوز و ساز' ص 4، عثمانیہ بک ڈپو، عثمانیہ بازار، حیدرآباد دکن 1933
4۔ دیباچہ 'سوز و ساز' ص 2، عثمانیہ بک ڈپو، عثمانیہ بازار، حیدرآباد دکن 1933
5۔ دیباچہ 'سوز و ساز' ص 2، عثمانیہ بک ڈپو، عثمانیہ بازار، حیدرآباد دکن 1933
6۔ دیباچہ 'سوز و ساز' ص 6، عثمانیہ بک ڈپو، عثمانیہ بازار، حیدرآباد دکن 1933
7۔ دیباچہ 'سوز و ساز' ص 4، عثمانیہ بک ڈپو، عثمانیہ بازار، حیدرآباد دکن 1933
8۔ دیباچہ 'سوز و ساز' ص 14، عثمانیہ بک ڈپو، عثمانیہ بازار، حیدرآباد دکن 1933
9۔ دیباچہ 'سوز و ساز' ص 12، عثمانیہ بک ڈپو، عثمانیہ بازار، حیدرآباد دکن 1933
10۔ دیباچہ 'سوز و ساز' ص 18، عثمانیہ بک ڈپو، عثمانیہ بازار، حیدرآباد دکن 1933
11۔ دیباچہ 'سوز و ساز' ص 4، عثمانیہ بک ڈپو، عثمانیہ بازار، حیدرآباد دکن 1933
12۔ دیباچہ 'سوز و ساز' ص 5، عثمانیہ بک ڈپو، عثمانیہ بازار، حیدرآباد دکن 1933
13۔ مقدمہ 'جنون و ہوش' جوش ملسیانی۔ ص 30، منشی گلاب چند سنگھ اینڈ سنز لمیٹڈ، نکلسن روڈ، دہلی
14۔ دیباچہ 'سوز و ساز' ص 11، عثمانیہ بک ڈپو، عثمانیہ بازار، حیدرآباد دکن 1933
15۔ مقدمہ 'جنون و ہوش' جوش ملسیانی، ص 26، منشی گلاب چند سنگھ اینڈ سنز لمیٹڈ، نکلسن روڈ، دہلی
16۔ مقدمہ 'جنون و ہوش' جوش ملسیانی۔ ص، 26، منشی گلاب چند سنگھ اینڈ سنز لمیٹڈ، نکلسن روڈ، دہلی
17۔ مقدمہ 'جنون و ہوش' جوش ملسیانی، ص 8، منشی گلاب چند سنگھ اینڈ سنز لمیٹڈ، نکلسن روڈ، دہلی
18۔ نوٹ: تمام اشعار ان کے مجموعہ کلام 'کفر و ایمان' مطبوعہ یونین پرنٹنگ پریس، اردو بازار دہلی سے لیے گئے ہیں۔

■

Prof. Khwaja Md Ekramuddin
Professor, Centre of Indian Languages
School of Language, Literature and Culture Studies
Jawaharlal Nehru University
New Delhi - 110067

'امراؤ جان ادا' اور 'شاہد رعنا' میں نظریاتی بعد

مورا کامی آسوکا

پروفیسر یوسف سرمست کی کتاب 'بیسویں صدی میں اردو ناول' میں انیسویں صدی کے ناولوں پر بھی سیر حاصل گفتگو ملتی ہے۔ اس کتاب میں ایک دلچسپ موضوع قاری سرفراز حسین عزمی کے ناول 'شاہد رعنا' اور مرزا محمد ہادی رسوا کے ناول 'امراؤ جان ادا' کا تقابلی مطالعہ ہے۔ اس میں یوسف سرمست نے دونوں ناولوں کے سنہ اشاعت [1] اور مماثلتوں پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ 'شاہد رعنا'، 'امراؤ جان ادا' سے بھی پہلے شائع ہو چکا تھا اور رسوا نے 'شاہد رعنا' سے متاثر ہو کر 'امراؤ جان ادا' کی تصنیف کی۔ ان کے مفصل مطالعے کو دیکھتے ہوئے کہہ سکتے ہیں کہ ان کی یہ رائے قابل اعتبار ہے۔ یوسف سرمست سے پہلے شاہد احمد نے بھی ایک جگہ لکھا ہے کہ:

''شاہد رعنا، کے جواب میں مرزا رسوا نے 'امراؤ جان ادا' لکھی۔'' [2]

چنانچہ کہا جا سکتا ہے کہ رسوا نے 'شاہد رعنا' سے متاثر ہو کر یا اسے پیش نظر رکھ کر 'امراؤ جان ادا' تخلیق کی۔ لیکن اس سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ رسوا نے 'شاہد رعنا' کی کس بات سے اثر لیا تھا، مزید یہ ہے کہ وہ اپنے تمام پیش نظر ناولوں میں 'شاہد رعنا' ہی سے کیوں متاثر ہوئے۔ اگر دونوں ناولوں کی مماثلت کے بجائے فرق پر توجہ مرکوز کی جائے تو 'امراؤ جان ادا' کی تصنیف کا سبب بڑی حد تک واضح ہو جاتا ہے۔

یوسف سرمست نے دونوں ناولوں کا جائزہ لیتے ہوئے چار فرق کا بھی مختصر ذکر کیا ہے۔

فرق نمبر 1: پہلا فرق 'شاہد رعنا' کا مرکزی کردار ننھی جان اور 'امراؤ جان ادا' کا مرکزی کردار امراؤ جان کے پیدائشی احوال پر مبنی ہے۔ یعنی ننھی ایک خاندانی طوائف تھی اس کے برعکس امراؤ فیض آباد کے شریف گھرانے کی بیٹی تھی اور گیارہ برس کی عمر میں دلاور خاں اور پیر بخش کے ہاتھوں اغوا کر کے خانم کو کوٹھے پر بیچ دی گئی تھی۔ [3]

فرق نمبر 2: دوسرا فرق دونوں ناولوں کے ہم نام کردار خورشید جان کے مزاج کا ہے۔ اس پر یوسف سرمست لکھتے ہیں کہ:

شاہد رعنا کی خورشید اور امراؤ جان ادا کی خورشید میں فرق یہ ہے کہ امراؤ جان کی خورشید 'رنڈی بننے کے لائق نہ تھی' لیکن شاہد رعنا کی خورشید طوائف ہے وہ میر صاحب (یعنی اس کے معشوق) سے تو محبت کرتی ہے لیکن اپنے پیشے کے تقاضوں کو پورا بھی کرتی ہے۔ وہ امراؤ جان ادا کی خورشید کی طرح ایک سے محبت کرتی ہے تو دوسرے سے بے اعتنائی نہیں برتتی بلکہ ہر ایک کو خوش کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ [4]

دراصل 'امراؤ جان ادا' کی خورشید بیسواڑے کے کسی زمین دار گھرانے کی لڑکی تھی جو بعد میں کسی مصیبت (اس کا مصنف نے کہیں ذکر نہیں کیا) کی بنا پر امراؤ سے بھی پہلے خانم کے کوٹھے پر پہنچا دی گئی تھی۔ وہ کبھی غصہ نہیں کرتی تھی، دوسروں پر بہت جلدی بھروسہ کر لیتی تھی، گھرے پر آنے والوں سے کچھ حاصل کرنے سے زیادہ دے دیتی تھی، خود اپنے ہاتھ سے کھانا پکانا بھی پسند کرتی تھی اور کسی ایک کی ہو کر رہنا چاہتی تھی۔ چنانچہ امراؤ، خورشید کے بارے میں کہتی ہے کہ:

حقیقت یہ ہے کہ وہ رنڈی بننے کی لائق نہ تھی..... سچ تو یہ ہے کہ وہ کسی مرد آدمی کی جورو ہوتی تو میاں بیوی میں خوب نباہ ہوتا۔ عمر بھر مردوا پاؤں دھو دھو کے پیتا..... خورشید کو غصہ کو کبھی آتا ہی نہ تھا۔ ایسی نیک دل اور نیک مزاج عورتیں بہو بیٹیوں میں کم ہوتی ہیں۔ رنڈیوں کا کیا ذکر۔ [5]

فرق نمبر 3: تیسرا فرق دونوں ناولوں میں موجود خاندانی طوائفوں، ننھی جان اور بسم اللہ جان کا ہے۔ اس پر یوسف سرمست لکھتے ہیں کہ:

شاہد رعنا میں جب نواب اختر زمان بالکل تباہ ہو جاتے ہیں اور ادھر ننھی جان بھی اس پیشہ کو ترک کر دیتی ہے تو وہ نواب کو بلا کر، انھوں نے جو کچھ اس کو دیا تھا لوٹا دیتی ہے لیکن اس کے برخلاف امراؤ جان ادا نے (i.e. میں) جب تباہ حالت میں نواب چھبن بسم اللہ کے ہاں آتے ہیں تو وہ انھیں سونے کے وہ کڑے جو حسو نے جعل کر کے نواب سے حاصل کیے تھے دکھاتی ہے اور رسماً پوچھ کر رکھ لیتی ہے۔ یہاں وہ ننھی جان کے بالکل برعکس نواب کی خستہ حالی کو دیکھ کر انھیں ان کا مال لوٹا نہیں دیتی۔ [6]

خیال رہے کہ جس وقت یہ واقعہ پیش آیا تھا اس وقت ننھی اپنے پیشے سے تائب ہو چکی تھی۔ اس کے برخلاف بسم اللہ طوائف کی حیثیت سے اپنے زریں دور سے گزر رہی تھی اور یہ بھی غور کرنے کے قابل ہے کہ ایک زمانے میں ننھی بھی بسم اللہ کی طرح پیسہ یا مال لوٹنے میں مصروف رہتی تھی اور اس کو کبھی رحم نہیں آتا تھا۔ ننھی خود اس

زمانے کو یاد کرتے ہوئے کہتی ہے کہ:

ہم لوگوں نے ہر طرح سے لوٹنا شروع کیا ڈیڑھ دو برس میں ہم نے تیس چالیس ہزار روپے کھینچ لیا۔7

چنانچہ ان واقعات کو لے کر ان دونوں طوائفوں کے مزاج کا موازنہ کرنا قدرے پیچیدہ عمل ہے۔ میرا خیال ہے کہ دونوں طوائفوں کے مزاج پر غور کرنے کے بجائے اس بات پر توجہ دینے کی ضرورت ہے کہ ننھی کی اس تبدیلی کی کیا وجہ رہی ہوگی کہ وہ ایک حریص اور سنگ دل عورت سے بے لوث اور رحم دل عورت بن گئی۔ آگے کے صفحات میں اس پر روشنی ڈالی جائے گی۔

ننھی جان اور بسم اللہ جان کے حوالے سے ایک اور اہم فرق (جس کا یوسف سرمست نے ذکر نہیں کیا) یہ ہے کہ رسوا نے بسم اللہ کو شروع سے ہی ظالم صفت، فرمائشوں کی عادی اور مصنوعی عاشق بننے میں ماہر دکھایا ہے اور ان سب صفتوں کو رسوا نے 'طوائف پن' قرار دیا ہے۔ اس کے برعکس ابتدا میں ننھی اپنے پیشے کی وجہ سے اور اپنی ماں کے کہنے پر ملاقاتیوں سے فرمائش تو کرتی ہے لیکن اس کے اندر مذکورہ 'طوائف پن' کی بڑی کمی نظر آتی ہے۔ اس کی جگہ معصومیت، رحم دلی اور ہمدردی جیسے اوصاف اس کے اندر بہ آسانی دیکھے جاسکتے ہیں۔ اپنے عاشق اوّل نواب سے بے ریا محبت کرنا، ڈپٹی صاحب (جو اس کا گاہک اوّل تھا) سے تعلق قائم کرتے وقت اپنے دل اور پیشے کے درمیان کش مکش میں مبتلا ہونا، میر اور خورشید جان کا دوبارہ سے میل کرا دینا جیسے امور اس کی نیک طبیعت کا پتہ دیتے ہیں لیکن آہستہ آہستہ مردوں کے برتاؤ اور رویے اسے مردوں کی طرف سے بدظن کر دیتے ہیں اور آخر کار وہ بھی بسم اللہ جیسی عیار بن جاتی ہے۔ ان باتوں سے دونوں کرداروں کے ارتقا میں فرق کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس فرق پر آگے مزید روشنی ڈالی جائے گی۔

فرق نمبر 4: آخری فرق ننھی جان اور امراؤ جان کی زندگی کے نتیجے کا ہے۔ یوسف سرمست لکھتے ہیں کہ:

ننھی جان اور ادا دونوں ہی گھر بیٹھ جاتی ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ ادا عارضی طور پر گھر بیٹھتی ہے اور ننھی جان مستقلاً گھر کی ہو رہتی ہے۔ لیکن دونوں اپنی پچھلی زندگی سے تائب ہو جاتی ہیں۔"8

یہاں یوسف سرمست نے امراؤ جان کے عقد نہ ہونے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ "ننھی جان کی طرح ادا بھی گھر بیٹھ جانے کی خواہش رکھتی ہے مگر وہ صرف اس لیے نہیں بیٹھتی کہ لوگ اس بات کو بھی شک کی نگاہ سے دیکھیں گے۔"9 اس فرق پر انھوں نے مزید روشنی نہیں ڈالی۔ اس سلسلے میں ان دونوں ناولوں کے درمیان ایک بڑا فرق یہ بھی ہے کہ 'شاہد رعنا' میں صرف ننھی جان ہی کی نہیں بلکہ خورشید جان اور گیا، کل ملا کر تین طوائفوں کا نکاح کسی شریف آدمی کے ساتھ ہو جاتا ہے اور سب خاتون خانہ بن جاتی ہے۔ لیکن 'امراؤ جان ادا' میں طوائف (یا تائب طوائف) کی ایسی خواہشوں کو پیش تو کیا جاتا ہے (مثلاً امراؤ جان کسی کے گھر بیٹھنا چاہتی ہے اور خورشید جان اپنے پیشے سے نفرت کرتی ہے اور کسی ایک کی ہو کر رہنا چاہتی ہے) مگر کسی طوائف کا نکاح نہیں ہوتا اور نہ کوئی ایسی طوائف نظر آتی جو مستقل طور پر کسی شریف آدمی کے گھر بیٹھ گئی ہو۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ دونوں ناولوں میں موجود یہ فرق دونوں مصنفوں کے نظریاتی بعد کی وجہ سے پیدا ہو گیا ہے جس پر گفتگو کر کے ہم ایک مثبت نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں۔

1857 کے ہنگامے نے اہل ہند کے مختلف طبقوں میں جو انقلاب برپا کیا تھا اس کا اثر طوائفوں کی زندگیوں پر بھی گہرا پڑا۔ اس ہنگامے سے پہلے سماج میں ان کی ایک خاص حیثیت تھی اور وہ تہذیب کا مرقع سمجھی جاتی تھیں مگر غدر کے بعد وہ نہ صرف سماجی وقار سے محروم ہو گئیں بلکہ طرح طرح کے الزامات کا شکار بھی ہوئیں۔ مثلاً خواجہ حسن نظامی نے ایک جگہ 'شاہد رعنا' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مسلمانوں کی بدکاری کا آدھا باعث رنڈیا ہیں۔10 انیسویں صدی کی آخری دہائی کے ہندوستانی سماج میں طوائفوں کو سماج کی تباہی و بربادی کا بڑا سبب سمجھ کر انھیں شریفوں کے معاشرے سے خارج کرنے کی کوشش کی جانے لگی تھی۔ اس کی ایک جھلک خواجہ حسن نظامی کے اس تبصرے میں بھی نظر آتی ہے لیکن قاری سرفراز حسین کے 'تصور طوائف' میں ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ طوائفوں کو سماج سے بے دخل کرنے کے بجائے ان کی اصلاح اور بازآبادکاری کا راستہ ڈھونڈتے ہیں اور سماج میں جگہ دینے کی وکالت کرتے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی کے تبصرے کے جواب میں قاری سرفراز حسین لکھتے ہیں کہ:

"طوائف دوسروں ہی کو تباہ نہیں کرتیں بلکہ باعتبار اکثریت خود بھی تباہ ہوتی ہیں۔"11

اس اقتباس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ طوائف کو صرف سماج کی بربادی کا سبب نہیں سمجھتے بلکہ اسے بھی نقصان اٹھانے والا فریق سمجھتے ہیں۔ اس لیے انھوں نے اس ناول میں ایک کردار ننھی جان کے ذریعے طوائفوں کو اس بربادی سے بچنے کا راستہ دکھایا ہے اور انھیں توبہ کر کے کسی کی منکوحہ بننے کی تجویز پیش کی ہے۔ اس ناول کا مطالعہ کرنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے طوائفوں کو شریف آدمی کی منکوحہ بننے کی یوں ہی اجازت نہیں دی بلکہ ان پر چند شرطیں بھی عائد کیں۔ وہ یہ کہ نیکی کے راستے پر گامزن رہنا اور اس زمانے کی مثالی عورت (یعنی اچھی بیوی، اچھی ماں، اچھی منتظم خانہ اور اچھی مسلمہ) بن کر رہنا۔ چنانچہ شادی کے بعد وہ بھی نہایت نیک اور مثالی عورت بن کر باقی زندگی بسر کرتی ہیں۔ دونوں ناولوں کے مابین تیسرے فرق کا ذکر کرتے وقت میں نے یہ سوال قائم کیا تھا کہ ننھی کے مزاج میں یہ زبردست تبدیلی کیسے آگئی کہ ایک حریص اور سنگ دل عورت سے بے لوث اور رحم دل عورت بن گئی۔ میرا خیال ہے کہ ننھی میں یہ تبدیلی سرفراز حسین عزمی کی ان شرطوں کا نتیجہ ہے جو انھوں نے شرفا کی منکوحہ بننے کے لیے طوائفوں پر لازم کی تھیں۔

اس کے برخلاف رسوا طوائفوں کی اصلاح کے حق میں نہیں ہیں بلکہ وہ انھیں شریفوں کی دنیا، اور خصوصاً شریف، بہو بیٹیوں کی دنیا سے دور رکھنے کی وکالت کرتے ہیں۔ اس بات کا اندازہ 'امراؤ جان ادا' کے ان صفحات سے لگایا جاسکتا ہے جس میں رسوا نے عورتوں کو تین گروہ میں تقسیم کر کے ان کا امتیاز واضح کیا ہے، ایک نیک بختوں کا، دوسرا خرابیوں یعنی ان عورتوں کا جو شریف گھر کی ہونے کے باوجود چوری چھپے یا علی الاعلان بدکاری کرتی

1857 کے ہنگامے نے اہل ہند کے مختلف طبقوں میں جو انقلاب برپا کیا تھا اس کا اثر طوائفوں کی زندگیوں پر بھی گہرا پڑا۔ اس ہنگامے سے پہلے سماج میں ان کی ایک خاص حیثیت تھی اور وہ تہذیب کا مرقع سمجھی جاتی تھیں مگر غدر کے بعد وہ نہ صرف سماجی وقار سے محروم ہوگئیں بلکہ طرح طرح کے الزامات کا شکار بھی ہوئیں۔ مثلاً خواجہ حسن نظامی نے ایک جگہ 'شاہد رعنا' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مسلمانوں کی بدکاری کا آدھا باعث رنڈیا ہیں۔ 10 انیسویں صدی کی آخری دہائی کے ہندوستانی سماج میں طوائفوں کو سماج کی تباہی و بربادی کا بڑا سبب سمجھ کر انہیں شریفوں کے معاشرے سے خارج کرنے کی کوشش کی جانے لگی تھی۔

ہوں، اور تیسرا بازاریوں کا اور رسوا کے نزدیک صرف وہی عورتیں نیک بختوں سے مل سکتی ہیں جو بدنام نہ ہوں یعنی ان کی نظر میں خرابیوں یا بازاری عورتوں کو نیک بختوں سے ملنے کا حق حاصل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گھر کی چار دیواری کے اندر کسی بازاری عورت کے قدم رکھنے کو وہ باعث ننگ سمجھتے ہیں۔ اس لیے اپنے ناول کے کردار 'رسوا' سے اس طرح کہلواتے ہیں کہ:

اگر میری بیوی ایسا کرتی (یعنی کسی بازاری عورت کو اپنے گھر کے اندر آنے دیتی) تو، فوراً ڈولی بلوا کے ان کے میکے بھجوا دیتا اور چھ مہینے تک صورت نہ دیکھتا۔ 12

طوائفوں کے نکاح کے معاملے میں دونوں مصنفوں کی رائے کس قدر مختلف تھی، اس کا اندازہ ننھی جان اور امراؤ جان کے ان اقوال سے لگایا جاسکتا ہے جو ناول کے آخر میں دونوں نے اپنی ہم پیشہ عورتوں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا تھا۔ ننھی کہتی ہے کہ:

اے میری بہنو۔ جو ابھی تک شیطان کے جال میں پھنسی ہوئی ہو میری زندگی کے حالات پڑھ کر خدا سے دعا مانگو کہ وہ تمھیں بھی اس گنہ گاری سے بچائے اور اپنے فضل سے نیکی کا راستہ دکھائے۔ 13

اس کے برعکس رسوا نے اپنے ناول کو امراؤ جان کے اس قول سے ختم کیا ہے:

اے، بے وقوف رنڈی کبھی اس بھلاوے پر نہ آنا کہ کوئی تجھ کو سچے دل سے چاہے گا۔ تیرا آشنا جو ہر وقت تجھ پر جان دیتا ہے چار دن کے بعد چلتا پھرتا نظر آئے گا۔ وہ تجھ سے ہرگز نباہ نہیں کرسکتا اور نہ تو اس لائق ہے۔ سچی چاہت کا مزا اسی نیک بخت کا حق ہے جو ایک کا منہ دیکھ کے دوسرے کا منہ کبھی نہیں دیکھتی۔ تجھ ایسی بازاری شفتل کو یہ نعمت خدا نہیں دے سکتا۔ 14

غور طلب بات ہے کہ رسوا نے نیک عورت اور طوائف کے اس امتیاز کو تین جگہ دہرایا ہے۔ ناول کو اس فقرے پر ختم کرنا اور بار بار اس کا استعمال کرنا (اس ناول میں دوسری کوئی مثال نہیں ملتی جس کی تکرار ہوئی ہو) اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ مصنف کی نظر میں یہ بات کس قدر اہم ہے۔

مندرجہ بالا تجزیہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ 'شاہد رعنا' اور 'امراؤ جان ادا' میں طوائف کا جو تصور پیش کیا گیا ہے وہ ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے اور میرا خیال ہے کہ دونوں مصنفین کے نظریاتی بعد کی وجہ سے ہی ان کے ناولوں میں چھوٹے بڑے کئی فرق نمودار ہوئے ہیں۔ مثلاً فرق نمبر 1 جو ننھی جان اور امراؤ جان کے پیدائشی احوال پر مبنی ہے، اس فرق کے بارے میں یوسف سرمت لکھتے ہیں کہ:

''رسوا نے امراؤ کا تعلق ایک شریف گھرانے سے بتا کر اپنے ناول میں یہ بات پیدا کردی ہے کہ بعض وقت حالات و واقعات کسی شریف لڑکی کو بھی طوائف بنا دیتے ہیں۔''15

ممکن ہے کہ یہ بھی ایک وجہ رہی ہو لیکن مندرجہ بالا تجزیے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس فرق کو پیش کرتے ہوئے رسوا اس نظریے کی صراحت کر رہے ہوں کہ قاری سرفراز حسین عزمی نے تو ننھی کو ایک پیدائشی طوائف ہونے کے باوجود شریف آدمی کے ساتھ نکاح کرکے گھر بیٹھنے کی اجازت دے دی لیکن ان (رسوا) کی نظر میں طوائف، خاندانی ہو یا کسی شریف گھر کی، حرص و ہوا کی وجہ سے طوائف بنی ہو یا بحالت مجبوری، وہ کسی شریف مرد کی منکوحہ بننے کے حق سے محروم ہے۔ جب رسوا نے انھی خیالات کے بنا پر امراؤ جان اور خورشید جان جیسی شریف گھرانے کی پروردہ خواتین کو بھی کسی کی منکوحہ بننے کی اجازت نہیں دی تو بسم اللہ جان جیسی خاندانی طوائف کو کیسے اجازت دیتے بلکہ ان کو اس کے اندر اصلاح کی اور نیک بننے کی گنجائش ہی نظر نہیں آتی۔ چنانچہ وہ اپنے ناول میں لکھتے ہیں کہ:

''میں نے اکثر لوگوں کو کہتے سنا ہے کہ جو ذات کی رنڈیاں ہیں ان کا تو ذکر ہی کیا۔ جو کچھ نہ کریں کم ہے کیونکہ وہ ایسے گھر اور ایسی حالت میں پیدا ہوتی ہیں جہاں سوائے بدکاری کے اور کسی چیز کا مذکور ہی نہیں۔ ماں بہن جس کو دیکھتے ہیں اسی حالت میں ہے۔ 16

اس کے برعکس قاری سرفراز حسین ایک خاندانی طوائف ننھی جان کے اندر 'راست منشی اور پاک منشی' کا اعلیٰ مادہ دیکھتے ہیں۔ 17 یہی وجہ ہے کہ کہانی کے ابتدا میں اسے ایک معصوم، رحم دل اور ہمدرد لڑکی کے طور پر پیش کیا جاتا ہے اور وسط میں ایک بار وہ ظالم اور عیار طوائف بن جاتی ہے لیکن اختتام تک پہنچتے پہنچتے اس کی اصلاح ہو جاتی ہے اور وہ ایک نیک اور مثالی عورت بن جاتی ہے۔ یہ اسی 'راست منشی اور پاک منشی' کے مادے کی بازیافت ہے جسے قاری سرفراز حسین ہر طوائف میں دیکھتے ہیں۔

اسی طرح فرق نمبر 2 بھی ملاحظہ ہو۔ 'شاہد رعنا' کی خورشید جان، جو اپنے معشوق سے محبت بھی کرتی ہے لیکن اپنے پیشے کے تقاضوں کو بھی پورا کرتی ہے، اس کو بھی قاری سرفراز حسین نے عقد کے بعد ایک شریف آدمی کے گھر میں جگہ دی لیکن 'امراؤ جان ادا' کی خورشید جان؟ وہ زمین دار گھرانے کی پروردہ تھی اور ان خوبیوں کی مالک تھی جو اس زمانے میں ایک مثالی عورت کے لیے ضروری تصور کی جاتی تھیں۔ اس کے باوجود بھی اس کی یہ خواہش پوری نہیں ہوتی کہ کسی ایک کی ہو کر رہے۔ ایسا اس لیے کیونکہ رسوا کی نظر میں سچی محبت صرف نیک بختوں کا حصہ ہے کسی بازاری شفتل کو یہ نعمت خدا نہیں دیتا او وہ گھر کی چار دیواری کے اندر قدم رکھنے کے حق سے محروم ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ناول 'امراؤ جان ادا' کے وسط میں ایک راجہ کا دل خورشید پر آجاتا ہے اور وہ اسے اغوا کرالیتا ہے۔

کہانی میں اتفاق سے امراؤ جان کی ملاقات خورشید جان سے ہوتی ہے تو وہ دیکھتی ہے کہ خورشید راجہ کے ساتھ اطمینان سے زندگی گزار رہی ہے کیونکہ اس کی یہی خواہش تھی کہ کسی ایک کی ہو کر رہے۔ چنانچہ جب امراؤ جان اس سے پوچھتی ہے کہ ''تمھارا ارادہ لکھنؤ جانے کا نہیں ہے؟'' تو وہ صاف صاف کہہ دیتی ہے کہ ''مجھے تو معاف کرو۔''18 مگر ناول کے آخر میں جب امراؤ فیض آباد سے پھر لکھنؤ واپس آتی ہے تو خانم کے کوٹھے پر خورشید جان بھی نظر آتی ہے۔

دونوں ناولوں میں پیش کیے جانے والے فرق اور مصنفوں کے نظریات کو دیکھتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سرفراز حسین کا طوائفوں کو کسی شریف کی منکوحہ بنا کر پیش کرنا رسوا کو ناگوار معلوم ہوا ہوگا۔ اس لیے انھوں نے اپنے نظریے کی تشریح کرتے ہوئے اس شاہ کار ناول 'امراؤ جان ادا' کی تصنیف کی۔ دونوں ناولوں میں موجود بعض مماثلتوں پر نظر کریں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ

دونوں ناولوں میں پیش کیے جانے والے فرق اور مصنفوں کے نظریات کو دیکھتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سرفراز حسین کا طوائفوں کو کسی شریف کی منکوحہ بنا کر پیش کرنا رسوا کو ناگوار معلوم ہوا ہوگا۔ اس لیے انھوں نے اپنے نظریے کی تشریح کرتے ہوئے اس شاہ کار ناول 'امراؤ جان ادا' کی تصنیف کی۔ دونوں ناولوں میں موجود بعض مماثلتوں پر نظر کریں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ناول پہلے ناول کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ ورنہ رسوا جیسے فنکار سے ایسی غلطی کی توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اپنی تخلیق میں کئی ایسی مماثلتوں کو جگہ دیں جن سے بادی النظر میں ہی ان کا ناول کسی دوسرے ناول سے متاثر معلوم ہونے لگے۔

ناول پہلے ناول کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ ورنہ رسوا جیسے فنکار سے ایسی غلطی کی توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اپنی تخلیق میں کئی ایسی مماثلتوں کو جگہ دیں جن سے بادی النظر میں ہی ان کا ناول کسی دوسرے ناول سے متاثر معلوم ہونے لگے۔ میرا خیال ہے کہ یہ تمام تفاریق اور مماثلتیں شعوری طور پر پیدا کی گئی ہیں جو قاری کو طوائف کے متعلق ان کے نظریے کی تفہیم میں بہت معاون بھی ہیں۔

اس سلسلے میں غور کرنے کی بات یہ بھی ہے کہ سرفراز حسین نے نھنی جان، خورشید جان اور درگیا جیسی تائب طوائفوں کا عقد شریف آدمیوں سے کرا تو دیا مگر اس کے بعد کیا وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ ان عورتوں کی شریف بہو بیٹیوں سے ملاقات بھی ہو اور دونوں مل جل کر رہیں۔ اس نکتہ پر غور کرنے کے لیے نھنی اور میر کی یہ گفتگو قابل توجہ ہے جو خورشید جان سے نکاح کے سلسلے میں دونوں کے درمیان ہوئی:

میر صاحب: بخدا میرا خود جی چاہتا ہے مگر صرف یہ ڈر ہے کہ لوگ کیا کہیں گے۔

میں: جو مرزا صاحب کو کہا وہی آپ کو بھی کہیں گے۔ بتاؤ۔ مجھ سے نکاح کرکے ان میں کیا کیڑے پڑ گئے۔

میر صاحب: مگر پھر میں اپنے کنبہ میں ملنے کے قابل نہیں رہنے کا۔

میں: ہم لوگوں کو آپ اپنا کنبہ سمجھیے گا۔ میر صاحب اگر اللہ کو منظور ہے تو ہمیں کسی کی بھی پرواہ نہیں رہے گی۔ ہم سب کا خود ایک بڑا کنبہ ہو جائے گا۔[19]

نھنی کے آخری جملوں کی طرح ناول میں یہ دکھایا جاتا ہے کہ تائب طوائف اور شریف مرد کے تین جوڑے، نھنی و مرزا، خورشید و میر اور درگیا و ڈپٹی ایک دوسرے کے خاندان سے مل جل کر زندگی بسر کرتے ہیں۔ مرزا کے بھائی کا اکلوتا بیٹا مسعود کو (جس کی پرورش بھائی کے انتقال کے بعد مرزا کر رہا تھا) ڈپٹی اور درگیا گود لے لیتے ہیں اور اس کا نکاح نھنی کی بیٹی نصیبن (نھنی کے نکاح کے بعد اس کا نام جمیلہ بیگم رکھا گیا تھا) سے ہو جاتا ہے اور یہ سب ایک کنبے کی طرح زندگی گزارتے ہیں۔

اس طرح کہانی میں تینوں خاندان کے درمیان آمد و رفت کا سلسلہ بنا رہتا ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ نھنی کے یہاں نواب کی بیگم مع اپنے شوہر کے صرف ایک بار آتی ہے۔ اس کے بعد اس کی ملاقات کسی شریف ہندوستانی عورت سے نہیں ہوتی۔ اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شریف عورتوں کے طوائفوں یا تائب طوائفوں سے ملاقات کو قاری سرفراز حسین بھی ناپسند کرتے۔ اس بات کی تصدیق ان کے دوسرے ناول 'سراب عیش' سے بھی کی جاسکتی۔ اس ناول کے سرورق پر ہی مصنف نے اس ناول کا موضوع اس طرح بیان کیا ہے:

طوائف سے نکاح کرکے ان کو بہو بیٹیوں میں لا کو رکھنے کے برے نتائج۔[20]

اس ناول میں بھی مصنف نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ جب طوائف اپنے پیشے سے توبہ کر لیتی ہے تو اس کے لیے جنت کے دروازے کھل جاتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنی اس فکر کا بھی اظہار کیا ہے:

توبہ سے پہلے تو وہ کھلم کھلا طور پر خبیث عورتوں کی فہرست میں ہے مگر توبہ کر کے بھی باوجود اس حوصلہ افزائی وعدہ کے کہ:

التائب من الذنب کمن لاذنب له

(گناہ سے توبہ کرنے والا بے گناہ کے مثل ہے)

سوال یہ ہے کہ اس کے خبیث خصائل و عادات جو سالہا سال تک خبیث زندگی بسر کرنے کا نتیجہ ہیں کیونکر یک لخت بدل سکتے ہیں۔ وہ عورت عذاب آخرت سے نجات پاجائے مگر اس کی زہریلی عادتیں اگر بہو بیٹیوں میں اسے ملایا جائے تو قطعاً ان پر اور ان کی اولاد پر بھی اپنا زہریلا اثر ڈالیں گی۔[21]

پھر بھی کسی سے نکاح کرنے کو وہ طوائف کی اصلاح کا ایک مفید راستہ سمجھتے تھے۔ اس لیے اس مسئلے پر غور کرنے کے بعد وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں:

اس نظریہ کو صحیح مانا جائے تو نہ رنڈی باز شخص کا نکاح نیک بخت عورت سے جائز ہے اور نہ طوائف کا نکاح نیک مرد سے۔ مگر پھر بھی چونکہ طوائف اور طوائف نواز اشخاص دونوں کے لیے اس سے بہتر کوئی اور بات نہیں کہ آپس میں نکاح کرلیں۔ لہٰذا منطقی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تائب طوائف اور تائب طوائف نواز اشخاص نکاح کرکے اپنی سوسائٹی علیحدہ بنائیں۔[22]

اس اقتباس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جس طرح رسوا نے طوائفوں (ان میں تائب طوائفیں بھی شامل ہیں) کی دنیا اور شریفوں کی دنیا کو الگ رکھنے کی کوشش کی ہے، اس طرح سرفراز حسین طوائفوں کے تعلق سے معاشرے کو تین حصوں میں تقسیم کرنے کی کوشش کرتے ہیں یعنی شریفوں کی دنیا، تائب طوائفوں کی دنیا اور طوائفوں کی دنیا۔ ممکن ہے کہ 'شاہد رعنا' میں نھنی کے یہاں کسی شریف عورت کی آمد و رفت نہ ہونے میں مصنف کا یہ خیال کارفرما ہو۔ مرزا ہادی رسوا جہاں طوائف کی اصلاح کے حق میں ہی نہیں ہیں وہاں قاری سرفراز حسین کا رویہ قدرے نرم ہے مگر غور طلب بات یہ ہے کہ وہ طوائف کی اصلاح سے اس کی عاقبت سنوار دیتے ہیں لیکن سماجی تفریق سے اس کو بچا لینے کے پھر بھی قائل نہیں ہیں۔

حواشی

1. یوسف سرمست ڈاکٹر میمونہ انصاری کی کتاب 'مرزا محمد ہادی، مرزا اور رسوا' اور دیگر مورخ و ادیب کی رائے کا جائزہ لے کر 'امراؤ جان ادا' کے سنہ اشاعت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ''بہرحال یہ بات بالکل قطعی ہے کہ 'امراؤ جان ادا' 1899 سے پہلے شائع نہیں ہوئی تھی ('بیسویں صدی میں اردو ناول' از یوسف سرمست، ترقی اردو بیورو، دہلی 1995، ص 88)'' اور سرفراز حسین کا دوسرا ناول 'سعادت' کے پہلے ایڈیشن کے سرورق اور 'التماس مصنف' اور سہیل بخاری کی کتاب 'اردو ناول نگاری' کے حوالے دے کر ثابت کرتے ہیں کہ 'شاہد رعنا' 1897 یا اس سے پہلے لکھا گیا ہے۔
2. نقوش لاہور، شخصیت نمبر (جنوری 1955)، ص 527
3. 'بیسویں صدی میں اردو ناول' از یوسف سرمست، ترقی اردو بیورو، دہلی، 1995، ص 89
4. ایضاً، ص 97
5. 'امراؤ جان ادا' از مرزا محمد ہادی رسوا، منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز پریس، لکھنؤ، ص 87-80
6. 'بیسویں صدی میں اردو ناول' از یوسف سرمست، ترقی اردو بیورو، دہلی، 1995، ص 99-98
7. 'شاہد رعنا' از قاری سرفراز حسین، دفتر تمدن، دہلی، ص 109-108
8. 'بیسویں صدی میں اردو ناول' از یوسف سرمست، ترقی اردو بیورو، دہلی، 1995، ص 99
9. ایضاً
10. 'سراب عیش' از قاری سرفراز حسین، قاری (تمدن) بک ڈپو، دہلی، ص 78
11. ایضاً، ص 78
12. 'امراؤ جان ادا' از مرزا محمد ہادی رسو، منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز پریس، لکھنؤ، ص 150
13. 'شاہد رعنا' از قاری سرفراز حسین، دفتر تمدن، دہلی، ص 191
14. 'امراؤ جان ادا' از مرزا محمد ہادی رسو، منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز پریس، لکھنؤ، ص 185
15. 'بیسویں صدی میں اردو ناول' از یوسف سرمست، ترقی اردو بیورو، دہلی، 1995، ص 89
16. 'شاہد رعنا' از قاری سرفراز حسین، دفتر تمدن، دہلی، ص 138-137
17. ایضاً، ص 129
18. 'امراؤ جان ادا' از مرزا محمد ہادی رسوا، منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز پریس، لکھنؤ، ص 103
19. 'شاہد رعنا' از قاری سرفراز حسین، دفتر تمدن، دہلی، ص 178
20. 'سراب عیش' از قاری سرفراز حسین، قاری (تمدن) بک ڈپو، دہلی، سرورق
21. ایضاً، ص 11
22. ایضاً

Murakami Asuka
Tokyo Japan

محی الدین زور کشمیری

جموں و کشمیر میں ہم عصر اردو ڈراما اور تھیٹر کی صورتِ حال

ریاست جموں و کشمیر میں اردو تھیٹر کی باضابطہ طور پر شروعات پارسی تھیٹریکل کمپنیوں نے کی، جنھیں پہلے ڈوگرہ مہاراجوں نے یہاں بلایا اور پھر وہ اپنے کاروباری اغراض کے تحت خود بھی آتے رہے۔ ان کے اثر سے یہاں مقامی سطح پر بھی اردو تھیٹر قائم کیے گئے۔ ترقی پسند تحریک کے تحت یہاں IPTA بھی قائم ہوا۔ اس دوران پورے ہندوستان میں عالمی ڈراما کی مختصر تاریخ ریاست کے دو مصنفین محمد عمر نور الٰہی نے 1924 میں 'ناٹک ساگر' عنوان سے لکھی۔

اکتوبر 1947 کشمیر کی تاریخ کا ایک خاص Turning Point ہے۔ اُس وقت تک یہاں اُردو ڈراما اور تھیٹر پوری طرح سے جم چکا تھا۔ ایک طرف اسٹیج ریڈیو اور کتابی صورت میں بھی ڈرامے شائع کیے جاتے تھے اور نئے نئے موضوعات کے ساتھ تکنیک کو بھی بروئے کار لایا جاتا تھا۔ پروفیسر محمود ہاشمی کا ڈراما 'کشمیر یہ ہے' مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ ان کے بعد پردیسی، وجے سمن سوہن، وید راہی، پران کشور، رام کمار ابرول، نریندر کھجوریہ، بنسی نردوش، پُشکر ناتھ، علی محمد لون، تجو سیلانی وغیرہ تک بہت سارے رائٹرس ایسے آگئے، جنھوں نے ریاست میں اردو ڈراما اور تھیٹر کو جلا بخشی۔ اس طرح ریڈیو ٹی وی اسٹیج ڈراما کا کافی مواد یہاں جمع ہوا، جس پر آج ہمیں تحقیق کرنے کی ضرورت شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔

جہاں تک ریاست جموں و کشمیر میں معاصر اردو ڈراما اور تھیٹر کا تعلق ہے، اس ضمن میں میرے سامنے بہت سارے نام ہیں جن کی ڈراما نگاری پر الگ الگ تحقیقی و تنقیدی مقالے لکھنے کی اشد ضرورت ہے۔ یہاں ریاست جموں و کشمیر میں معاصر اردو ڈراما نگاروں کو دو گروپوں میں تقسیم کیا جائے گا۔

1۔ وہ سینئر لوگ جو اپنی بزرگی میں بھی لکھ رہے ہیں یا اپنا لکھا ہوا مواد آج شائع کرتے رہتے ہیں۔

2۔ ایسے لوگ جنھوں نے اکیسویں صدی میں لکھنا اور شائع ہونا شروع کیا اور آج وہ اپنے بلند حوصلوں کے ساتھ لکھ رہے ہیں یا تھیٹر کر رہے ہیں۔

آج ٹیکنالوجی کے دور میں جس قدر مقابلہ آرائی ہے، ٹھیک اسی قدر ایک فنکار کو اپنا فن ظاہر کرنے کے بہت سارے وسیلے بھی موجود ہیں، جنھیں وہ ہر سطح پر بروئے کار لا سکتا ہے۔ ہمارے ڈراما نگار کو یہاں دو طرح کے چیلنجز درپیش ہیں: ایک طرف مختلف وجوہات کی بنا پر ہم اپنی ثقافت سے دور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ دوسری طرف مختلف ٹی وی چینلز، کیبل نٹ ورک ڈش اور انٹرنیٹ ایک سے بڑھ کر ایک فرحت کا سامان ہمیں فراہم کر سکتے ہیں۔ اس کے باوجود بھی ہمارا فنکار زندہ ہے اور وہ اپنے محاذ پر لڑ رہا ہے۔ یہاں چند ڈراما نگاروں کو متعارف کیا جائے گا۔

عالی قدر نور شاہ تقریباً پچھلے ساٹھ برسوں سے خالص اردو میں لکھ رہے ہیں اور انھوں نے یہاں فکشن کے میدان کو خوب سنوارا اور سجایا۔ ساتھ ہی انھوں نے ریڈیو، ٹی وی اور تھیٹر کے لیے درجنوں ڈرامے بھی لکھے، جن میں کچھ شائع بھی ہوئے۔ 'سفر زندگی کا' ان کا ایک اہم ڈراما ہے، جس میں کشمیر کے موجودہ حالات کے پیش نظر ہمارے روایتی بھائی چارے کو فروغ دینے کی اچھی کوشش کی گئی۔ وہ اپنے افسانوں کی طرح اپنے ڈراموں میں بھی کشمیر کے موجودہ حالات کو کسی نہ کسی طرح چھیڑتے ہیں اور ہمیشہ نئی صبح کی تلاش میں نکلتے ہوئے نظر آجاتے ہیں۔ ان کے ڈراموں کو معمولی ترمیم و اضافے کے بعد ہم کسی بھی میڈیا کے ذریعے پیش کر سکتے ہیں۔ ان کے ڈراموں کو ان کی کتاب 'کشمیر کی کہانی' میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

وریندر پٹواری (1940) انجینئری پیشے سے تعلق رکھنے کے باوجود بھی ادب کے دیوانے ہیں اور انھوں نے بقول دیپک بدکی 13 ریڈیو ڈرامے، چھے اسٹیج ڈرامے، سات ٹیلی ویژن ڈرامے، چار ٹیلی فلمیں، چار ٹیلی سیریل اور کچھ ڈاکومینٹریز لکھیں۔ ان کے مجموعے 'آخری دن' کے ڈراموں کو معمولی ترمیم کے بعد ٹی وی ریڈیو کے ساتھ ساتھ اسٹیج بھی کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے اپنا ڈراما 'گھر' ایپک تھیٹر کی تکنیک پر لکھا۔ اسی طرح ڈراما 'آخری دن' علامتی طور پر لکھا گیا، جس میں ملکی اور بین الاقوامی حالات کو موضوع بنایا گیا۔ پٹواری کے ڈراموں میں کہیں نہ کہیں ایبسرڈ ڈرامے کے عناصر ہمیں ملتے ہیں، جہاں زندگی کو بالکل عریاں دکھایا گیا۔ مثلاً ڈراما 'انسان' کا یہ مکالمہ دیکھیں:

''تحصیلدار: انسان گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا ہے، خصلت نہیں بدلتی۔ یہ شخص جن کا Compensation مانگ رہا ہے، ان میں اس کی مقتولہ بیوی کے باپ کا نام بھی ہے۔

منجے: واہ! بیوی کا انشورنس نہیں مل سکا، تو سسُر کی لاش کی قیمت ہی سہی۔

جیلر: سوامی تم کیسے انسان ہو؟

پروفیسر ظہور الدین (1944) نے اپنی متعدد کتابوں کے ساتھ ساتھ ڈراما شناسی کے حوالے سے دو یادگار کتابیں اور کچھ مضامین رقم کیے۔ علاوہ ازیں ان کے کچھ ڈرامے بھی شائع ہوئے۔ وہ دوسروں سے کچھ ہٹ کر لکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے ڈراموں میں موت کا جزیرہ، لندن، عبرت خیز ہے۔ تیرا افسانہ، بریف کیس، نئی دنیا ہماری نظروں سے گزرے۔ وہ اپنے ڈراموں میں

دیو مالائی اور اساطیری عناصر کو بھی پیش کرتے ہیں، ساتھ ہی سائنس فکشن کے موضوع کو بھی چھیڑتے ہیں، جس کے نتیجے میں ان کا ڈراما ادب پارہ تو ضرور بنتا ہے، مگر تھیٹر یا ٹی وی کی دنیا سے وابستہ تماش بین کو وہ محظوظ نہیں کرسکتے ہیں۔ ڈراما 'موت کا جزیرہ' کے مکالمے اس قدر طویل ہیں کہ موصوف کے تخلیق کردہ کردار انشائیہ سُناتے ہیں۔ جن کے لیے ہمیں صفحۂ قرطاس ہی چاہیے نہ کہ یہ مکالمے ایکٹروں کی زبان سے کہلوائے جاسکتے ہیں۔

ریاست جموں وکشمیر میں شیام سندر آنند لہر ایک ادبی تحریک سے کچھ کم نہیں ہیں۔ انھوں نے فکشن اور ڈراما نگاری میں ان مٹ نقوش چھوڑ دیے ہیں۔ 'نروان' کے بعد ان کا ایک اہم ڈراما 'تم سوی کون' کے عنوان سے ہے۔ سماجی موضوع پر یہ ایک فل لینگتھ پلے ہے۔ یہ ڈراما غلط طریقے سے دولت حاصل کرنے اور سماج میں اعلا رتبہ پانے کے بارے میں ایک چونکا دینے والی اسٹوری بیان کرتا ہے۔ لہر نے امن، دوستی اور یکجہتی کے موضوع پر 'سرحد کے پیچھے' عنوان کا ایک ڈراما لکھا۔

ڈاکٹر عزیز حاجنی کشمیری زبان و ادب کے لیے تیز دھاروں والی مہم چلا رہے ہیں۔ کشمیری میں لکھنے کے ساتھ ساتھ انھوں نے اردو میں بھی 'وتستا کی سیر' کے عنوان سے اپنے ٹی وی سیریل کو کتابی صورت میں شائع کیا، جس میں کشمیری تہذیب کے مختلف گوشوں کو اُجاگر کیا گیا۔

بلراج بخشی صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے تخلیق کار بھی ہیں۔ وہ عام سماجی موضوعات پر بے باک طریقے سے ڈرامے بھی لکھتے ہیں اور ہمارے سیاسی نظام اور انتظامیہ پر باز کی نظر رکھتے ہیں۔ ان کا ڈراما 'قانون شکن' نمونے کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے، جس میں انھوں نے ایک ڈرامے کے پلاٹ میں طرح طرح کے موضوعات کو گلدستے کی طرح سجایا ہے۔

محمد امین بٹ نے ڈراما 'روح کی آہٹ' میں بین المتونیت کی تکنیک پر عربی روایت کو عصر حاضر کے ایک اہم مسئلے کے ساتھ اس طرح مکس کیا کہ یہاں آکر بات یکدم صد فیصد ہمارے دل و دماغ میں اُتر جاتی ہے۔ آج بیٹیوں کو جنم دینے سے پہلے ہی مارا جاتا ہے، جب کہ عرب والے انھیں جنم لینے کے بعد دفناتے تھے۔ میرا مطلب ہے کہ FOETUS کی جانچ آج کل ایک عالمی مسئلہ بن گیا ہے۔ بقول بٹ صاحب کے:

''بچہ: غلط فہمی تھی ان کی .... مشینوں پر ایمان لائے ہیں........ یہ فیصلے تو کہیں اور ہوتے ہیں مما ....انسان کی بنائی ہوئی مشینوں میں نہیں........''

واقعی ہمارے ہاتھوں قتل ہوئے ان بے قصور روحوں کی آہٹ یہ ڈراما پڑھنے کے بعد ہمیں سُنائی دیتی ہیں۔ بٹ صاحب نے سحر ہونے تک، کرن کرن اُجالا، نئی صبح، تلاش وغیرہ جیسے ڈرامے بھی لکھے۔

اس وقت وادی کشمیر کا ایک اہم اردو ڈراما نگار اشرف عادل مانا جاسکتا ہے۔ ان کے ڈرامے باضابطہ طور پر نشر ہوتے رہتے ہیں۔ وہ کتابی صورت میں بھی شائع ہوئے۔ ان کی خوبی اس بات میں مضمر ہے کہ وہ عام موضوعات سے ہٹ کر لکھتے ہیں۔ وہ عالمی سطح کے مسائل اپنے ڈراموں میں اٹھاتے ہیں۔ جیسے بھوک، عالمی امن (ڈراما نفرت کی لکیر) ایڈس وغیرہ۔ ساتھ ہی وہ خالص تاریخی اور ادبی موضوعات کو بھی چھیڑتے ہیں۔ حضرت محل، حکم حاکم اور تمثیل داغ اس ضمن میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس طرح اپنے ڈراما کے مجموعے 'چاند کا ہم شکل' میں وہ موضوع اور تکنیک کے حوالے سے بالکل نئے تجربے کرتے ہوئے ہمیں نظر آتے ہیں۔ یہ ڈرامے ہر میڈیا کے لیے موزوں ہیں، البتہ ان میں گلیمر کا عنصر کچھ زیادہ ہی پایا جاتا ہے۔

موجودہ دور میں منوج شیری بھی افسانوں کے ساتھ ساتھ ریڈیو، ٹی وی اور اسٹیج کے لیے لکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کے ڈراموں کا ایک مجموعہ ''بکھرے بچھڑے'' کے عنوان سے 2016 میں منظر عام پر آیا۔ منوج شیری اپنے ڈراموں کے موضوعات کشمیر کی خوبصورتی اور یہاں کے روایتی بھائی چارے سے لیتے ہیں۔ ساتھ ہی وہ اساطیری اور دیو مالائی کرداروں کو بھی آج کے دور میں زندہ کرتے ہیں۔ اسٹیج کرافٹ کا ہر حال میں وہ لحاظ رکھتے ہیں۔ ان کے ڈرامے ہمارے سماج اور کلچر کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ کہیں وہ نفسیاتی طور پر ہماری ذہنی اُلجھنوں کو دُور کرنا چاہتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد مجید نے مشہور ڈراما نقاد اخلاق اثر پر Ph.D کیا اور وہ ڈراما شناسی کے ساتھ ساتھ خود بھی ڈرامے لکھتے ہیں۔ 'ادھورے خواب' ان کا ایک مکمل ریڈیو ڈراما ہے، جس کو انھوں نے 2009 میں کتابی صورت میں شائع بھی کیا۔ ریڈیو ڈراما کی تکنیک کے پیش نظر یہاں انھوں نے مختلف اصوات اور موسیقی کا خاص خیال رکھا ہے۔

ولی محمد خوشباش نے اپنے ٹی وی ڈرامے 'رشتہ' میں پہلے تجسس قائم کیا ہے، اس کے بعد اس کا انجام ایسے پیش کیا کہ ہم ضرور اس سے چونک جاتے ہیں۔ دوسری طرف وہ انسانی رشتوں کی بات اس طریقے سے کرتے ہیں کہ واقعی ہمارے اندر کا سویا ہوا انسان بیدار ہونے لگتا ہے۔

شوکت شہری (منٹو کا فارمولا) کی خوبی یہ ہے کہ وہ عصری موضوعات کو چھیڑتے ہیں اور کرداروں کو اپنی ہی زبان بخشتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ اسٹیج کاری کے لوازمات کا پورا پورا خیال اپنے اسٹیج ڈراموں میں رکھتے ہیں۔ رابعہ یوسف ٹی وی ڈراموں (پرایا آنگن) میں کشمیر کے روایتی گھریلو مسائل کو ہاتھ لگاتے ہیں۔ جہاں ہماری بہو بیٹیوں اور بزرگوں کے ساتھ ناروا سلوک کیا جاتا ہے۔

شوکت نسیم کے ڈرامے (سچ کی جیت) کا انداز بھی روایتی ہے، جہاں امیری غریبی کے بیچ میں تصادم ہوتا ہے۔ گاؤں کا لالہ یا ٹھاکر ان کی بیٹی، غریب کا بیٹا پڑھائی کرکے گاؤں کا نظام بدلتا ہے۔ وغیرہ۔ یہاں فلمی انداز اپنایا گیا۔ البتہ اس ڈرامے میں نیا پن یہ ہے کہ اب کشمیری سماج کی عورت دبی ہوئی نہیں، بلکہ وہ ظلم کے سامنے چیلنج بھی کرسکتی ہے۔

عارض ارشاد نے اپنے ریڈیائی ڈرامے 'آخری ثبوت' میں سائبر کرائم کے مسئلے کو اُجاگر کیا ہے۔ جو کہ آج پورے عالم کا ایک خطرناک مسئلہ ہے۔

ریاست جموں وکشمیر میں اور بھی ایسے بہت سارے قلم کار ہیں، جو یا تو فکشن کے میدان میں طبع آزمائی کرتے ہیں یا اکثر وہ لوگ مقامی زبانوں میں ڈرامے لکھتے ہیں۔ مگر اپنے مُنہ کا مزہ بدلنے کے لیے کبھی کبھار وہ اردو ڈراما بھی لکھتے ہیں۔ ان میں فی الحال مشتاق مہدی (خواب، کالے نگر) ریاض معصوم قریشی (وہ اجنبی اور کتا)، زاہد مختار (خوشبو)، نذیر جہانگیر (بہتے جسم)، غلام نبی شاہد (پچاس ہزار، خواب سراب)، مجید ارجمند (دو بہوئیں)، پرویز ملک (اونچے دروازے، وہ دروازہ کھل جائے گا) وغیرہ کا نام یہاں لیا جاسکتا ہے۔

خیر یہاں ہم نے ہم عصر کچھ ڈراما رائٹروں کا نام لیا ہے۔ مگر ڈراما ایک ایسا فن ہے، جو ایک Team work چاہتا ہے اور پھر اس کو ناظرین کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ یعنی ڈراما اور تھیٹر کا وہی رشتہ ہے، جو خون اور جسم کا ہے۔ ڈراما ایک تھیٹر گروپ یا ادارے کی کوششوں سے ہی منظر عام پر لایا جاتا ہے۔ تو اس ضمن میں یہاں ریاست کے کچھ اداروں اور گروپوں کا ذکر کرنا بھی ہمارے لیے لازمی ہے۔

ریاست جموں وکشمیر میں اُردو ڈراموں کو فروغ دینے کے سلسلے میں ریڈیو کشمیر سرینگر اور جموں کا بھی ہمیشہ خاص رول رہا ہے۔ دسمبر 1947 میں اس کی نشریات کا آغاز اس وقت اُردو کے مایہ ناز ادیب راجندر سنگھ بیدی کے ہاتھوں ہوا۔ اس کے بعد دو الگ الگ اسٹیشن قائم ہونے سے ایک سے بڑھ کر ایک ادیب ان اداروں کے ساتھ کسی نہ کسی صورت میں جڑ گئے۔ ان میں بیرون ریاست کے کچھ اردو ادیب بھی شامل تھے۔

مقامی ڈراما نگاروں میں وید راہی، پشکر ناتھ، قیصر قلندر، علی محمد لون، بنسی نردوش، موہن یاور، ٹھاکر پونچھی،

ابرول، مہیش شرما، جتیندر شرما، سومناتھ زتشی، شبنم قیوم، ستار احمد شاہد، حامدی کاشمیری، بشیر شاہ، وجے سوری، تجود سیلانی، شوکت شہری، ہری کرشن کول، موہن لال کول، ہردے کول بھارتی، فاروق مسعودی، فاروق نازکی، اشوک جیل خانی، مکھن لال صراف، عرش صہبائی، پیارے لعل رازدان، بی پی شرما، اشرف ساحل، حسن ساہو، عمر مجید، مسرور حسین، اشوک کاک وغیرہ کے ڈرامے وقتاً فوقتاً نشر ہوتے رہے۔ یہی لوگ دور درشن کیندر سرینگر اور جموں سے بھی وابستہ رہے۔ سرینگر دور درشن کیندر سے اُردو ڈراما ٹیلی کاسٹ کرنے کی شروعات ظفر احمد نے کی۔ یہاں دُوردرشن سے ہم لوگ، الف لیلیٰ، رامائن مہابھارت، جنون، فرماں جیسے بڑے اور یادگار سیریل بھی دکھائے گئے۔ اسی طرح کئی دستاویزی فلمیں بھی دکھائی گئیں۔

جے اینڈ کے اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز 1958 سے ریاست کے تینوں خطوں کی ثقافت کے فروغ کے لیے کام کر رہی ہے۔ اس میں حسب مقدور ڈراما کے حوالے سے بھی کام ہوا۔ 1963 سے ہر سال ٹیگور ہال سرینگر اور ابھینو تھیٹر جموں میں ڈراما فسٹول منعقد کیے جاتے ہیں، اس میں مختلف تھیٹر گروپس اُردو میں بھی ڈرامے کھیلتے ہیں۔ اس کے علاوہ تھیٹر ورک شاپس بھی کیے گئے۔ ان کے رسالے 'شیرازہ' اور ادبی مجلے 'ہمارا ادب' میں مختلف ڈرامے شائع کیے گئے۔

ہر سال مارچ کے مہینے میں عالمی تھیٹر ڈے کے موقع پر خصوصی طور پر ڈرامے دکھائے جاتے ہیں۔ ہمارا ادب کے ہم عصر تھیٹر نمبر 11-2010 (صفحات 356) ہم عصر ڈراما نمبر 17-2016 (صفحات 474) پورے اردو ادب میں تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔

تھیٹر سرگرمیوں میں اگرچہ ہم دلی، ممبئی اور کلکتہ کے برابر تو نہیں، مگر اتنے پچھڑے بھی نہیں کہ یہاں کوئی نام لینے کے لائق نہیں ہے۔ بے شک ہم نے کوئی ابراہیم القاضی، حبیب تنویر، موہن راکیش، بادل سرکار، اُت پل دت پیدا نہیں کیا۔ مگر آغا حشر کاشمیری اصل میں کشمیری نسل سے ہی تعلق رکھتے تھے۔ برصغیر میں عالمی ڈراما کی پہلی تاریخ ہم نے ہی لکھی۔ ہمارے پاس کوئی براڈوے تھیٹر یا پرتھوی تھیٹر نہیں ہے، مگر شام اودھ میں نوابوں اور مہاراجوں کی لافنگ تھرپی ہمارے ہی مسخرے کرتے تھے۔ ہمارے پاس تھیٹر کے حوالے سے جو کچھ بھی ہے اُس پر ہمیں فخر کرنا چاہیے اور اس وراثت کو بچانا، اس روایت کو آگے لے جانا ہمارا فرض ہے۔

بھوانی بشیر یاسر نے اپنے مضمون 'کشمیر میں تھیٹر سرگرمیاں۔ ایک جائزہ' (مشمولہ ہم عصر تھیٹر نمبر ہمارا ادب) میں کشمیر کے مختلف تھیٹر گروپوں کی نشاندہی ہے۔ جنھیں یہاں دہرایا نہیں جاسکتا ہے۔ البتہ اتنا تو کہا جاسکتا ہے کہ ان تھیٹر گروپوں میں بہت سارے گروپس کبھی کبھار اردو ڈرامے بھی ریاست میں یا ریاست سے باہر کھیلتے رہتے ہیں۔

جموں و کشمیر کے جو ڈراما شٹ ریاست اور ریاست کے باہر اپنے ڈرامے دکھاتے ہیں، ان میں بھوانی بشیر یاسر (ایکتا) ایک ایسا فنکار ہے جس نے موتی لال کیمو کے ساتھ مل کر کشمیری بانڈھ پاتھر کو اُردو یا ہندوستانی کا جامہ پہنا کر ملک کے کونے کونے تک پہنچادیا۔

مشتاق کاک (امیچور تھیٹر گروپ) بھی قومی اور بین الاقوامی سطح پر اس ریاست کی ترجمانی کرتے ہیں اور ان کی بیٹی افراح کاک بھی شانہ بہ شانہ قدم ملا کر اپنے والد صاحب کا مشن آگے لے جاتی ہے۔

اسی طرح انڈین تھیٹر ایلائنس کے بینر تلے مشتاق علی احمد خان نے بھی چند یادگار اردو ڈرامے کھیلے۔ ان کے ڈرامے 'ایک پوٹلی ارمانوں کی' کی پیش کش یادگار مانی جاتی ہے۔ نٹ رنگ بلونت ٹھاکر اور بوپندر سنگھ اگر اپنے ڈوگری ڈراموں کے ساتھ ساتھ اُردو میں بھی ڈرامے کرتے، تو اُردو ڈرامے کو ایک اور سمت مل جاتی، حالانکہ بلونت ٹھاکر نے اُردو میں بھی کچھ ایڈاپٹیشنز کیے خاص کر مولیئر کے۔

موجودہ دور میں ریاست جموں و کشمیر نے بالی ووڈ کو بھی مکیش رشی (کٹھوعہ، 1956) ماسٹر ابرار (فلم فتور) مسرور (بجرنگی بھائی جان، پھینٹم) اور زائرہ وسیم خان (دنگل اور سکرٹ سپر اسٹار) حنا خان (ماڈل) جیسے اداکار دیے۔ اتنا ہی نہیں فلم چنائی ایکسپریس کی شوٹنگ کے دوران سپر اسٹار شاہ رُخ خان نے خود اس بات کا اعتراف کیا کہ پہلگام کے بچوں نے ممبئی کے بچوں سے اچھی Acting کی ہے۔ یا فلم حیدر میں وشال بھردواج کو کشمیری تھیٹر والوں نے خوب مدد کی۔

ریاست میں ڈراما خاص کر اُردو تھیٹر کے درپیش دو بہت بڑے مسائل ہیں۔

1۔ زندگی کے مختلف شعبوں کی طرح اس میں بھی Economy کو مدِ نظر رکھا جاتا ہے۔ یعنی میں کیسے ڈراما لکھوں گا۔ اس پر کتنا خرچہ آئے گا اور واپس مجھے کیا ملے گا۔ یہ سوچ ہمارے رائٹر، پروڈیوسر، ڈائریکٹر، ایکٹر، تکنیشن اور متعلقہ ایجنسی (سرکاری یا غیر سرکاری) کی ہوتی ہے۔ ان حالات میں اچھی کوالٹی کیسے سامنے آئے گی۔

2۔ جموں اور لداخ کو چھوڑ کر آج کل کشمیر میں ڈراما اور تھیٹر نہ پنپنے کی وجہ یہ بھی ہے کہ ہم نے تھیٹر کے مقاصد ابھی تک نہیں سمجھے ہیں۔ جیسے ہمارے کتنے تعلیمی اداروں میں اساتذہ مختلف فنون لطیفہ میں طلبہ کی تربیت کر پاتے ہیں۔ کیا ہم منٹو کے افسانوں کا ڈرامائی روپ یہاں پیش کر سکتے ہیں، جبکہ جموں میں ایسا ہوتا ہے۔ کیا ہم اُوما جن جن والا الطاف کھیمپن کلکتہ (اظہر عالم) کا زبردست فنمنٹ ڈراما ''ریگتی پر چھائیں'' یہاں کے عوام کے سامنے پیش کر سکتے ہیں؟ دراصل ڈراما کو زندگی یا سماج کا عکس کہا جاتا ہے۔ اگر ہمارے سماج میں درندہ صفت لوگ رہتے ہیں، تو ہم انھیں اسٹیج پر لا کر کیوں کھڑا نہیں کر سکتے ہیں، تاکہ لوگ یا تو عبرت حاصل کریں گے یا شرمسار ہوں گے۔ اس لیے پہلی ضرورت اس بات کی ہے کہ تھیٹر کے مقاصد کو سمجھا جائے اور کھلے دل و دماغ سے تھیٹر کو دیکھا جائے۔

کشمیر میں تھیٹر کے حوالے سے کیا کچھ ہونا چاہیے:

ریاست سے باہر جانے کا ہمارے تھیٹر گروپوں کو موقع دیا جائے۔ بچوں کے لیے تھیٹر ورکشاپ اسکولوں اور کالجوں میں کیے جائیں۔ اور انھیں ڈاکٹری انجینئرنگ کے ساتھ ساتھ NSD جیسے اداروں میں داخلہ حاصل کرنے کی طرف بھی راغب کیا جائے۔ ریاست اور قومی سطح کے Talent Hunt Show منعقد کیے جائیں، تاکہ اچھی کوالٹی کو یہاں جگہ جگہ اُبھرنے کا موقع ملے۔ یہاں نکڑ تھیٹر کو فروغ دیا جائے۔

آج کل مابعد جدید دور میں یہاں تھیٹر کے نئے نئے تجربات کیے جائیں۔ جیسے 'دس منٹ کا تھیٹر' یعنی یکبابی ڈراما یا کسی افسانے، کہانی کا ڈرامائی روپ۔ کہانی منچن Story Theatre، داستان گوئی کی واپسی نئے نئے مسائل یا موضوعات کو سامنے لایا جائے۔ مثلاً۔ مختلف بیماریاں، حاشیائی طبقوں کے مسائل، سیاست، مذہبی استحصال، اجارہ داری، فلمی زم، بیٹی بچاؤ۔ ماحولیات، تعلیم، ٹکنالوجی، انسانی حقوق، نشہ سرحدوں کی جنگ، ہندو پاک کے مسئلے۔ گروہی فسادات وغیرہ وغیرہ۔

گاؤں کے نمبردار، ٹھاکر، ساس بہو کا جھگڑا، گاؤں کا ماسٹر، بے جوڑ شادی اور فیملی پلاننگ کا مسئلہ اب ہمارے تھیٹر میں بہت ہوا ہے۔ اس سے آگے بھی کچھ سوچیے ریاست کی کسی بھی یونیورسٹی میں ڈراما کے لیے کوئی بھی کورس یا ڈپلوما نہیں کروایا جاتا ہے۔ آج کے مقابلہ جاتی دور میں ایک ایکٹر کے لیے ڈراما کی تھیوری (بھرت منی نایہ شاستر، نکول، اسلم قریشی، محمد سبحان بھگت) کے ساتھ ساتھ زبان و بیان پر عبور ضروری ہے۔ غرضیکہ ان تمام باتوں کی طرف پوری توجہ دی جائے، تو ہمارا تھیٹر بھی سر اٹھا کر چلے گا۔

■

Dr. Mohiudin Zore Kashmiri
Sr. Asstt. Prof. Urdu,
Govt. Degree College Magam Kashmir--193401
Mob: 9697393552
Email: drzoreurdu@gamil.com

ریاض احمد

افسر میرٹھی کی ادبی بصیرت اور قومی نصاب تعلیم

سرزمین میرٹھ کو کئی اعتبار سے اور کئی معاملوں میں سبقت حاصل ہے خواہ وہ جدو جہد آزادی کے آغاز کا دور ہو، علمائے دین کی تصنیفات کا ذکر ہو یا پھر شعرا وادبا کی فہرست، سب میں میرٹھ سرفہرست ہے۔ اس وقت ان ادبا و شعرا کا ذکر خیر موضوع بحث ہے جنھوں نے گنگا جمنی تہذیب اور مشترکہ کلچر کی علمبردار زبان (اردو زبان) کے فروغ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

اردو زبان وادب کی عمومی خدمت کے ساتھ ساتھ خصوصی طور پر تعلیمی نصابات اور ادب اطفال کی طرف پوری توجہ دی۔ ان اکابرینِ زبان اور اساتذہ میں مولوی اسمٰعیل میرٹھی اور حامد اللہ افسر کا نام بطور خاص لیا جانا چاہیے۔ مولوی اسمٰعیل میرٹھی (جو صرف سولہ سال کی عمر میں محکمہ تعلیم میں ملازم ہوئے) کا سب سے بڑا کارنامہ 'اردو ریڈرس' کی تیاری ہے۔ یہ پہلی سے پانچویں تک کی کتابیں بچوں کی نفسیات اور ذہنی وجسمانی نشو ونما (Mental & Physical Development) کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئیں۔ واضح رہے کہ درسیات یا نصابات کے تحت اس وقت تک اردو میں کتابیں تیار کرنے کا رواج نہیں تھا۔ اردو میں اس کے آغاز کا سہرا مولوی اسمٰعیل میرٹھی کے سر ہی بندھتا ہے ان کی درسی کتابوں میں نظمیں اور مضامین اتنے دلچسپ ہیں کہ اکثر ان کتابوں سے بچپن میں استفادہ کرنے والوں کو وہ نظمیں اور کہانیاں تا عمر یاد ہیں۔ واضح رہے کہ ان میں سے کئی نظمیں تو معروف انگریزی نظموں کا منظوم ترجمہ ہیں۔ دوسرا اہم نام حامد اللہ افسر میرٹھی کا ہے۔

افسر میرٹھی کا اصل نام حامد اللہ تھا جو میرٹھ میں محلّہ مفتی صاحبان میں 29/ نومبر 1895 کو پیدا ہوئے۔ عہدِ مغلیہ میں اُن کے بزرگوں کو میرٹھ میں معافی کے چند گاؤں عطا کیے گئے تھے۔ ان کا خاندان مفتیوں کا معروف خاندان تھا۔ مفتی محمد عصمت اللہ جو خاندانی روایات اور انوار علم وفضل سے آراستہ تھے وہی حامد اللہ کے والد ماجد تھے۔ مفتی محمد عصمت اللہ مقامی سرکاری اسکول میں اردو اور فارسی کے مدرس تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے بیٹے افسر کو خود ہی فارسی اور اردو کی تعلیم دی۔ مفتی عصمت اللہ صاحب نے اپنے فرزند کی تعلیم وتربیت بچوں کی نفسیات کے عین مطابق کیا۔ ان کے پڑھانے اور اصلاح کرنے کا طریقہ نہایت اعلیٰ قسم کا اور منفرد تھا۔ مفتی صاحب بیٹے کو عربی کا عالم بنانا چاہتے تھے لہٰذا مدرسہ عالیہ میرٹھ میں داخل کرایا۔ سالانہ امتحان میں طے شدہ نمبرات یعنی Maximum.Marks سے 5/ نمبرات زیادہ حاصل کرنے کی پاداش میں بچے کو مدرسہ سے واپس بلایا اور تعلیم کے لیے 'دار العلوم دیوبند' بھیج دیا۔ افسر وہاں بیمار پڑ گئے میرٹھ واپس بلائے گئے اور پھر کسی مدرسہ میں نہ جاسکے۔ مفتی صاحب نے فارسی کا نصاب انھیں کچھ اس طرح سے پڑھایا تھا کہ بچپن میں ہی وہ فارسی میں شاعری کرنے لگے تھے۔ عربی کا عالم بنانے کی چاہت مفتی صاحب کو اب بھی تھی چنانچہ انھوں نے افسر کو 'الازہر' (مصر) بھیجنے کا ارادہ کیا۔ بدقسمتی کہیے یا خوش قسمتی پاسپورٹ بننے میں رخنہ پڑا اور وہ مصر نہ جاسکے۔

حامد اللہ افسر کا جدید علوم یعنی انگریزی اسکول میں داخلہ ایک ڈرامائی انداز سے ہوا۔ 1913 میں گورنمنٹ ہائی اسکول میرٹھ میں داخل ہوئے۔ نویں درجہ کے جدید مضامین میں حامد اللہ کو بہت مشقت کرنی پڑی لیکن انھوں نے ان تعلیمی مشکلوں پر قابو پالیا۔ حامد اللہ نے اسی ہائی اسکول سے ثانوی اور اعلیٰ ثانوی تعلیم کے منازل طے کیے۔ 1920 میں انھوں نے میرٹھ کالج سے بی۔ اے پاس کیا مزید اعلیٰ تعلیم کی غرض سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا رخ کیا۔ بیک وقت ایم۔ اے اور ایل۔ ایل۔ بی میں داخلہ لیا۔ لیکن نہ تو پوسٹ گریجویشن کی تعلیم مکمل کر پائے اور نہ وکالت کی۔ علی گڑھ کا قیام حامد اللہ کے علمی کیریئر کے لیے سنگ میل ثابت ہوا۔ حامد اللہ نے ہاسٹل میں رہنے کے بجائے شہر میں قیام کیا جہاں شعرا، علما اور ادبا کا تانتا بندھا رہتا، ان کا کمرہ علمی حلقے کی آماجگاہ بنا رہتا، متعدد بار جگر اور فانی جیسی شخصیات بھی ان سے ملنے آئیں۔ حامد اللہ افسر نے ایک رسالہ 'نو بہار' کے نام سے جاری کیا جو علمی وادبی حلقے میں کافی مقبول ہوا۔ بیماری کی وجہ سے علی گڑھ سے میرٹھ واپس آئے۔ ایک مقامی اخبار 'الخلیل' کی ادارت کی۔ والد کی سفارشی محنت کی وجہ سے حامد اللہ نائب تحصیلدار نامزد کیے گئے تھے۔ لیکن حامد اللہ نے تعلیم کو سرکاری ملازمت پر ترجیح دی۔ چالیس روپے مشاہرہ پر انگریز افسر نکسن کو اردو فارسی پڑھایا پھر ان سے انگریزی پڑھنے کی وجہ سے دونوں کا علمی تبادلہ ہوا۔ حامد نے نکسن کو فارسی زبان وادب میں اس قدر ماہر کیا کہ ہندوستان سے واپس جانے پر نکسن لیڈس یونیورسٹی میں فارسی کے استاد مقرر ہوئے، یہی نہیں انھوں نے حامد اللہ افسر کی کئی نظموں کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا۔

متعدد بار والد اور کئی بہی خواہوں نے ان کی سرکاری ملازمت کے لیے کامیاب کوششیں کیں، لیکن حامد اللہ کی ایک ہی ضد تھی کہ وہ یا تو نشر واشاعت کا کام کریں گے یا پھر درس وتدریس کا۔ چنانچہ اللہ نے ان کی یہ خواہش پوری کی 'گورنمنٹ جبلی کالج'، لکھنؤ میں دسمبر 1927 میں بحیثیت اردو استاد مقرر ہوگئے اور 1950 میں وائس پرنسپل کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے۔ انھوں نے درس وتدریس کے فرائض کو اس ایمانداری سے انجام دیا کہ نور الحسن ہاشمی، عبادت بریلوی، حیات اللہ انصاری، علی جواد زیدی اور ولی الحق انصاری جیسے نامور ادبا و شعراء پیدا کیے۔ انھی میں سے ایک شاگرد ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی نے افسر صاحب کی شخصیت اور فن سے متعلق ایک کتاب 'بچوں کے افسر' کے تصنیف کی۔ ایک خوشگوار واقعہ کے تحت حامد اللہ افسر صاحب کی ملاقات رابندر ناتھ ٹیگور سے بھی ہوئی۔ دراصل افسر نے قیام علی گڑھ کے دوران اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے ٹیگور کی معروف نظم 'کریسینٹ مون' (Crescent Moon) کا 'ماہِ نو' کے نام سے اردو میں ترجمہ کیا۔ چونکہ انگریزی میں اس کی کاپی رائٹ میک ملن اینڈ کمپنی کے نام محفوظ تھی۔ چنانچہ کمپنی نے افسر کے نام قانونی نوٹس بھیج دیا۔ حامد اللہ افسر نے پریشانی کے عالم میں رابندر ناتھ ٹیگور سے ملنے کا فیصلہ کیا اور یوں نوبل انعام یافتہ شخصیت ٹیگور نے اپنی دانشمندانہ حکمت عملی سے افسر کا مسئلہ حل بھی کیا اور فائدہ بھی پہنچایا کہ انھوں نے افسر کو کہا کہ نوٹس کے جواب میں تم انھیں لکھ دو کہ میں نے ہندی ترجمہ 'شیشو' سے اردو ترجمہ کیا ہے۔ اور یوں عالمی شہرت یافتہ شخصیت سے افسر صاحب کا عمر بھر کا رشتہ استوار ہوگیا۔

ہمارے ملک کی بدقسمتی ہے کہ یہاں دانشوروں، فن کاروں، ادیبوں اور شاعروں کے

آخری ایام اکثر و بیشتر بہت ہی عسرت اور کسمپرسی میں گذرتے ہیں۔ حامد اللہ افسر میرٹھی بھی انھیں میں سے ایک تھے۔ انھوں نے بھی مناسب اسباب معیشت نہ ہونے کی وجہ سے اپنے آخری ایام بہت ہی مشکل سے گزارے۔ انھیں تپ دق لاحق ہوگیا۔ لکھنؤ میڈیکل کالج کے ٹی۔ بی T.B وارڈ میں داخل کرائے گئے، لیکن مرض معالجے کی حد سے آگے نکل گیا اور مریض اس دار فانی سے دور چلا گیا۔ 19 / اپریل 1974 کو بہ وقت سہ پہر افسر میرٹھی کا انتقال ہوگیا اور اگلے دن قدیم اطبا کے خاندانی قبرستان لکھنؤ میں مدفون ہوئے۔

حامد اللہ افسر نے اردو زبان و ادب کی ہر نقطۂ نظر سے آبیاری کی، تنقیدی نقطۂ نظر سے ان کی تین کتابیں بہت معروف ہیں جن میں اردو زبان کے شعر و ادب کا مختلف پہلوؤں سے جائزہ لیا گیا ہے اور اردو زبان و ادب کو مغربی اور مشرقی دونوں طرز فکر سے پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تنقید پر ان کی پہلی کتاب 'نقد الادب' کے نام سے 1936 میں نول کشور پریس لکھنؤ نے شائع کی، دوسری کتاب 'نورس' کے نام سے 1936 میں ہی بھارگو اسکول بک ڈپو لکھنؤ نے شائع کی۔ افسر صاحب کی تنقیدی بصیرت کا پوری طرح احاطہ ان کی تیسری تنقیدی تصنیف 'تنقیدی اصول و نظریے' کرتی ہے جس میں انھوں نے تنقید کے تمام تاریخی اور تدریجی پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہوئے اس کے اصول و نظریات پر کھل کر بحث کی ہے۔ بارہ ابواب میں منقسم یہ کتاب ادب اور فنون لطیفہ، تنقید یونان قدیم میں، تنقید ہند قدیم میں، تنقید زمانہ مابعد میں، شاعری، بت تراشی اور مصوری، جمالیات اور فنون لطیفہ، اصول تنقید کی تشکیل، تنقید کا مقصد اور عمل، ادب کا مطالعہ، اردو کے چند اصناف سخن پر ایک نظر اور نیا ادب جیسے عنوانات کے تحت کھل کر بحث کی گئی ہے۔ یہ کتاب 1964 میں کوہ نور پبلشر لاہور نے شائع کیا۔ (اس کے علاوہ ایک اور تنقیدی کتاب 'کتابوں کی جنگ' کے نام سے بھارگو اسکول بک ڈپو لکھنؤ نے شائع کی تھی۔)

حامد اللہ افسر صاحب نے اردو زبان و ادب کی تقریباً ہر صنف میں کامیاب طبع آزمائی کی لیکن وہ بچوں کے ادب کے لیے زیادہ جانے جاتے ہیں۔ ان کی کہانیوں کے کئی مجموعے شائع ہوئے مثلاً 'ڈالی کا جوگ' 1927 میں انڈین پریس الہ باد نے شائع کیا، 'آنکھ کا نور' افسانوی مجموعہ 1931 میں ہندوستانی پبلشنگ ہاؤس میرٹھ سے شائع ہوا 'پرچھائیاں' ان کا آخری افسانوی مجموعہ ہے۔ حامد اللہ صاحب کے ڈراموں کا مجموعہ 'ہفت منظر' کے نام سے نول کشور پریس لکھنؤ نے 1931 میں شائع کیا۔ افسر صاحب کے کئی شعری مجموعے بھی یکے بعد دیگرے شائع ہوتے رہے۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ 'پیام روح' کے نام سے 1927 میں انڈین پریس لمیٹیڈ الہ باد نے شائع کیا جب کہ دوسرا شعری مجموعہ 'جوئے رواں' کے نام سے انوار بک ڈپو لکھنؤ سے 1954 میں شائع ہوا۔

حامد اللہ افسر نے بچوں کے لیے اور ان کی درسیات کے لیے نظمیں اور کہانیاں اور معلوماتی مضامین بہت ہی دلچسپ انداز میں تحریر کیے ہیں۔ جن کی ایک لمبی فہرست ہے یہاں ان چند کتابوں کا خصوصی ذکر ہے جنھیں انھوں نے خاص طور سے بچوں کی درسیات کے لیے لکھا ہے مثلاً 'آسمان کا ہمسایہ' 1953، 'مکانوں کی کہانی' 1955، 'گاندھی جی کے ساتھ' 1960، 'حکایات گاندھی' 1960، 'جانوروں کی عقل مندی' 1961، '15 / اگست'، 'لوہے کی چیل'، 'ترقی کی راہیں'، 'چار چاند' یہ بھی تصانیف بچوں کی معلومات میں اضافہ کرنے اور ان کی دلچسپی تعلیم میں قائم رکھنے کے لیے تھیں۔ اس کے علاوہ 'ہمارا جھنڈا'، 'فرقہ وارانہ یکجہتی کا حصول کیسے ہو؟' اور 'ہندی اردو کے مسائل کا حل' ایسی تصانیف ہیں جو ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کے استحکام کے لیے رہنمائی کا کام کرتی ہیں۔ واضح رہے کہ مذکورہ تصانیف میں کئی ایسی ہیں جن کا سنہ اشاعت اور ناشر معلوم نہیں۔ حامد اللہ افسر صاحب نے مکتبہ جامعہ کے لیے 'ادب سیریز' کے نام سے بچوں کی دلچسپی کو سامنے رکھ کر جاپانی، روسی، جرمنی، چینی اور فرانسیسی کہانیاں لکھیں، لیکن ان کی وفات سے پہلے یہ شائع نہ ہوسکیں۔

افسر میرٹھی نے بنیادی طور پر نئی نسل خصوصاً بچوں کی درسیات کے لیے ان کی نفسیات اور دلچسپیوں کے پیش نظر کتابوں اور مضامین کی تصنیف و تالیف کی۔ 'آسمان کا ہمسایہ'، 'ایوریسٹ کی کہانی'، 'ترقی کی راہیں'، 'عملی نفسیات (بچوں کے لیے)'، 'جانوروں کی عقل مندی'، 'گلیور کا سفر نامہ' اور 'مکانوں کی کہانی' جیسی تصانیف میں بچوں کی نصابی ضرورتوں کو ملحوظ رکھا ہے تاکہ ان کی درسی ضروریات پوری ہوسکیں اور دلچسپیاں بھی برقرار ہیں۔ افسر صاحب کی تصنیف کی ہوئی متعدد نصابی کتابیں برسوں تک اتر پردیش کے اسکولوں اور مدرسوں میں پڑھائی جاتی رہیں۔ انھوں نے ایک مسدس 'رزم آخر' اور مثنوی 'آدم نامہ' کے علاوہ 'ذوق ادب کی تربیت' بھی لکھی تھی۔ 1967 میں انھوں نے اپنی خود نوشت سوانح عمری لکھنا شروع کی تھی لیکن اس کی تکمیل نہ ہوسکی۔

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ نے 'مشاہیر ادب اردو' کے نام سے تحقیقی کتابیں شائع کی ہیں۔ اصل میں یہ کتابیں رسالہ 'زمانہ' میں 1903 سے 1949 تک شائع ہونے والے تحقیقی، علمی اور ادبی مضامین کے انتخاب پر مشتمل ہیں۔ حامد اللہ افسر صاحب کے تین مضامین میں جو تحقیقی اور ادبی لحاظ سے بہت ہی اہمیت کی حامل ہیں 'ادب الکاتب'، 'مشاعروں کی اصلاح' اور 'مختارات' ان کے فکری اور تحقیقی استدلال کی نشاندہی کرتے ہیں۔ 'ادب الکاتب' رسالہ 'زمانہ' جنوری 1926 کے شمارہ میں مولانا طباطبائی کے ایک مضمون کا جواب ہے۔ مولانا طباطبائی نے کالجوں کے تعلیم یافتہ حضرات کی اردو دانی پر لعن و طعن کیا ہے، انھوں نے کچھ الفاظ، محاورات اور فقروں پر سوالات کھڑے کیے ہیں۔ افسر صاحب نے ان کے لسانی اور ادبی حقائق بتائے اور عوامی استعمال کی دلیلیں پیش کی ہیں۔ مختلف الفاظ کے استعمال سے بحث کرتے ہوئے حامد اللہ صاحب نے لکھا ہے:

''مادری زبان پر بھی مولانا کو اعتراض ہے۔ فرماتے ہیں 'مدرننگ' میں لفظ 'مدر' اور ہی معنی رکھتا ہے اور یہ نہیں بتاتے کہ کیا معنی رکھتا ہے۔ مولانا محترم! مادری زبان کا اردو بالکل وہی مفہوم ہے جو انگریزی میں 'مدرٹنگ' کا ہے۔ خدا جانے آپ کو اس ترکیب سے متعلق کیا غلط فہمی پیدا ہوگئی؟ مادری زبان پر آپ کو ایک اعتراض یہ ہے، آخر باپ دادا کی، تمام بزرگوں کی، تمام خاندان کی وہی زبان ہے پھر مادری کہنا کیا معنی؟ یہ اعتراض تو 'مدرٹنگ' پر بھی ہوسکتا ہے اور اس کا جواب بھی آسانی سے دیا جا سکتا ہے، یعنی وہ زبان جو ماں کے ورثے میں ملی ہو یا جو ماں کی زبان ہو، مادری زبان ہے۔''

(مشاہیر ادب اردو، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ، صفحہ نمبر 84)

آزادی سے قبل اسکولی سطح پر باضابطہ نصاب کا خاکہ کم ہی نظر آتا ہے۔ انگریزی عہد کی بعض ریاستی حکومتوں نے اس ضمن میں کچھ کام ضرور کیے لیکن وہ اکثر و بیشتر انگریزی زبان یا دوسری ہندوستانی علاقائی زبانوں مثلاً بنگلہ، تامل اور تیلگو وغیرہ میں تھیں۔ ممبئی اور پنجاب کی ریاستوں نے کچھ ماہرین کی مدد سے اردو کی نصابی کتابوں پر کام کیا۔ بالخصوص صوبہ پنجاب لاہور میں کرنل ہال رائڈ کی رہنمائی میں مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا الطاف حسین حالی کے ذریعہ ترتیب دی گئی نصابی کتابوں کو اہمیت حاصل ہے۔ شخصی طور پر مولوی اسمٰعیل میرٹھی نے نصابی کتابیں ترتیب دیں۔ اور چند شعراء و ادباء نے بچوں کی نفسیات ان کی عمر، ذہنی پختگی ان کی دلچسپیاں اور سماجی ہم آہنگی کو سامنے رکھ کر نظمیں کہانیاں اور مضامین لکھے۔ ان شخصیات میں حامد اللہ افسر میرٹھی نے بہت اہم رول ادا کیا۔ انھوں نے ایسی موضوعاتی نظمیں لکھیں جن کا تعلق بچوں کی ذہنی ہم آہنگی، اخلاقیات اور معاشرتی اقدار پر مبنی ہیں۔ یہی نہیں افسر نے نصابی ضرورتوں کے پیش نظر بہت سی کہانیاں، مضامین اور تمثیلیں لکھیں جو تعلیمی و تدریسی مقاصد کی تکمیل کرتی ہیں۔

افسر میرٹھی کی متعدد ایسی نظمیں اور مضامین ہیں جو آزادی سے قبل بھی درسیات

میں شامل تھیں اور آزادی کے بعد بھی موجودہ درسی کتابوں میں شامل ہیں۔ این سی ای آر ٹی، نئی دہلی اور ریاستی نصابی بورڈوں نے بھی ان مضامین اور نظموں کو اپنی درسی کتابوں میں بار بار شامل کیا ہے۔ ان کی ایک نظم کئی ریاستوں میں 'خواہشیں' کے نام سے اور کئی ریاستوں کی درسی کتابوں میں 'خضر کا کام کروں' کے نام سے اب بھی شامل ہے۔ یہ نظم بھلائی تیمارداری، اخوت و ہمدردی اور نیکی جیسے اقدار کے فروغ کے لیے واقعی نمونہ ہے۔ (راقم نے بھی یہ نظم اپنی اسکولی تعلیم کے دوران چوتھی جماعت میں پڑھی تھی) اس کے چند بند ملاحظہ کریں۔

درد جس دل میں ہو اس دل کی دوا بن جاؤں
کوئی بیمار اگر ہو تو شفا بن جاؤں
دکھ میں جلتے ہوئے لب کی میں دعا بن جاؤں

اُف وہ آنکھیں جو ہیں بینائی سے محروم کہیں
روشنی جن میں نہیں نور جن آنکھوں میں نہیں
میں اُن آنکھوں کے لیے نور و ضیا بن جاؤں

دور منزل سے اگر راہ میں تھک جائے کوئی
جب مسافر کہیں رستے سے بھٹک جائے کوئی
خضر کا کام کروں راہ نما بن جاؤں

عمر کے بوجھ سے جو لوگ دبے جاتے ہیں
ناتوانی سے جو ہر روز جھکے جاتے ہیں
اُن ضعیفوں کے سہارے کو عصا بن جاؤں

خدمت خلق کا ہر سمت میں چرچا کردوں
مادر ہند کو جنت کا نمونہ کردوں
گھر کرے دل میں جو افسر وہ صدا بن جاؤں

دور حاضر میں سماجی اور اخلاقی ضرورتوں کے تحت انسانی اقدار اور تعمیری قدروں پر مبنی کہانیاں، نظمیں، ڈرامے، مضامین اور تمثیلیں شامل نصاب کی جارہی ہیں۔ تعلیمی نصاب کو [Constructive Approach] یعنی تعمیری طرز رسائی کے ذریعے طلبا کے ذہن میں فکری اور تخلیقی صلاحیتوں کو ابھارنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اس بات کا بھی نصابی کتابوں میں خیال رکھا جاتا ہے کہ ہندوستان کی لسانی تکثیریت اور تہذیبی اقدار کا عکس ابھر کر سامنے آئے اور قومی سطح کے تاریخی، تہذیبی، ثقافتی ورثے اور ماحولیات کی حفاظت نیز ہمارے آئین کے مشترکہ مزاج اور جمہوری اقدار کی پاسداری ہو سکے۔ جو ہندوستان جیسے ملک کی دائمی ترقی (Sustainable Development) کے لیے نہایت ضروری ہے۔

آج سے ستر، اسی سال قبل اردو کے کئی شعراء اور ادباء نے دانستہ طور پر تعمیری طرز رسائی Constructive Approach اور مشترکہ اقدار کی پاسداری کے لیے اپنی تخلیقات پیش کیں ان شعرا و ادبا میں افسر میرٹھی کا نام سرفہرست ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں، مضامین اور کہانیوں کے ذریعے بچوں کے دلوں میں مذکورہ فکر کو ذہن نشین کرایا۔ اس ضمن میں افسر میرٹھی کی تمثیلی کہانی 'میں دولت مند ہوں' جو ریاست مہاراشٹر کی نصابی کتاب میں شامل ہے کی مثال پیش کی جاسکتی ہے۔

افسر میرٹھی کی بعض نظمیں موجودہ دور کے تعلیمی مسائل مثلاً بستے کے بوجھ اور ذہنی تناؤ کو دور کرنے کا کام بھی کرتی ہیں۔ یہی نہیں ماضی کی غلطیوں سے سبق حاصل کر کے مستقبل کو سنوارنے کی طرف بچوں کا ذہن مبذول کرتی ہیں۔ ایسی نظموں کو نصابی کتابوں میں شامل کر کے بچوں میں بے وجہ ذہنی تناؤ کو کم کرنے کے ساتھ ساتھ تخلیقی و تعمیری ذہانتوں کا فروغ کیا جاسکتا ہے۔

ذیل کے اشعار اس کی تصدیق کرتے ہیں۔

''جو سب سے بدتر تھے اس جہاں میں ہیں اُن کے وارث ہی سب سے بہتر
رکاوٹیں جس قدر رہوں پیدا اسی قدر کامیاب ہوں گے
یہ چھاؤں جس سے گزر رہے ہو ثبوت بین ہے دھوپ کا خود
شکست کا لطف پاچکے ہو تو ایک دن فتح یاب ہوگے''

یا یہ اشعار

''جو بے بسی میں گرے ہیں افسر وہی تو گہرائی سے ہیں واقف
جو دل سے نکلا ہے کوئی نالہ فلک پہ وہ با اثر رہا ہے
بلندیوں پر وہی چڑھے گا نشیب میں جو اتر سکے گا
جو چوٹیوں پر گیا ہے رستہ وہ گھاٹیوں سے گزر رہا ہے''۔

حب الوطنی ہمارے قومی نصاب کا اہم جز ہے خواہ وہ ابتدائی تعلیم کے منازل ہوں یا پھر ثانوی یا اعلا تعلیم کے درجات، ہر تعلیمی منزل پر اس کی اشد ضرورت ہے تاکہ طلبا جب بڑے ہو کر ذمہ دار شہری بنیں تو ملک و قوم کی ترقی میں مثبت کردار ادا کریں۔ اپنے بزرگوں اور اسلاف سے محبت کریں، وطن عزیز کی مٹی کی عظمت کو پہچانیں اور آنے والی نسلوں کے لیے نمونہ پیش کریں۔ افسر نے اپنی نظموں اور مضامین میں ان ساری خوبیوں کو پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ہمارے اسلاف، یہاں کی مٹی، اس کی آب و ہوا وطن عزیز کی امتیازی شان ہیں۔ مذکورہ امتیازات کی مثال کے لیے یہ چند اشعار پیش کیے جاسکتے ہیں

ہمیں دیں نعمتیں کیا کیا الہ العالمین تو نے — کہ رہنے کو عطا کی ہند کی پیاری زمیں تو نے
نہ کیوں ہو ناز خاک ہند پر ہم ہند والوں کو — کیا اکسیر اس مٹی کو رب العالمیں تو نے
کہاں یوں کھیلتی ہے چاندنی دریا کے دامن پر — کہ رونق چاند کو بخشی ہے دنیا میں کہیں تو نے
وطن ہے ہند کا لیداس کا اور میر و غالب کا — کیا افسر کو اب اس دور میں پیدا یہیں تو نے

بہرحال بچوں کے لیے لکھی گئیں نظمیں، مضامین، کہانیاں اور درسی کتابیں وغیرہ تو افسر میرٹھی کی ادبی بصیرت کا ایک حصہ محض ہیں۔ ان کا لسانی اور ادبی کینوس بہت وسیع ہے۔ اہل علم و دانش کی توجہ سے اسے مزید اجاگر کیا جاسکتا ہے۔

حوالے

اختر یزداں محسن، حامد اللہ افسر، حیات اور کارنامے، اردو سماج پبلی کیشنز، بوس روڈ لکھنؤ۔
حامد اللہ افسر، تنقیدی اصول اور نظریے، کراچی۔
ڈاکٹر ریاض احمد، اردو تدریس جدید طریقے اور تقاضے، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی۔
مالک رام، تذکرۂ معاصرین (حصہ سوم)، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی۔
مالک رام، تذکرۂ ماہ و سال، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی۔
مشاہیر ادب اردو، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ۔

■

Dr. Reyaz Ahmed
Associate Professor
College of teacher education,
Sambhal,Pin Code-244302-UP
E_mail-reyazahmed045@gmail.com
Mobile No.-9052112740

الطاف احمد

ہندوستانی مشترکہ تہذیب اور اردو سفرنامہ
(آزادی کے بعد)

تہذیب سے ہر وہ شے مراد ہے جس کے مختلف عناصر دورانِ حیات انسان اپنی ذات میں جذب کر لیتا ہے اور جس کا وہ خود ایک مجموعہ ہے۔ تہذیب کا ارتقا انسانی ارتقا کے مترادف ہے یہی وہ میزان ہے جس کی پرکھ سے انسان دیگر حیوانات سے جدا ہو جاتا ہے۔ اس کی موجودگی انسانی عظمت کی دلیل ہے اسی کی وجہ سے اسے مہذب کہا گیا اور اس کی غیر موجودگی انسان کو بہت حد تک حیوانات سے قریب کر لیتی ہے اور اسے غیر مہذب کہا جاتا ہے۔ تہذیب کا دائرہ اس قدر وسیع و عریض ہے کہ زندگی کا ہر پہلو اس میں سمٹ آتا ہے۔ اس کے عناصر کی کوئی حد نہیں اس لیے کہ یہ عناصر مادی اور غیر مادی دونوں علاقوں تک پھیلے ہوئے ہیں۔

ہندوستان کی تہذیب بہت قدیم ہے جس کی ابتداء کے بارے میں پورے وثوق کے ساتھ کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا ہے لیکن تاریخی شواہد کی روشنی میں دیکھا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان کی قدیم تہذیبی تاریخ کا آغاز آریاؤں کے ہندوستان میں داخلے سے شروع ہو جاتا ہے۔ آریا ہندوستان میں 1500 ق۔م میں داخل ہوئے تھے۔ پہلے پہلے وہ شمالی مغربی علاقوں تک محدود رہے لیکن آہستہ آہستہ وہ پورے شمال اور شمالی مشرق اور وسطی ہندوستان میں پھیل گئے۔ آریاؤں سے پہلے ان علاقوں میں دراوڑ آباد تھے وہ آریاؤں کے مقابلے کسی قدر مہذب تھے لیکن آریا ان سے زیادہ طاقتور تھے اس لیے انھوں نے دراوڑوں کو زیر کر کے شمالی ہندوستان سے جنوب کی طرف دھکیل دیا اور خود ان علاقوں میں آباد ہو گئے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب ہندوستانی تہذیب اپنی ابتدا کے انتہائی نازک مراحل سے گزر رہی تھی۔ آریا اپنے آپ کو یہاں کے مقامی لوگوں سے زیادہ شدھ (پاک) اور مہذب مانتے تھے اس لیے یہاں کے مقامی لوگوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اسی زمانے میں آریاؤں اور یہاں کے بعض لوگوں کے آپسی تال میل سے نئی زبان وجود میں آنے لگی اور آہستہ آہستہ یہ زبان کافی ترقی کر گئی۔ یہ زبان سنسکرت تھی اس زبان کے قدیم ترین نمونے ہمیں رگ وید میں ملتے ہیں جو لگ بھگ 1500 ق۔م کی تصنیف سمجھی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے وید بھی ہیں جس میں سنسکرت کا قدیم ادب موجود ہے۔ ہندوستان کا سارا ادب اسی زبان میں موجود ہے اس لیے اس زبان کو تقدس بھی حاصل ہے۔ آریا چوں کہ یہاں کے لوگوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اور خود کو اعلیٰ اور مہذب سمجھتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سماج ذات پات اور چھوت چھات کے نام پر تقسیم ہو گیا۔ چھوا چھوت کا مسئلہ اس قدر قوی اور پر اثر تھا کہ آج تک ہزاروں سال گزر جانے کے بعد بھی یہ اثر کسی طرح زائل نہیں ہوا۔ چھوا چھوت کا مسئلہ جب شدت اختیار کرنے لگا تو نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے خلاف رد عمل شروع ہو گیا۔ یہ ردِ عمل مذہبی نوعیت کا تھا اس لیے کافی پر زور رہا۔ مہا تما بدھ اور مہاویر جین اس ردِ عمل کو پیش کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ مہا تما بدھ کی تعلیم کا اثر اس قدر پر زور تھا کہ ایک وقت ایسا لگا کہ سارے کا سارا ہندوستان اس کی لپیٹ میں آ جائے گا لیکن اشوک کی وفات کے بعد اس کا اثر کم ہوتا گیا اور بدھ مت وہ سب کچھ نہ کر سکا جو یہ کر سکنے کا اہل تھا لیکن اتنا ضرور ہوا کہ اس نے قدیم ہندو اور آریائی تہذیب پر خراش ڈالی اور اس کی کسی حد تک اصلاح بھی کی۔ بدھ مت کے اثرات ہندوستانی تہذیب پر بہت گہرے ہیں یہ اثرات قدیم رسوم و روایات میں اس قدر مدغم ہو گئے کہ یہ ہندوستانی طرزِ حیات و اعتقادات کا جزو لازم بن گئے۔ اس کے بعد مسلمان ہندوستان میں داخل ہوئے اور یہاں کے اس وقت کے بادشاہوں کو ہرا کر خود حکمران بن جاتے ہیں۔ مسلمان بحیثیت حکمراں ہندوستان میں کم و بیش ایک ہزار سال تک حکومت کرتے رہے۔ مسلمانوں کے اعتقادات و طرزِ زندگی یہاں کے لوگوں سے بالکل مختلف تھے۔ مسلمان یہاں اپنے دینی اعتقادات، اپنی تہذیب و ثقافت اور اپنی زبانیں بھی ساتھ لائے تھے۔ مسلمانوں کے اس ایک ہزار سال کے عرصے میں جس میں انھوں نے یہاں حکمرانی کی یہاں کی قدیم روایات اور مسلمانوں کی مخصوص تہذیبی اقدار کے آپسی تال میل اور سنگم سے ایک نئی تہذیب نے جنم لیا جسے آج ہم مشترکہ تہذیب کا نام دیتے ہیں اور ہماری زبان اردو اس نئے سنگم اور نئی تہذیب کی نمائندہ ہے۔

ہماری موجودہ تہذیب بڑی حد تک پیچیدہ ہے۔ اس تہذیب کی بنیاد کسی ایک مذہب و قوم تک محدود نہیں بلکہ سلسلہ وار طور پر مختلف زمانوں میں مختلف طبقے کے لوگ یہاں آتے گئے اور یہاں کی مقامی تہذیب و تمدن کو متاثر کرتے رہے اور خود بھی یہاں کے تہذیبی اثرات قبول کرتے گئے۔ گوپی چند نارنگ اپنی کتاب میں اس

کے متعلق لکھتے ہیں:۔

''یہ حقیقت ہے کہ ہندوستانی مزاج نے ہندوستان میں آنے والی مختلف نسلوں، قوموں، فرقوں اور مذہبوں سے ہمیشہ رواداری سے کام لیا اور تاریخ کے خاموش عمل کے تحت ان سب کو ہندوستانی تہذیبی سانچے میں ایسا کھپایا کہ ان نوواردوں میں اور ہندوستان میں رہنے والوں میں کوئی بڑا فرق نہ رہا۔''

(اردو غزل اور ہندوستانی ذہن وتہذیب، گوپی چند نارنگ، ص29)

اس میں کوئی دورائے نہیں کہ آج ہندوستان میں جس تہذیب کا سکہ رائج ہے یہ مشترکہ تہذیب ہے جسے بنانے اور ارتقاء بخشنے میں باہر سے آنے والی ہر قوم نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ ہماری تہذیب کو تقدم حاصل ہے لیکن قدیم ہونے کے ساتھ ساتھ اس نے نئے دور کے نئے تقاضوں کو ہر زمانے میں اپنے اندر سمیٹا ہے اس طرح اس تہذیب کے اندر نئے دور کے گونا گوں اقدار داخل ہوتے گئے اور اسے خوبصورتی بخشتے گئے۔ کثرت میں وحدت ہی دراصل ہماری قومی تہذیب کی اصل شناخت ہے۔

اردو میں سفر نامے کی روایت فارسی کے زیر اثر وجود میں آئی۔ میلیستھینز، فاہین، مارکو پولو، البیرونی، ابن بطوطہ وغیرہ کے سفر نامے دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان تخلیقات میں اس دور کے تہذیبی وسماجی، معاشی ومعاشرتی حالات وواقعات کو دیکھا جا سکتا ہے جس دور میں وہ لکھی گئی ہیں۔

جب ہم اردو سفر ناموں کی بات کرتے ہیں تو ان میں ہمیں مشترکہ ہندوستانی تہذیب کی جھلکیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اس کی وجہ ہے کہ سفر نامہ ایک ایسی صنف ادب ہے جس میں مصنف اپنی زبان میں اس ملک کی تہذیب کو پیش کرتا ہے جس کا وہ سفر کر رہا ہوتا ہے۔ ظاہری بات ہے وہ موازنے سے بھی کام لیتا ہے۔ وہ متعلقہ ملک کی

سفر نامے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ذریعے ہندوستانی تہذیب و ثقافت کی جیتی جاگتی تصویر دیکھنے کو مل جاتی ہے۔سفر ناموں میں چوں کہ آنکھوں دیکھا حال بیان کیا جاتاہے۔لہٰذا وہ معتبر تو ہوتا ہی ہے دلچسپ بھی ہوتا ہے اور ہماری معلومات میں بے حد اضافہ بھی کرتاہے۔غرض سفرناموں کی حیثیت تہذیبی و ثقافتی دستاویز کی ہے اور ہندوستانی تہذیب و ثقافت کے مطالعے کے لیے نہایت مفید بھی۔

تہذیب کا موازنہ اپنے ملک کی تہذیب کے ساتھ کرتا ہے جس سے بالواسطہ طور پر اس کے اپنے ملک کی تہذیب کی جھلکیاں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اردو زبان میں دو طرح کے سفر نامے ہیں جن میں مشترکہ ہندوستانی کے نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ایک وہ سفر نامے ہیں جو بیرون ملک کے متعلق ہیں اور دوسرے وہ جن میں مصنفین نے اندرون ملک کے سفری احوال کو بیان کیا ہے۔ ان دونوں طرح کے سفر ناموں میں سفر نامہ نگاروں نے مشترکہ ہندوستانی تہذیب کی جھلکیاں دکھانے کی کوشش کی ہے۔ سید قمر صدیقی لکھتے ہیں:

''سفر نامے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ذریعے ہندوستانی تہذیب وثقافت کی جیتی جاگتی تصویر دیکھنے کو مل جاتی ہے۔ سفر ناموں میں چوں کہ آنکھوں دیکھا حال بیان کیا جاتا ہے۔ لہٰذا وہ معتبر تو ہوتا ہی ہے دلچسپ بھی ہوتا ہے اور ہماری معلومات میں بے حد اضافہ بھی کرتا ہے۔ غرض سفر ناموں کی حیثیت تہذیبی و ثقافتی دستاویز کی ہے اور ہندوستانی تہذیب وثقافت کے مطالعے کے لیے نہایت مفید بھی۔''

(سفر ناموں میں ہندوستانی سماج وتاریخ مشمولہ اردو سفر ناموں میں ہندوستانی تہذیب وثقافت، مرتب خواجہ اکرام الدین، ص23)

محبت کا پاک جذبہ مشترکہ تہذیب کا ایک اہم جز ہے۔ یہ جذبہ ہماری تہذیبی روایت کی روح ہے۔ شام بارک پوری اردو زبان کے اہم ادیب ہیں۔ انھوں نے بینکاک کا سفر اختیار کیا تو سفر کی واردات کو 'رنگ وبو کی سر زمین' کے عنوان سے شائع کیا۔ یوں تو ان کا تعلق بنگلہ دیش سے ہے لیکن ان کے سفر نامے کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا تعلق کسی نہ کسی طرح ہندوستان سے رہا ہوگا۔ دوران سفر انھیں بینکاک میں ایک چنا فروش سے ملاقات ہوتی ہے۔ یہ چنا فروش ہندوستانی ہے اور اس کے لہجے، زبان، طرز بیان اور برتاؤ میں ہندوستانیت کی ایک گہری چھاپ ہے جو سفر نامہ نگار کو بہت متاثر کرتی ہے۔ چنا فروش کو بھی شام بارک پوری کے اندر اپنائیت نظر آتی ہے جب وہ چنا فروش سے چنا خریدتا ہے تو چنا فروش اس کی زبان سے اسے پہچان جاتا ہے اور قیمت ادا کرتے وقت وہ اس سے پیسے لینے سے انکار کر دیتا ہے۔ محبت کا یہ جذبہ ہماری تہذیبی روایت کی روح ہے۔ ملاحظہ ہو یہ اقتباس جہاں چنا فروش اور سفر نامہ نگار آپس میں محوِ گفتگو ہیں:

''بینکاک میں چنے کب سے بیچت ہو؟

''ہمرا باپ بہت دن سے اہاں ہیں۔ ان کا

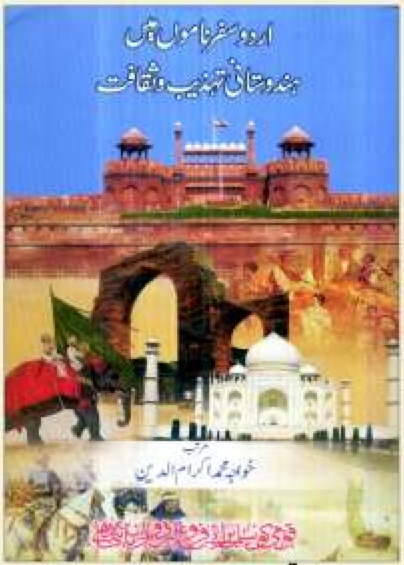

دیہانت ہو گوا۔ تبھی سے چنا بیچت ہیں۔''

''تو ہار بال بچے کہاں رہت ہیں؟''

''سب ملوک میں ہیں۔ ہم ایہاں اکیلا ہیں۔''

(رنگ وبو کی سرزمین، شام بارک پوری، ص111)

مصنف اور چنا فروش کی اس گفتگو سے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ یہ گفتگو بینکاک میں نہیں بلکہ یو۔پی یا اس کے اطراف میں ہو رہی ہے۔

ہندوستان ایک وسیع وعریض ملک ہے یہاں کئی نسلوں اور کم وبیش تمام تر مذاہب کے لوگ آباد ہیں۔ یہاں بے شمار زبانیں اور بولیاں بولی جاتی ہیں۔ یہاں جغرافیائی طور پر بھی علاقائی تفریق ہے لیکن اس کے باوجود وحدت وہم آہنگی ہے۔ کثرت میں وحدت کا یہ رجحان ہماری قومی تہذیب کی سب سے بڑی خصوصیت ہے جس نے اس ملک کو امن وسکون کا گہوارہ بنا رکھا ہے۔ مختلف نسلی و مذہبی امتیازات کے باوجود یہاں عوام میں ایک دوسرے کے لیے محبت و ہمدردی کا جذبہ موجود رہتا ہے۔ یہاں ہر مذہب وملت کے لوگ آئے لیکن ہندوستان کی مٹی میں آ کر جذب ہو گئے۔ ممتاز مفتی اپنے سفر نامے میں اس کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''صاحبو! ہندو قوم ایک عظیم قوم ہے۔ اس میں اپنا لینے کی اتنی قوت موجود ہے کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ ہندوستان میں بڑی بڑی قومیں آئیں، بڑے بڑے مذاہب آئے لیکن ہند نے سب کو اپنا لیا، جذب کر لیا۔''

(ہند یاترا، ممتاز مفتی، ص62)

شاید اسی آپسی محبت و ہمدردی کا اثر ہے کہ یہاں ایک سیکولر کلچر نے فروغ پایا۔ بعض اوقات ہمدردی ومحبت اور خلوص کا یہ رجحان تمام تر بندھنوں کو مٹا دیتا ہے اور لوگ

آپس میں اس قدر گھل مل جاتے ہیں کہ مذہبی روایات تہذیبی روایات کے تابع آجاتی ہیں۔لوگ مذاہب کو بھول کر ایک دوسرے کے گھر اور آستانوں اور زیارتوں پر بے تکلف جاتے ہیں اور کسی طرح کی کوئی اجنبیت محسوس نہیں کرتے۔

ہندوستان زمانہ قدیم سے ہی رشیوں،منیوں، سادھو،سنتوں،صوفیوں اور بزرگوں کی سرزمین ہے۔بے شمار رشیوں اور منیوں نے یہاں جنم لیا اور ہزاروں کی تعداد میں باہر سے یہاں صوفی حضرات آئے اور یہاں کی مٹی کا پیوند بنے۔جس کا اثر اب تک لوگوں کے اذہان میں موجود ہے۔یہاں بہت سے اعتقادات اور توہمات نے جنم لیا ہے۔یہ اعتقادات اور توہمات صدیاں گزرنے کے بعد بھی لوگوں کے دلوں پر چھائے ہوئے ہیں۔بعض اوقات توہم پرستی کی انتہا ہو جاتی ہے اور دقیانوسی خیالات اور توہم کی آڑ میں آکر بڑے بڑے جرم کر لیے جاتے ہیں۔یہاں تک کہ انسانی قربانی کو شرط قبولیت کا درجہ دیا گیا اور خوشی خوشی انسانوں کو دیوتاؤں کی بلی چڑھایا گیا۔ اس لیے نہ صرف اندرونی ملک کے سیاح بلکہ بیروں ممالک کے بے شمار سیاح جنھوں نے یہاں کا سفر کیا ان اعتقادات کی طرف متوجہ ہوئے بغیر نہیں رہ پائے اور اپنے سفرناموں میں اس کا اظہار کر دیا۔اس حوالے سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو جس میں لوگ قطب مینار کے پاس کھڑا ایک قدیم ستون سے اپنی پیٹھ کر کے پیچھے کی طرف سے اپنے ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ سے ملانے کی کوشش کرتے ہیں،لوگوں کے اذہان میں اس سے متعلق یہ عقیدہ ہے کہ جس شخص کے ایسا کرنے سے ہاتھ آپس میں مل جاتے ہیں وہ اپنے اندر زیادہ مردانہ قوت رکھتا ہے۔اسی لیے ہر کوئی اس کو جانچنے کے لیے ایسا کر رہا ہے اور نہ صرف ہندوستانی بلکہ بیرونی ممالک کے لوگ بھی یہ عمل کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ملاحظہ ہو جمیل زبیری کے سفر نامہ 'موسموں کا عکس' میں سے ایک اقتباس:

''لوگ ستون سے پیٹھ جوڑ کر دونوں ہاتھ پیچھے کی جانب لے جا کر ایک ہاتھ سے دوسرے کو چھونے کی کوشش کرتے ہیں۔یہ کہاوت مشہور ہے کہ جس کے ہاتھ مل جائیں اس میں قوتِ مردی زیادہ ہوتی ہے۔میں نے دیکھا بہت سے لوگ اس طرح اپنے آپ کو آزما رہے تھے جن میں کچھ لوگ یورپی ممالک سے آئے سیاح بھی شامل تھے۔'' (موسموں کا عکس،جمیل زبیری،ص 24)

یہاں اکثر دیکھا جاتا ہے کہ ہمیشہ گھروں یا دکانوں کے دروازوں پر لوگ طرح طرح کی چیزیں لٹکا کے رکھتے ہیں تاکہ ان کے گھر اور وہاں بسنے والے انسان محفوظ رہیں سید احتشام حسین نے اپنے سفرنامے 'ساحل اور سمندر' میں اس کا یوں اظہار کیا ہے:

''اکثر بڑی بڑی دکانوں پر بڑا سا میٹھے کا پھل رسیوں میں لٹکا ہوا نظر آتا ہے جس پر کاجل اور سندور سے ناک،آنکھ،منہ بنائے گئے ہیں،بعض دکانوں میں رسی میں باندھی ہوئی اشوک کی پتیاں لٹکتے دکھائی دیتی ہے۔''

(ساحل اور سمندر،سید احتشام حسین،ص 51)

یہ اعتقادات مشترکہ ہندوستانی تہذیب کا ایک لازمی حصہ ہیں اور آئے دن یہاں کے لوگوں کا واسطہ ان چیزوں سے پڑتا رہتا ہے۔یہ اعتقادات یہاں کی قدیم روایات کا حصہ اور دین ہیں اور لوگ انھیں مذہب سے جوڑ کر دیکھتے ہیں۔اس لیے ان کا احترام اور تعظیم بھی کرتے ہیں اور ان کے خلاف آواز اٹھانے کی کسی میں جرأت نہیں۔یہ توہمات و اعتقادات یہاں کی عوام کی رگ و پے میں سرایت کر چکے ہیں اور ان سے پوری طرح اپنا دامن چھڑانا ہرگز ممکن نہیں۔

ہمارے یہاں قدیم زمانے سے ہی فن تعمیر،موسیقی اور ادب و فنون سے متعلق لوگوں نے اپنی وابستگی اور دلچسپی کا ثبوت دیا ہے۔قدیم زمانے سے ہی یہاں طرح طرح کی عمارت تعمیر کی گئی جن میں بیشتر مذہبی عبادت گاہیں، شاہی محل اور قلعے وغیرہ شامل ہیں۔ہندوستان کے کسی بھی شہر یا قصبے کی سیر کر لیجیے تو ہمیں اندازہ ہو جاتا ہے کہ قدیم زمانے میں یہ لوگ فنِ تعمیر،فنِ موسیقی اور بت تراشی میں کس حد تک کمال رکھتے تھے۔اجنتا اور الورا کی مورتیوں اور مصوری سے کون متاثر نہ ہو۔اتر پردیش کے مختلف مقامات بالخصوص سارناتھ میں اشوک کے تعمیر کردہ ستون آج بھی کمال فن کا ثبوت دیتے ہیں۔قطب مینار کے پاس لوہے کا ایک ستون ایک شاندار ماضی کی دلیل کو پیش کرتا ہے۔موہنجوداڑو اور ہڑپا کی دریافت اس پر مزید روشنی ڈالتے ہیں۔جہاں ایک اندازے کے مطابق قدیم زمانے میں ہی ایک ایسی تہذیب تھی جن کی طرزِ زندگی آج کے جدید اور ترقی یافتہ دور کے لوگوں کی طرز زندگی سے ملتی جلتی تھی۔یہاں کئی ایسے آثار ملتے ہیں جن کا پتا چلتا ہے کہ وہ فنِ تعمیر میں کافی ماہر تھے۔کونارک میں سن مندر،پوری میں جگن ناتھ مندر اور بھبنیشور میں لنگا راجا مندر قدیم فنِ تعمیر کی مثالیں ہیں۔فنِ تعمیر کا یہ سلسلہ آگے بڑھتا گیا یہاں تک کہ مسلمان ہندوستان میں وارد ہوئے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے داخلے سے فنِ تعمیر نے ایک نئی اور بے نظیر صورت اختیار کی۔ہندو مسلم ماہر فن کے سنگم سے فنِ تعمیر میں ایک نیا حسن پیدا ہوا اور اس نے اپنا ظہور تاج محل،قطب مینار،لال قلعہ،شاہی مسجد، بلند دروازہ،چار مینار،بی بی کا مقبرہ،بادشاہ مسجد اور کئی بے شمار صورتوں میں پایا۔امرتسر کا گولڈن ٹیمپل فنِ تعمیر کے اسی نئے امتزاج کا ثمرہ ہے۔تاج محل جو شاہجہاں نے تعمیر کرایا عجائبات عالم میں شامل ہے اور لوگ اسے ایک شاہکار فن کی نظر سے دیکھتے ہیں۔لال قلعہ بھی اپنی نظیر آپ ہے اور آج بھی پوری پوری شان سے سیاحوں کو اپنی طرف متوجہ کیے ہوئے ہے۔قطب مینار جو آج سے کم و بیش ساڑھے آٹھ سو سال قبل تعمیر کیا گیا تھا آج بھی دنیا کا بلند ترین مینار خیال کیا

جاتا ہے۔ یہ سب ان لوگوں کے کمال فن کا نتیجہ ہے۔ یہاں جب بھی کوئی سیاح آتا ہے تو کمال فن کی داد دیے بغیر نہیں رہتا ہے۔ تاج کی کشش انھیں آگرہ کا سفر کرنے پر مجبور کرتی ہے تو قطب مینار، لال قلعہ اور شاہی مسجد کا حسن انھیں دہلی پہنچا دیتا ہے۔ چار مینار اور گول گنبد انھیں جنوب کا سفر کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ اجنتا کی مصوری انھیں جنوب مغرب کو روانہ کرا دیتی ہے تو سرناتھ اور بھبنیشور کے مندریں انھیں جنوب مشرق کا حکم سفر دیتے ہیں۔ یہ وہ ساری چیزیں ہیں جن کا بیان کم وبیش اردو کے سفر نامہ نگاروں نے اپنے سفری تجربات کو پیش کرتے ہوئے اپنے سفرناموں میں پیش کر دیا ہے۔ تاج محل محبت کی ایک لازوال نشانی ہے جس نے ہندوستان کو پوری دنیا میں شہرت دلائی اور ہر کوئی سیاح جو ہندوستان میں داخل ہوتا ہے تاج محل کو دیکھنے کی چاہ اپنے اندر ضرور رکھے ہوئے ہوتا ہے یہاں تک کہ سیاسی غرض سے آئے ہوئے سیاست دان بھی تاج محل کو دیکھنے کا موقع نہیں گنوانا چاہتے۔ محبت کی اس لازوال اور بے نظیر نشانی پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ثریا خورشید اپنے سفر نامے 'بانیال کے اس پار' میں لکھتی ہیں:

''آج ہم آگرہ گئے جو دہلی سے دو سو کلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔ یہ اتر پردیش کے صوبے میں ہے۔ آگرہ شہر کی اہمیت ایسے آج چمڑے کے کارخانوں کی وجہ سے ہے مگر آگرہ کی اصل شہرت کا سبب تاج محل ہے۔ شاہجہاں کی چہیتی ملکہ ممتاز محل کا سنگ مرمر سے بنا ہوا یہ روضہ دریائے جمنا کے کنارے محبت کی لازوال نشانی ہے۔'' (بانیال کے اس پار، ثریا خورشید، ص 108)

غرض یہ فن تعمیر ہمارے یہاں ایک سے بڑھ کر ایک ہیں اور قدیم زمانے سے ہی یہ ہماری مشترکہ تہذیب کو امتیاز بخشتے ہیں۔ خواہ وہ گندارا آرٹ ہو یا اشوک کے زمانے کے ستون یا پتھر یا پھر تاج محل و لال قلعہ ہوں۔ ہمارے سلاطین و بادشاہوں نے اس طرف ہمیشہ توجہ دی اور اپنے اپنے زمانے اور اپنے عہد میں آرٹ اور فن کا بہترین نمونے پیش کر کے ہماری تہذیب و ثقافت کو رعنائی عطا کی اور اپنا نام تاریخ میں سنہرے حروف سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زندہ و تابندہ کر دیا اور جس کا بیان اور نقشہ سفر نامہ نگاروں اور مصنفین نے اپنی اپنی تخلیقات میں پوری طرح کیا ہے۔

ہندوستانی قوم صدیوں سے مہمان نواز رہی ہے۔ مہمان نوازی یہاں کی مشترکہ تہذیبی اقدار کی ایک علامت ہے۔ مہمان نوازی کا یہ جذبہ ہمارے یہاں کوئی نئی چیز نہیں بلکہ زمانہ قدیم سے ہی مہمان نوازی کے اس جذبے کی روایت ہماری تہذیب سے عبارت ہے۔ آج بھی جب کہ خود غرضی، لالچ اور انفرادیت پسندی نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اور محبت و ہمدردی جیسے اعلیٰ اقدار سے دوری پیدا ہو رہی ہے۔ لیکن پھر بھی ہمارے یہاں مہمان نوازی کا جذبہ پوری طرح موجود ہے اور جس کا اظہار کم وبیش تمام سیاحوں نے کیا ہے جنھوں نے ہندوستان کا سفر اختیار کیا ہے۔ حسن رضوی اپنے سفرنامے 'دیکھا ہندوستان' میں لکھتے ہیں:

''بھارت کی ادبی تقریبات میں یہ عام رواج ہے کہ خاص مہمانوں کا استقبال تقریب میں موجود تقریباً تمام ممتاز ادیب اپنے ہاتھوں سے مہمانوں کے گلوں میں باری باری ہار ڈال کر کرتے ہیں۔ سو اس تقریب میں پہلی مرتبہ ہمیں اس خلوص، محبت بھرے روایتی انداز کو دیکھنے کا موقع ملا۔''

(دیکھا ہندوستان، حسن رضوی، ص 104)

ہندوستان ایک وسیع ملک ہے۔ یہاں ہر مذہب و نسل کے لوگ آباد ہیں۔ یہاں بے شمار زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ہر علاقے اور ہر شہر کے ساتھ کھانوں کی الگ الگ اقسام دیکھنے کو ملتی ہیں۔ غرض ہمارا ملک اشیائے خورد و نوش کے لحاظ سے ایک انفرادیت رکھتا ہے۔ بے شمار قسم کے لذیذ اور خوش ذائقہ کھانے یہاں بنائے اور پکائے جاتے ہیں۔ کشمیر کا وازوان پوری دنیا میں مشہور ہے جس میں گوشت کی کئی اقسام کی لذیذ اور بے حد مزے دار چیزیں تیار کی جاتی ہیں۔ پنجاب کی لسی، مکی کی روٹی اور سرسوں کا ساگ پنجاب کی علاقائی پہچان ہے۔ گجراتی اور راجستھانی کھانے بھی کافی مشہور ہیں۔ اس کے علاوہ جنوبی ہند کا مزاج تو بالکل ہی مختلف ہے۔ یہاں کی تقریباً ہر چیز شمال سے پوری طرح الگ ہے۔ یہاں کی اشیائے خورد و نوش یہاں کے مخصوص مزاج کی نشان دہی کرتی ہیں۔ بنارس کا پان وہاں کی شان ہے، جو پان کا عادی نہیں وہ بھی یہاں پہنچ کر کم از کم ایک مرتبہ پان کھانا پسند کرتا ہے۔ غرض یہ کہ جس قدر کثرت یہاں معاشرتی اور تہذیبی سطح پر ملتی ہے، یہاں کے کھانے پینے کی چیزوں میں بھی اسی قدر کثرت پائی جاتی ہے۔ ہر علاقے کی کوئی مخصوص چیز ہے جو اس علاقے کو ایک انفرادی شناخت عطا کرتی ہے۔ مٹھائیوں کی الگ الگ قسمیں، پان پوری، پان وغیرہ تو ایسی چیزیں ہیں جو یہاں کی ہی پیداوار ہیں۔ جب بھی کوئی سیاح بغرض سیاحت ہندوستان آتا ہے یا کہیں بیروں ملک کی سیاحت کے لیے یہاں سے جاتا ہے تو ضرور 'انڈین فوڈ' کا ذکر اور تعریف کر ہی دیتا ہے۔ اردو کے سفر نامہ نگاروں نے بھی اس طرف توجہ دی ہے اور یہاں کی اشیائے خورد و نوش کو اپنے سفرناموں میں جگہ دی۔ ان سفر نامہ نگاروں نے اپنے سفرنامے میں جگہ جگہ کھانے پینے کی چیزوں کو بیان کیا ہے۔ ڈاکٹر کیول دھیر اگرچہ پاکستان کے سفر پر ہیں لیکن انھیں وہاں کے کھانے ہندوستانی کھانوں کے مماثل نظر آتے ہیں۔ انھوں نے ہر جگہ اپنے سفر نامے میں جب بھی کہیں کھانوں کا ذکر کیا ہے تو ہندوستانی کھانوں کو فراموش نہیں کیا ہے۔ وہ ہندوستان اور پاکستان کے معاشرے میں مکمل طور پر یکسانیت پاتے ہیں۔ وہاں کی عوام، ان کے عادات و اطوار، ان کے مزاج و اعتقادات کو وہ مماثل پاتے ہیں۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں ملکوں کی تہذیب ایک ہے اور تہذیبی ارتقاء اور ارتقائی مدارج بھی ایک۔ اس لیے تہذیب کے خارجی عناصر سے لے کر باطنی عناصر مماثل اور یکساں ہیں۔ ڈاکٹر صاحب وہاں کے کھانوں میں ہندوستانی کھانوں کی لذت محسوس کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو ان کے سفرنامے 'خوشبو کا سفر' سے ایک اقتباس:

''بڑے ڈائننگ ٹیبل کے گرد ہم لوگوں کی تعداد سے کہیں زیادہ ان پکوانوں کی تعداد تھی جو گھر میں ہی بنائے گئے تھے۔ کئی طرح کا گوشت تھا، سبزیاں تھیں،

دال، دہی بڑے اور خاص بات یہ کہ آلو وڑی کی ترکاری بھی تھی اور ہر پکوان ایک سے زیادہ لذیز بھی۔ دہی بڑے کو بھارتی پنجاب میں 'دہی بھلے' کہتے ہیں اور آلو وڑی پنجاب بلکہ خصوصاً امرتسر کے لوگوں کا من بھاتا کھانا ہے، پاکستان میں کم ہی ملتا ہے۔''

(خوشبو کا سفر، ڈاکٹر کیول دھیر، ص44)

ہندوستان چاول کی پیداوار میں صفِ اول کے ممالک میں آتا ہے۔ چاول یہاں کی من پسند غذا ہے۔ تقریباً تمام لوگ دن میں ایک یا دو مرتبہ چاول کھاتے ہیں۔ غرض پورے ملک میں چاول کا عام استعمال ہوتا ہے۔ ہر خطے میں چاول یکساں طور پر مشہور اور من پسند کھانا ہے۔ کشمیر ہو یا بنگال یا پھر جنوبی ہندوستان چاول سارے ہندوستانیوں کی پہلی پسند ہے۔ برج پریمی اپنے سفرنامے 'بمبئی سے بمبئی تک' میں گوا کے لوگوں پر متوجہ ہو کر لکھتے ہیں:

''یہاں کی خوراک چاول ہے۔ اپنے کشمیر کی طرح۔ لیکن چاول کے معاملے میں گوا خود کفیل نہیں۔ غلہ دوسری ریاستوں سے آتا ہے۔ دھان کی سال میں دو فصلیں ہوتی ہیں اور کھیتوں میں آب رسائی جیل کے پانی سے ہوتی ہے۔'' (چند تحریریں، مرتب پریمی رومانی، ص80)

قاضی مشتاق احمد اپنے سفر نامے میں بنگال کے لوگوں کے کھانوں کی عادت کے متعلق لکھتے ہیں:

''بنگالی لوگوں کے لیے مچھلی ہوا کی طرح ضروری ہے اس کے کھانے میں مچھلی کا ایک ٹکڑا نہ ہو تو اس کا پیٹ نہیں بھرے گا۔'' (آٹھ سفر نامے، قاضی مشتاق احمد، ص18)

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''منالی میں امرتسر رسوئی گھر نامی ایک ڈھابہ نما ہوٹل بہت مشہور ہے جہاں لوگ بطور خاص سرسوں کا ساگ اور مکئی کی روٹی کھانے جاتے ہیں۔ اس ہوٹل میں آلو، گوبھی اور پیاز کے پراٹھے بھی ملتے ہیں۔''

(آٹھ سفر نامے، قاضی مشتاق احمد، ص47)

خورد و نوش یا کھانوں کے اس مختصر سے جائزے کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اردو کے سفرنامہ نگاروں نے موقع بہ موقع اپنے سفری تجربات کو پیش کرتے ہوئے ہندوستانی اشیائے خورد و نوش کا تذکرہ کیا ہے جس سے قاری کو ہندوستانی مزاج اور پسند و ناپسند سے آگاہی ہوتی ہے۔ ان اشیائے خورد و نوش کی خوشبوؤں میں ہندوستان کی مہک اور لذت ملتی ہے اور تہذیبی عناصر کو باریکی سے جاننے کا موقع بھی ملتا ہے۔

تہذیب کا ایک اہم جز ملبوسات و پوشاک یا لباس اور زیورات ہیں۔ ہر ملک وقوم کا اپنا لباس اور زیورات ہوتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی پہچان ہوتی ہے اور اسی لباس کی وجہ سے دنیا میں ان کی انفرادیت بھی قائم رہتی ہے۔ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے یہاں لباس و زیورات کا استعمال بھی یہاں کی زبانوں کی طرح ہر علاقے میں مختلف ہے لیکن بعض ایسی چیزیں بھی ہیں جو آج بھی بلا مذہب و ملت کی تفریق کے ہر جگہ یکساں ہیں۔ گھونگھٹ ہندوستان میں ایک قدیم روایت رہی ہے۔ یہاں اکثر دیکھا گیا ہے کہ عورت اپنے بزرگوں کے سامنے گھونگھٹ کا استعمال کرتی ہے۔ جو ایک طرح سے ان کی اپنے بزرگوں کی تعظیم کی نشانی ہے۔ سفرنامہ 'موسموں کے عکس' میں جمیل زبیری اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''یہاں کی عورت اب بھی اس طرح اپنے مردوں کے سامنے گھونگٹ کاڑھتی ہیں اور پاؤں کی انگلیوں میں بچھوئے پہنتی ہے۔'' (موسموں کا عکس، جمیل زبیری، ص122)

دوسری جگہ ایک عورت کے لباس اور زیورات میں ملبوس ہونے کا نقشہ یوں بیان کیا ہے کہ وہ عورت سچی اسی تصویر میں ہمیں دکھائی دیتی ہے۔ پیش ہے یہ اقتباس:

''وہ چاندی کا زیور اور پھول دار انگیا پہنے ہوئے تھی اور ہلکے نیلے رنگ کی ساڑھی باندھے تھی، پاؤں میں چھانگل تھے۔'' (موسموں کا عکس، جمیل زبیری، ص107)

ثریا خورشید نے اپنے سفرنامے 'بانیال کے اس پار' میں راجستھانی عورت کے لباس اور زیورات کا یوں ذکر کیا ہے:

''راجستھان کی عورت شوخ رنگوں کے لہنگے پہنے ناک اور کان میں چمکدار لونگ لٹکائے، گلے اور ہاتھوں میں موتی اور منکے پہنے ادھر ادھر نظر آ رہی تھی۔''

(بانیال کے اس پار، ثریا خورشید، ص86)

اردو سفرناموں میں ہندوستانی تہذیب و معاشرت کے جائزے کی روشنی میں یہ کہنا حق بہ جانب ہے کہ اردو کے سفرناموں میں سفرنامہ نگاروں نے ہندوستانی مشترکہ تہذیب کی بہترین عکاسی کی ہے۔ مشترکہ تہذیب کے عناصر کو ایک ایک کر کے انھوں نے اپنی سفری تخلیقات میں سمویا ہے۔ وہ اپنے تجربات کو بیان کرتے ہوئے تعصب و تنگ نظری سے بالاتر ہو کر اپنی وسعتِ نظر کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ انھوں نے ہندوستانی تہذیب کے مثبت و منفی دونوں طرح کے عناصر کو اپنی تخلیقات میں جگہ دی ہے۔ انھوں نے جہاں معاشرے کی خوبیوں کا بیان کیا ہے وہیں خامیوں کو بھی منظرِ عام پر لایا گیا ہے تاکہ قاری خود کو اور معاشرے کو دیکھ کر اس کی اصلاح کی کوئی تدبیر ڈھونڈ سکے۔ محبت و ہمدردی، جذبۂ یکتائی، ایثار و قربانی، قوتِ ضبط، کثرت میں وحدت، ادب اور فن سے لوگوں کی دلچسپی، باہمی تال میل، اخلاص و سادگی، سادھو و سنتوں اور درویشوں سے عقیدت و ہمدردی، مزاروں سے عقیدت، مذہبیت و روحانیت، روز بہ روز سماج میں بڑھتے ہوئے مسائل وغیرہ ہر چیز کو ان سفرنامہ نگاروں نے اپنے سفرناموں میں پیش کر دیا ہے۔

القصہ یہ کہ ہندوستانی مشترکہ تہذیب بہت سارے مثبت اور خوبصورت عناصر سے عبارت ہے لیکن تہذیب کے ارتقائی سفر میں اس نے اپنے اندر کچھ منفی پہلوؤں کو بھی جگہ دی لیکن جو بھی ہو اردو کے سفرنامہ نگاروں نے ان تمام منفی و مثبت عناصرِ تہذیب و معاشرت کو اپنے سفری تجربات میں لکھا اور جوں کا توں اپنی نگارشات و تخلیقات میں اتار دیا۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ ان سفری تخلیقات کی ورق گردانی کرتے ہوئے قاری کو اپنی مشترکہ تہذیب کو اس کے پسِ منظر میں جاننے کا موقع ملتا ہے اور اس کے لیے اہلِ زبان اردو کے ان سفرنامہ نگاروں کی تخلیقات کو سراہنے پر مجبور ہیں اور ان کی کاوشوں کے لیے ان کے شکر گزار بھی، جس کے باعث ہمارے ادب میں بیش قیمت اضافہ ہوا۔

■

Dr. Altaf Ahmad
Lecturer Urdu, Dept of Education
Jammu Kashmir
Mob.:9906063535

ترکی میں اردو زبان وادب

امتیاز رومی

اردو زبان کی انفرادیت یہ ہے کہ متعدد لسانی عوامل کی شمولیت اور مختلف تہذیبی عناصر کی یکجائیت نے اس کے تانے بانے بنے۔ عربی، فارسی، ترکی، ہندی اور انگریزی الفاظ کی مشارکت نے قوت گویائی بخشی اور 'ریختہ' بولی کی سطح سے بلند ہوکر زبان اور پھر ادبی زبان بن گئی۔ ایک ایسی زبان جس کی خوشبو عالمی افق کو مہکا رہی ہے۔ اپنی جائے پیدائش سے ہزاروں میل کے فاصلے پر بھی اپنا وجود نہ صرف قائم کرچکی ہے بلکہ مستحکم بھی، جو برصغیر سے نکل کر دنیا کے مختلف براعظموں میں اپنی لسانی اور تہذیبی شناخت رکھتی ہے۔ چونکہ اردو زبان محض ایک زبان نہیں بلکہ ایک تہذیبی سنگم ہے جس کی بنیاد رواداری اور ہم آہنگی پر قائم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی دنیا کے مختلف ملکوں اور تہذیبوں کے لیے اردو باعث کشش ہے۔

عالمی منظرنامے پر ترکی ایک ایسا ملک ہے جس سے اردو زبان وتہذیب کے قدیم ترین مراسم ہیں۔ جس کا آغاز ہندوستان میں ترکوں کی آمد سے ہوتا ہے۔ انھوں نے ہندوستان کے تہذیبی وثقافتی اور لسانی دھارے میں خود کو شامل کرکے ایک نیا رنگ دیا۔ اردو زبان کی لفظیات میں ترکی الفاظ کا اضافہ کیا۔ نیز حدود سلطنت کی وسعت کے ساتھ ساتھ اردو زبان کا دائرہ بھی وسیع کیا۔ دوسری طرف ہندوستانی مسلمان جب ترکی گئے تو اپنے ساتھ یہ زبان بھی لے گئے۔ 1453 میں سلطان محمد فاتح نے جب قسطنطنیہ (استنبول) فتح کیا تو اس سلسلے میں اور تیزی آئی۔ بہت سے ہندوستانی مسلمان استنبول میں آباد ہوگئے۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی آتے آتے اس تعداد میں کافی اضافہ ہوا اور یہ تعداد اتنی ہوگئی کہ انیسویں صدی کے اواخر میں استنبول سے اردو اخبارات نکلنے لگے۔ ظاہر ہے کوئی بھی اخبار نکالنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے قارئین کی خاطر خواہ تعداد موجود ہو۔ خلیل طوقار کی تحقیق کے مطابق 1880 میں اردو کا پہلا اخبار 'پیک اسلام' کے نام سے نکلا۔ اس کے بعد دو اور اخبارات نکلے۔ اس حوالے سے خلیل طوقار رقم طراز ہیں:

''استنبول میں نکلنے والے اردو اخبارات کے سلسلے میں ہمارا تین ناموں سے سابقہ پڑتا ہے: 'پیک اسلام'، 'جہان اسلام' اور 'الدستور' علاوہ بریں ان اخباروں میں 'اخوت' کے نام کا بھی اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ جو فارسی زبان میں شائع ہونے کے باوجود ہندوستانی صحافیوں کی جانب سے نکلنے کے اعتبار سے قابل ذکر ہے۔ ہماری تحقیقات کے دوران یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ استنبول کی لائبریریوں میں ان چاروں میں سے صرف تین اخبارات کے نسخے موجود ہیں اور وہ اخبارات ہیں: 'جہان اسلام'، 'الدستور' اور 'اخوت'، لیکن اب تک 'پیک اسلام' کا کوئی نسخہ نہیں ملا۔

اردو اخبارات میں پہلے نمبر پر ہونے کا شرف پیک اسلام کو حاصل ہے۔ 1880 میں نکلنے والے اس اخبار کے ساتھ استنبول میں اردو صحافت کا آغاز ہوتا ہے۔ 'پیک اسلام' اردو اور ترکی دونوں زبانوں میں شائع ہورہا تھا۔ اس کے مدیر مسئول نصرت علی خان تھے جو انگریزوں کے خلاف سرگرمیوں میں شرکت کرنے کی وجہ سے ہندوستان سے جلاوطن کردیے گئے تھے۔ مئی 1880 میں 'پیک اسلام' کا اولین شمارہ منظر عام پر آیا۔''

(ڈاکٹر خلیل طوقار، جہان اسلام مغربی پاکستان اردو اکادمی لاہور، 2011 ص 36)

اس تحقیق کی رو سے معلوم ہوتا ہے کہ 1880 میں ہی استنبول میں اردو صحافت کا آغاز ہوگیا اور پے در پے تین اخبارات نکلے۔ ترکی میں اردو کا یہی نقطۂ آغاز ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں استنبول اور اس کے گردونواح میں اردو بولنے اور پڑھنے والوں کی تعداد اس قابل ہوگئی تھی کہ اخبار نکالنے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ تاہم پہلی جنگ عظیم کے ساتھ ہی اردو کے اولین دور کا خاتمہ ہوگیا۔

تعلیم و تدریس

ترکی میں اردو تدریس کا آغاز تو 1915 میں ہی خیری برادران کی کوششوں سے ہوچکا تھا۔ عبدالجبار خیری اور عبدالستار خیری 1904 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھے۔ وہاں سے قاہرہ، بیروت اور پھر حجاز کے راستے استنبول پہنچے اور یہاں ان دونوں نے مختلف تعلیمی اور سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کردیا۔ خیری برادران نے عثمانی سلطنت میں اردو کی اہمیت وضرورت محسوس کرتے ہوئے دارالفنون استنبول میں اردو تعلیم کا آغاز کیا۔ اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے خلیل طوقار لکھتے ہیں:

''ان کی سیاسی سرگرمیاں بے شک تاریخی لحاظ سے بہت اہم ہیں مگر ان کے علاوہ ان کا ایک اور بڑا اور ناقابل فراموش کارنامہ ترکی میں یونیورسٹی کی سطح پر اردو زبان کی تعلیم کا افتتاح ہے۔ انھوں نے دارالفنون میں کس تاریخ میں اردو کی تعلیم شروع کرائی اس کے بارے میں ہمارے پاس قطعی معلومات موجود نہیں لیکن اگر ان کی استنبول آمد کو 1914 کے اواخر اور 1915 کی شروعات ٹھہرائیں گے (کیونکہ انھوں نے اگست 1915 میں 'ہند اخوت اسلام انجمنی مرکز عمومیسی' (انجمن ہند اخوت اسلام کا مرکزی ادارہ) کے قیام میں حصہ لیا اور 1915 میں اخوت نامی اخبار کی اشاعت میں اول اول تھے) اور دارالفنون کی حیثیت سے ایک کمیشن میں ان کی پیش کردہ تجویز کی تاریخ جو کہ فروری 1917 ہے، کو دیکھیں گے تو ہم بلاجھجک یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کا دارالفنون میں اردو کے پروفیسر کی حیثیت سے تقرر فروری 1917 سے پہلے 1915 میں یا 1916 میں ہوا ہوگا لیکن یونیورسٹی کی مجلسوں میں شرکت کرکے تجاویز دینے اور ان تجاویزات کو منوانے کی حد تک دارالفنون کے اراکین پر ان کے اثر ورسوخ کو دیکھیں گے (کیونکہ بالخصوص یونیورسٹی کے اساتذہ پر اثر ورسوخ مرتب کرنے میں بھی کچھ وقت لگتا ہے) تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ استنبول یونیورسٹی میں اردو کی درس وتدریس کا سلسلہ 1916 سے بھی پہلے 1915 میں شروع ہوا تھا۔''

(ڈاکٹر خلیل طوقار، ترکی میں اردو تعلیم وتدریس کی صدی اور آئندہ امکانات، مشمولہ ترکی میں اردو زبان وادب کا صد سالہ سفر، ص 26)

اس طرح ترکی میں اردو تعلیم کا آغاز تو 1915 میں

ہی خیری برادران کی کوششوں سے ہوگیا تھا اور اردو اخبارات بھی نکلنے لگے تھے۔ تاہم باقاعدہ طور پر ترکی میں اردو کے دوسرے دور کا آغاز 1950 کے بعد پاکستان اور ترکی کی دوستی سے ہوتا ہے۔ 1956 میں انقرہ یونیورسٹی میں اردو تدریس کا آغاز ہوا اور حکومت پاکستان نے ڈاکٹر داؤد رہبر کو "اردو اور مطالعہ پاکستان" چیئر کے لیے منتخب کیا۔ انھوں نے ترکی میں اپنے تین سالہ قیام کے دوران یہاں کی مختلف جامعات میں اردو زبان کے آغاز و ارتقا اور اس کی تہذیبی و لسانی اور تاریخی پس منظر پر لیکچرز دیے۔ ان کے بعد طارق فاروقی، حنیف فوق، عبادت بریلوی، احمد بختیار اشرف، انوار احمد اور سعادت سعید جیسے اسکالرس کا تقرر کیے بعد دیگرے انقرہ یونیورسٹی میں ہوا۔ ان اساتذہ نے ترکی میں اردو کی بنیاد کو استحکام بخشا۔ ڈاکٹر سعادت سعید لکھتے ہیں:

"ان اساتذہ کی شبانہ روز محنتوں کا ثمر یہ ہے کہ آج تک ہزاروں ترک طالب علم اردو شاعری کی مشہور ہستیوں ملا وجہی، ولی گجراتی، خان آرزو، میر تقی میر، محمد رفیع سودا، خواجہ میر درد، نظیر اکبرآبادی، غلام ہمدانی مصحفی، انشاء اللہ انشا، سعادت یار خان رنگین، استاد ابراہیم ذوق، اسد اللہ خان غالب، مومن خان مومن، بہادر شاہ ظفر، داغ دہلوی، مولانا الطاف حسین حالی، اکبر الہ آبادی، حسرت موہانی، جوش ملیح آبادی، فیض احمد فیض، ن م راشد، صوفی غلام مصطفی تبسم، ابن انشا، حفیظ جالندھری، مجید امجد، احمد ندیم قاسمی، ناصر کاظمی، جمیل الدین عالی، احمد فراز، پروین شاکر، منصورہ احمد، جیلانی کامران، افتخار جالب، ظفر اقبال، افتخار عارف وغیرہ کے ناموں اور کارناموں سے روشناس ہوچکے ہیں۔ ان شاعروں میں سے بیشتر کے کلام کو ترک محققوں اور مترجموں نے وسیع تر ترک قارئین کے لیے ترکی زبان میں خوش اسلوبی سے منتقل کیا ہے۔ علاوہ ازیں عظیم اردو نثر نگاروں کی تحریروں کے ترکی ترجموں سے شعبہ اردو انقرہ یونیورسٹی انقرہ، سلجوق یونیورسٹی قونیہ اور شعبہ اردو استنبول یونیورسٹی کے کتب خانے بھرے پڑے ہیں۔"

(پروفیسر سعادت سعید، ترکی میں اردو ایک مختصر جائزہ، مشمولہ ترکی میں اردو زبان و ادب کا صد سالہ سفر، مرتبین ڈاکٹر خلیل طوقار و علی معین، اردو گھر بہاول پور، 2015، ص 37-36)

انقرہ یونیورسٹی میں شعبہ اردو کے پہلے ترک استاذ کے طور پر ڈاکٹر شوکت بولو کا تقرر ہوا۔ انھوں نے پانچ سال پاکستان میں رہ کر اردو کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے علاوہ عربی اور انگریزی پر بھی انھیں قدرت حاصل تھی۔ انھوں نے تقریباً چار دہائی تک اردو زبان و ادب کی خدمات انجام دیں۔

ڈاکٹر شوکت بولو نے اردو کی بہت سی کتابوں کے ترجمے ترکی زبان میں کیے۔ ان میں علامہ اقبال کا مجموعہ کلام بال جبریل، رام بابو سکسینہ کی تاریخ ادب اردو، حامد حسن قادری کی داستان نثر اردو اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی کتاب آج کا اردو ادب خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ نیز ترکی میں اقبالیات کے حوالے سے بھی شوکت بولو نے نمایاں کارنامہ انجام دیا۔ ڈاکٹر شوکت بولو کے ریٹائرمنٹ کے بعد ڈاکٹر سلمی بینلی نے انقرہ یونیورسٹی میں صدر شعبہ اردو کا عہدہ سنبھالا۔ سلمی بینلی کو ادبی تحقیق اور اردو قواعد میں مہارت حاصل تھی۔ 'جدید اردو شاعری 1900-1850' کے موضوع پر انھوں نے پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا۔ اردو غزل کا مجتہد حالی، منصورہ احمد کی شاعری، سعادت حسن منٹو اور حسرت موہانی اور ان کی غزل جیسے موضوعات پر ان کے مضامین شائع ہوکر داد تحسین حاصل کرچکے ہیں۔ اس کے علاوہ کئی تحقیقی کام ان کی نگرانی میں انجام پاچکے ہیں۔

ڈاکٹر گلسرین ہالی جی اوزکان انقرہ یونیورسٹی شعبہ اردو کے استاذ ہیں۔ انھوں نے جنوبی ایشیا میں مغلوں کے علمی و ثقافتی ورثے پر اپنا تحقیقی مقالہ اور ترک جہاں گیری پر ایم اے کا مقالہ لکھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے کئی تحقیقی مقالوں کی نگرانی بھی کی ہے۔ فیض احمد فیض، سجاد حیدر یلدرم اور منصورہ احمد پر بھی تحقیقی مضامین لکھ چکے ہیں۔ ڈاکٹر آسمان بیلین اوزجان بھی انقرہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے وابستہ ہیں۔ انھوں نے پروین شاکر کی شاعری پر اپنا تحقیقی مقالہ لکھا۔ اورینٹل کالج لاہور میں بھی زیر تعلیم رہی۔ انھوں نے آغا حشر کاشمیری اور حسینہ معین کے ڈرامے اور اقبال اور پروین شاکر کی نظموں کا ترجمہ ترکی زبان میں کیا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے راماینا کا ہندی سے ترکی میں ترجمہ کیا ہے۔ ان کے علاوہ ایمیل سلیم، آئے قوت کشمر اور داؤد شہباز ریسرچ اسسٹنٹ کے طور پر انقرہ یونیورسٹی میں اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

سلجوق یونیورسٹی

انقرہ یونیورسٹی کے بعد سلجوق یونیورسٹی قونیہ میں 1985 میں ڈاکٹر ایرکن ترکمان کی کوششوں سے شعبہ اردو کا قیام عمل میں آیا۔ اس کوشش میں پروفیسر غلام حسین ذوالفقار بھی ان کے ساتھ ساتھ تھے۔ ایرکن ترکمان کی ولادت پاکستان میں ہوئی۔ وہیں سے تعلیم حاصل کی پھر ترکی آکر استنبول یونیورسٹی شعبہ فارسی سے انھوں نے پی ایچ ڈی کی۔ انھوں نے ترکی میں اردو زبان و ادب کے فروغ میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ مختلف یونیورسٹیوں میں درس و تدریس کے بعد انھوں نے سلجوق یونیورسٹی میں شعبہ اردو کی بنیاد ڈالی۔ یہاں کا شعبہ اردو زبان و ادب کے ساتھ ساتھ تاریخ تمدن ہند و پاک کے سلسلے میں بھی کافی اہمیت کا حامل ہے۔ اس شعبے سے متعلق محقق اور دانشور اردو زبان کو جتنا برصغیر کا اثاثہ سمجھتے ہیں اتنا ہی خود ترکوں کا بھی سمجھتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ برصغیر ہند و پاک کی اردو زبان ترک وراثت کا ہی حصہ اور ترک تمدن کا اس میں بہت کچھ عمل دخل ہے۔ چوں کہ برصغیر میں غزنویوں، غوریوں اور مغلوں کی قائم کردہ حکومتیں ترک تاریخ و ثقافت کو اپنے جلو میں لیے ہوئے تھیں اور فنون تعمیر، فنون حرب اور فنون لطیفہ سے مالا مال تھیں، اس لیے ترک انھیں دل و جان سے عزیز رکھتے ہیں۔ اردو زبان بھی انھیں میں سے ایک ہے جس میں مغلوں کے خون پسینے کے ساتھ ساتھ ان کی زبان کے الفاظ بھی شامل ہیں۔ (ایضاً، ص 42)

سلجوق یونیورسٹی کی صدر شعبہ اردو ڈاکٹر نورییے بلک ہیں۔ انھوں نے ایم اے اور پی ایچ ڈی انقرہ یونیورسٹی سے کرنے کے بعد پاکستان کا علمی و ادبی دورہ بھی کیا۔ نورییے بلک نے سجاد حیدر یلدرم حیات اور کارنامے کے عنوان سے اپنا تحقیقی مقالہ لکھا۔ اس کے علاوہ اردو اور ترک گرامر کی مشابہتیں، سجاد حیدر یلدرم کے ترکی ادب سے تراجم، اردو کے اولین اخبار اور اردو زبان کی تاریخ اور ترکیات وغیرہ ان کے تحقیقی مضامین ہیں۔

ڈاکٹر درمش بلغور بھی سلجوق یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے وابستہ ہیں۔ انھوں نے انقرہ یونیورسٹی سے ایم اے اور پی ایچ ڈی کی اور نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف موڈرن لینگویجز اسلام آباد سے اردو ڈپلوما کیا۔ مولانا الطاف حسین

حالی حیات وتصنیفات، اقبال اور بانگ درا، 1850 سے 1900 کے دوران ہنداسلامی فکری تحریکات اور شاہ ولی اللہ اردو اور ترکیات وغیرہ ان کے تحقیقی موضوعات ہیں۔ ڈاکٹر خاقان قیومجو اس شعبے کے ایک اور ترک استاذ ہیں۔ انھوں نے اردو ناول نگاری کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی۔ اس کے علاوہ اردو ڈرامے کا ارتقا اور آغا حشر اور غالب کی شاعری پر مضامین بھی لکھے ہیں۔ ڈاکٹر رجب درگن، نورائی اوز ترک اور نورائی اوزنچ بھی اس شعبے سے وابستہ استاذ ہیں۔ ان کے علاوہ ایک پاکستانی استاذ احمد نواز نے بھی اس شعبے میں اپنی خدمات انجام دی ہیں۔

استنبول یونیورسٹی

ترکی میں اردو کا تیسرا اور سب سے بڑا شعبہ استنبول یونیورسٹی میں قائم ہے۔ 1974 سے شعبہ اردو کے قیام کے لیے مسلسل کوششیں ہوتی رہیں۔ اس دوران انقرہ یونیورسٹی سے پاکستانی پروفیسر یہاں آتے رہے۔ اکتوبر 1985 میں پروفیسر غلام حسین ذوالفقار کا تقرر استنبول یونیورسٹی کے اردو چیئر پر ہوا۔ اس وقت یہاں شعبہ اردو کا نام ونشان تک نہیں تھا۔ انھوں نے بڑی جد وجہد کر کے اردو کو اختیاری مضمون کا درجہ دلایا اور طلبا میں دل چسپی پیدا کر کے اردو سیکھنے کی طرف مائل کیا۔ تاہم 1990 میں انھیں پاکستان واپس بلا لیا گیا۔ اس دوران پروفیسر غلام حسین ذوالفقار نے خلیل طوقار کو دریافت کرلیا تھا۔ چناں چہ ان کے جانے کے بعد شعبے کی تمام تر ذمے داری خلیل طوقار کے سر آ گئی۔ 1994 سے اس شعبے میں باقاعدہ داخلہ شروع ہوگیا۔ اس وقت وہ اردو کے اکیلے استاذ تھے۔ اسی درمیان پاکستان سے سید بخاری کو بھیجا گیا مگر انھوں نے اس چیئر کو فضول سمجھ کر پاکستانی وزارت تعلیم کو خط لکھا اور اسے بند کردینے کا مشورہ دیا۔ اس طرح پاکستانی حکومت نے استاذ بھیجنے کا سلسلہ بند کردیا 1996 میں ایک اور ترک استاذ احمد اریوکسل کا تقرر ہوا۔ 1997 میں پاکستانی حکومت نے منصور اکبر کنڈی کو بطور استاذ بھیجا۔ تاہم تین سال بعد وہ بھی پاکستان لوٹ گئے اور پاکستانی حکومت نے یہ چیئر بند کردیا۔ اس کے باوجود استنبول یونیورسٹی کا شعبہ اردو برقرار رہا۔ بلکہ آج ترکی میں اردو کا سب سے بڑا شعبہ استنبول یونیورسٹی کا ہے۔ خلیل طوقار کی سربراہی میں یہ شعبہ اردو زبان وادب اور ہندو پاک اور ترکی دوستی کے فروغ میں کوشاں ہے۔

جلال سوئیدان استنبول یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے وابستہ استاذ ہیں۔ انھوں نے ایم اے کی تعلیم پنجاب یونیورسٹی لاہور سے حاصل کی۔ غالب اور اقبال کے حوالے سے انھوں نے کئی مضامین لکھے۔ اس کے علاوہ اردو کے شاہ کار افسانے، سفرنامے اور مزاحیہ تخلیقات کو ترکی زبان میں انھوں نے منتقل کیا۔ نیز اردو ادبیات پر ترکی زبان میں ان کی کئی کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ ان کے علاوہ زکائی قارداش، آرزو چفت سورین، محمد راشد، خدیجہ گورگون اور اونور قلیچ ایر اسی شعبے سے وابستہ اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ یونیورسٹیوں کے علاوہ انقرہ میں پاکستانی اسکول بھی قائم ہے جہاں اردو کی تعلیم ہوتی ہے۔ تاہم ان میں صرف پاکستانی طلبا ہوتے ہیں۔

خلیل طوقار کے مطابق ترکی میں اردو زبان وادب کی تعلیم کا مقصد اہل اردو اور ترکی کے مابین قدیم ترین اخوت ومحبت اور تہذیبی ولسانی یکسانیت کو نئی سمت پر گامزن کرنا اور ریسرچ اسکالرز کی علمی وادبی سطح پر تربیت کرنا ہے تاکہ وہ اپنی قدیم ترین وراثت سے بخوبی آشنا ہوسکیں۔ ترک طالب علموں میں اردو سیکھنے کی کئی وجوہات ہیں جن میں سب سے اہم برصغیر کی زبان و تہذیب سے ترکوں کی قلبی وابستگی ہے۔ اس کے پس منظر میں ترک اور اہل ہند کی صدیوں پر محیط داستان محبت و عقیدت ہے۔ پہلے پہل ترکوں نے اپنے عہد حکومت میں ہندوستان کو خوب سینچا اور فن تعمیر کا اعلی نمونہ بنادیا۔ انھوں نے یہاں کی زبان وتہذیب میں خود کو ضم کر کے مشترکہ تہذیب کو فروغ دیا۔ پھر جب خلافت کے زمانے میں ترکوں پر مصیبت آن پڑی تو ہندوستانی مسلمانوں نے خلافت تحریک کے ذریعے اپنا تن من دھن سب کچھ نچھاور کردیا۔ اسی ایثار کا نتیجہ ہے کہ ترک اردو زبان وتہذیب کو دل و جان سے عزیز سمجھتے ہیں اور اسے سیکھنا چاہتے ہیں۔ ایک دوسری وجہ یہ ہے کہ ترکی کی یونیورسٹیز میں اردو میں داخلے کے لیے دوسرے سبجیکٹ کی بہ نسبت کم نمبر درکار ہے۔ چناں چہ بعض طلبا اسی بنیاد پر اردو میں داخلہ لے لیتے ہیں۔ بعض طلبا ہندوستانی فلموں سے متاثر ہوکر یہاں کی زبان سیکھنا چاہتے ہیں۔ بہرحال جو بھی وجہ ہو یہ ایک خوش آئند بات ہے کہ تینوں یونیورسٹیز کے شعبہ اردو میں طلبا کی کمی نہیں ہے۔

ترکی میں بی اے کی تعلیم چار سال پر مشتمل ہے۔ پھر ایم اے دو سال جس میں کسی خاص موضوع پر مقالہ لکھنا ہوتا ہے۔ پھر پی ایچ ڈی کے لیے تحقیقی مقالہ لکھنا ہوتا۔ اس طرح ایم اے اور پی ایچ ڈی ملا کر ترکی میں اب تک اردو کے تقریباً پچاس مقالے مختلف موضوعات پر لکھے جاچکے ہیں۔ سودا، غالب، اقبال، فیض، پروین شاکر، جدید اردو شاعری، نذیر احمد، سجاد حیدر یلدرم، پریم چند، منٹو، محمد حسین آزاد، ابوالکلام آزاد، اردو افسانہ، اردو ناول، اردو سفرنامے، تزک جہانگیری، دربار اکبری، تزک بابری اور برصغیر پاک و ہند اور ترکی کی تہذیبی ولسانی مماثلتیں وغیرہ موضوعات پر کام ہوچکے ہیں۔ بیشتر موضوعات میں کسی نہ کسی نہج سے ہندو ترک تہذیب کی ہم آہنگی اور جذبہ دوستی کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مثلاً 'ہندوستان میں ترک تہذیب کے نشان'، 'سجاد حیدر یلدرم کی افسانہ نگاری'، '1850-1900 میں برصغیر میں رونما ہونے والی فکری تحریکیں'، 'مولانا ابوالکلام آزاد اور الہلال کے تناظر میں ترکی اور ترک' اور 'برصغیر پاک و ہند کی اردو فارسی شاعری میں ترکی اور ترک' وغیرہ۔

مذکورہ موضوعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ترکی میں اردو کی جملہ اصناف پر تحقیقی کام ہورہے ہیں۔

غرض کہ ترکی میں اردو زبان وادب کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ سو سال سے زائد عرصے سے اردو کی تعلیم وتدریس ترکی کی یونیورسٹیوں میں دی جارہی ہے اور اخبارات بھی نکالے گئے۔ ترکی میں اردو کی تعلیم محض ایک زبان کی حیثیت سے نہیں دی جاتی بلکہ اس کے پس منظر میں قدیم ترین دوستی اور جذبہ ایثار کی پوری تاریخ ہے جسے ترک بھی فراموش نہیں کرنا چاہتے۔ چوں کہ تاریخی، تہذیبی وثقافتی لحاظ سے ترک اور اہل ہندو پاک ایک دوسرے کے بے حد قریب ہیں اور لسانی اعتبار سے اردو اور ترکی زبانیں ایک دوسرے کے مماثل، نیز رسم الخط کی تبدیلی کے باوجود بے شمار الفاظ، ضرب الامثال اور محاورے مشترک ہیں۔ اسی لیے ترک برصغیر کو اپنا وطن ثانی اور اردو زبان کو اپنا قدیم اور قیمتی اثاثہ مانتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ترکی میں اردو زبان وادب کے فروغ وامکان میں ترک دانشور کوشاں ہیں۔

■

Imteyaz Roomi
Room No: 17, Mahi Hostel, JNU
New Delhi - 110025
Mob.: 9810945177
Email: imteyazrumi@gmail.com

علیم صبا نویدی

نظم جدید میں نظیر کا پرتو

نظیر کو ایک زمانے تک تذکرہ نویسوں نے اوسط درجے کے شعرا میں شمار کیا تھا مگر دور حاضر میں ناقدین نے اسے بلند مقام بخشا ہے۔ بعض مبصرین نے تو اسے شیخ سعدی اور شیکسپیر کا ہم پلہ بھی قرار دیا ہے چونکہ نظیر ہی اپنے دور کا ایک ایسا منفرد شاعر گزرا ہے جس کے ترقی یافتہ شعور نے اپنے عہد کی مروجہ شاعری سے بے نیاز ہو کر اردو نظم گویوں کے لیے ایک نیا راستہ کھول دیا۔ نظم جدید کی جو موجودہ صورت ہے اس کی تشکیل اور تعمیر میں آج بھی نظیر ہی کا دبدبہ ہے۔ نظیر کی علمی حیثیت اور عوامی رجحانات کے پیش نظر یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اس متنوع شعور رکھنے والے کو کس نام سے یاد کریں۔ نظیر ہی اردو شاعری میں ایک مکمل اکائی رکھتا ہے جس نے اپنی زندگی کو مختلف خانوں میں تقسیم کرنے کے باوجود اپنی شخصی زندگی کے اظہار کو ادب سے گریز ہونے نہیں دیا اس نے اپنے ماحول سے، اپنی عوام سے اور ان کی مختلف زبانوں سے پورا پورا انصاف کیا۔ نظیر کی زندگی عوامی زندگی اور اس کی شاعری میں کوئی بے ربطی یا بے سروپائی نہیں ہے۔ تبھی تو ان تمام لوازمات سے بحث کرتے ہوئے اس کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے۔ اس پر جو کچھ بھی سوال اٹھایا جائے اس کا جواب گھوم پھر کر ایک ہی مرکز پر آ کر ختم ہو جاتا ہے اور وہ ہے نظیر کی عوامی اور خالص ہندوستانی شاعری!

نظیر کو صرف اردو شاعر کہنا بڑی غلطی ہے۔ چونکہ اس نے پنجابی، پوربی، برج بھاشا اودھی، فارسی اور ہندی زبانوں کے ان گنت لفظوں اور عبارتوں سے اپنی نظموں کے سنگھاسن پر درخشاں ست رنگ مور پر کی طرح پھیلا دیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ نظیر کا تعلق بولیوں کے متوالوں سے بہت گہرا تھا۔ اس نے نہ صرف ان زبانوں کے الفاظ کا صحیح استعمال کیا ہے بلکہ ان زبانوں کے بولنے والوں کی طرز زندگی، ان کی تہذیب و کلچر، ان کی شخصیت اور کردار کا گہرا مطالعہ بھی کیا ہے۔ نظیر کی شاعری میں دوسرے شعرا کی طرح غیر ملکی ماحول اور غیر ملکی الفاظ اور عناصر نہیں ملتے بلکہ اس کی شاعری خالص ہندوستانی شاعری ہے جس میں ہندوستان کے کلچر اور اس کی آب و ہوا کا مدھ بھرا درشن ہے۔ دنیا کے ساتھ گہرا تعلق پیدا کر کے جتنا تجربہ نظیر کو حاصل ہوا تھا اس سے خود اس کے کئی دوسرے ہم عصر شعرا محروم تھے۔ موسم جس طرح بدلتا رہتا ہے اسی انداز میں نظیر کا شعور بھی بدلتا رہتا ہے۔ موسمی کیفیات کا اثر اس نے براہ راست فطرت سے حاصل کیا ہے۔ کتابوں اور رسالوں کے ذریعے نہیں! اس کی شاعری کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ہر شعبہ زندگی کے انسانوں کے میل ملاپ کی وجہ سے اس میں ہمدردی اور دلچسپی کا مواد جمع ہے۔ نظیر نے بچپن اور لڑکپن کے مزے خوب لوٹے ہیں۔ ہر تہوار اور عید میں تماشائی بن کر اور خود تماشا بن کر زندگی اور زمانے کا لطف اٹھایا ہے۔ جوانی میں جوانی کی پوری بہاریں لوٹی ہیں۔ غرض اس کی نظروں نے لب و رخسار سے لے کر گھر آنگن تک، زمین سے لے کر افق تک سفر کیا ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں چھوٹی موٹی خوشیوں سے مسرور ہو جانا، اور ہر دکھ درد پر رو دینا اور ہر طبقے کے عوام سے بے لوث تعلق و ربط پیدا کر لینا اور خصوصاً سطحی عوام میں مست مگن ہو کر اپنے فکر و فن کو درشاتے رہنا اس بات کا ثبوت پیش کرتے ہیں کہ وہ موجودہ دور کے شعرا کی طرح صرف اپنی پوزیشن کا قائل نہ تھا، اسے نہ صرف مسلمانوں میں مقبولیت حاصل تھی بلکہ ہندوؤں نے بھی اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ شاید اسی کی پیروی کرتے ہوئے ساحر لدھیانوی نے یوں کہا ہے۔

آج ہندوستان کے ہر فنکار کا یہ فرض ہے کہ وہ نظیر کی طرح اپنے آرٹ میں مقامی ماحول کو جگہ دیں اور اپنی مقامی بولیوں کو نہ صرف نظموں میں بلکہ غزلوں میں بھی اجاگر کرتے ہوئے کھوکھلے محاوروں، پسی ہوئی پامال تشبیہات اور بیمار روایات سے دامن بچا کر صحت مند اقدار کو توازن اور توانائی کے ساتھ پیش کریں۔ ورنہ شاعری صرف مشاعروں کے اسٹیج تک اپنی بہاریں دکھا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دم توڑ دے گی۔

فن جو نادار تک نہیں پہنچا
ابھی معیار تک نہیں پہنچا

اس سے قطع نظر اگر اس کی کبر سنی کا جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس نے عیسائیوں اور پسماندوں پر اپنے تمام تجربوں کو مختلف کرداروں کی صورت میں مثلِ مینارۂ نور اپنی شاعری کے درمیان ایستادہ کر دیا جس کی روشنی دور دور تک پہنچتی گئی۔ بڑھاپے میں یا تو شاعر دین کا ہو جاتا ہے یا دنیا کا مگر نظیر کا معاملہ اس سے برعکس ہے۔ غالب اور مومن کی طرح بند کمرے میں رہ کر وہ پیامِ انسانیت دینا نہیں چاہتا تھا بلکہ کھلی فضا میں رہ کر زمین تو زمین مابعدالطبیعیاتی ماحول پر بھی کھری کھری باتیں کہہ جاتا تھا۔ اس کا تعلق دین اور دنیا سے ہم پلہ تھا۔ کسی ایک رئیسِ شہر کا ہو کر اسے رہنا پسند نہیں تھا۔ اسے کاشی بھی پسند ہے اور کعبہ بھی۔ برہمن بھی اسے مرغوب تھے اور مومن بھی وہ پیغمبر اور اولیا کے آستانوں کا بھی جاروب کش اور دیوی دیوتاؤں کا پجاری بھی تو کھل کر اسے دیوالی اور ہولی بھی اتنی ہی دلکش لگتی تھی جتنی عید اور تہوار بھی۔ وہ اقبال کی طرح اپنے ہندی نغموں کو حجازی لے میں نہیں گاتا، اس کی نظموں میں دور از کار علائم اور ابہام کی بھرمار نہیں ہے۔ جو موجودہ نظمِ جدید کو پیچیدہ بنا رہی ہے۔ اس نے سمجھ میں آنے والی مانوس شاعری کی ہے۔ نظیر نے نہ صرف بانگِ درا کے اقبال کا رول ادا کیا ہے بلکہ خود ہنس کر اور دوسروں کو ہنسا کر اکبر الہ آبادی اور کبیر کا پارٹ بھی ادا کیا ہے۔ اس نے انشا کی طرح بسیار گوئی بھی کی ہے مگر غالب اور ذوق کی طرح کسی کی قصیدہ خوانی نہیں کی۔ وہ اپنے قلیل ذریعہ معاش پر قانع تھا۔ اس نے تا عمر کسی امیر کی مدح سرائی کر کے کوئی وظیفہ یا تحفہ حاصل نہیں کیا۔ اس نے خانقاہوں، درویشی آستانوں، سنتوں اور سادھوؤں کے ماحول میں اپنے فکر و فن کی چلہ کشی (کشف) کرتے ہوئے جوگ اور تجوگ کے مراتب حاصل کرتے ہوئے خود غرضیوں او خود ساختہ سماجوں کے پرخچے اڑا دیے ہیں۔ وہ ہمیشہ فقیروں کی دنیا کے سیر تماشوں سے حظ اٹھاتا رہا۔ جس طرح لوگ عربی اور فارسی الفاظ استعمال کر کے مولویانہ اردو لکھ جاتے ہیں۔ اس نے گنواری اردو ریختی لہجے سے لکھ کر اپنے دور کے اسلوب اور طرزِ زبان کا تحفظ کیا ہے۔ بعض نقاد معترض ہیں کہ اس نے گنواری اردو لکھ کر اپنی بے علمی اور نااہلی کا ثبوت دیا ہے مگر جہاں تک میرا خیال ہے کہ ناقدین کا یہ نظریہ بالکل غلط ہے چونکہ نظیر پڑھا لکھا نہ سہی زمانہ ساز آدمی ضرور تھا۔ وہ چاہتا تو اپنے دور کے اساتذۂ فن (غالب اور مومن) کی زبان بھی لکھ سکتا تھا مگر وہ مروجہ غزل کی زبان کو نظر انداز کر کے نظم گوئی کے وسیع موضوعات کے لیے وہی زبان اور لب و لہجہ کو اختیار کیا، جو عوام میں معتبر تھا اگر وہ ایسا نہ کرتا تو اسے نظم میں مجتہد کا درجہ نصیب نہ ہوتا۔ نظیر نے جان بوجھ کر عوام کی زبان میں شاعری کی ہے۔ جو آگے چل کر ترقی پسند فنکاروں نے عوامی زبان کے استحکام اور اس کی تبلیغ کے لیے بیڑا اٹھایا تھا۔

جس طرح غالب خواص کے شاعر ہیں اسی طرح نظیر عوام کے شاعر ہیں۔ نظیر کو ہم غالب، میر، مومن، انیس وغیرہ کا ہم رتبہ سمجھنے پر اس لیے مجبور ہیں کہ یہ شعرا اپنے اپنے فن میں طاق تھے۔ غزل کے میدان میں میر و غالب اور مومن استاد مانے جاتے ہیں تو رزمیہ اور عوامی شاعری میں بھی انھیں استاد کا درجہ حاصل ہے۔

اردو شعری دنیا میں نظیر ہی ایسا واحد شاعر ہے جو بڑی جسارت کے ساتھ اپنی لاابالیوں اور فنی آوارگی کے ساتھ پیش ہوا۔ اگر غالب کے شاگردوں کی طرح نظیر کے بھی شاگرد ہوتے اور غالب کے دیوان کی طرح نظیر کی کلیات کا بھی تجزیاتی انتخاب ہوتا تو نظیر کی کئی لافانی نظمیں قطع و برید کی نذر ہو چکی ہوتیں۔ اس امر سے میری یہ مراد نہیں ہے کہ شاعر کے کلام کا انتخاب نہ ہو۔ غالب کے ساتھ ان کے شاگردوں نے بڑا اچھا سلوک کیا تھا اور بڑی فراخ دلی سے مولانا فضل حق خیرآبادی نے ان کے کلام کا انتخاب کیا تھا۔ یہ بات غالب تک روا ہے مگر نظیر کے ساتھ یہ بات نہ کل روا تھی نہ آج روا ہے کیونکہ نظیر کو شاہوں کی قصیدہ گوئی اور خوش آمد پرستی اور جبہ سائی سے سخت نفرت تھی اور وہ ہمیشہ پسماندہ طبقے کا ہم نوا رہا۔

نظیر کو بعض ترقی پسندوں نے باغی شاعر کہا ہے۔ یہ ان کی سراسر نادانی ہے۔ نظیر کسی 'ازم' کا قائل نہ تھا۔ اس نے اقتضائے وقت کے انداز نظر سے روٹی، کپڑا اور مکان پر بھی کئی خوبصورت عوام پسند نظمیں کہی ہیں۔ مگر ان میں سے کسی موضوع کو اس نے اپنا مقصد نہیں بنایا۔ اس نے ہندو مذہب و دین اسلام کی تمام روایات کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔ موسموں کی تبدیلی، تیراکی، موت و حیات، اخلاق بلکہ یہاں تک کہ ہر چرند پرند، ہر پھول پھل پر بھی اپنے مشاہدات کا ثبوت دیا ہے۔ جس کا آغاز اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ نے کیا تھا۔ اخلاقیات پر اور زمانے کے نشیب و فراز پر اس کی جو نظمیں ہیں وہ شاہکار سمجھی جاتی ہیں۔ ان نظموں میں خارجی عناصر کے ساتھ ساتھ داخلی جذبات و جزئیات کی آمیزش بڑی خوبصورتی سے ہوئی ہے۔

نظیر داخلی نظریے سے زیادہ خارجی نظریات کا حامل تھا۔ ہر درد بھرے مناظر اور حالات سے بھی اس دلچسپی کا مواد فراہم کیا ہے۔ نظیر کی شاعری میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کا کلام اثر انگیز ہے۔ عنوان چاہے کچھ ہو مگر شاعری کو دلچسپ اور دلکش ہونا چاہیے تاکہ قاری کے جذبات میں ہلچل اور روح میں بیداری و بالیدگی پیدا ہو سکے۔ اس معیار پر جو شاعری پوری اترتی ہے وہی حقیقی شاعری ہوتی ہے۔ گو نظیر نے کہیں کہیں فحش گوئی سے بھی کام لیا ہے مگر جعفر زٹلی کی حد تک نہیں۔

مقامی عناصر کو فروغ دینے کے سلسلے میں آج کے شعرا بے نیاز اور بے ضرر ہیں۔ ایک حد تک نظیر کا یہ عوامی رنگ اسمٰعیل میرٹھی، سرور جہان آبادی، حالی، اقبال سے لے کر جوش و مجاز تک سفر کرتا ہوا نظیر آتا ہے۔ غزل میں فراق نے ہندوستانی تہذیب و کلچر کو سمونے کی بڑی کامیاب کوشش کی ہے۔ اشک امرتسری نے بھی ایک حد تک نظیر کی طرح اپنی شاعری کو مرغوب بنانے کی سعی کی تھی مگر افسوس کہ وہ کینسر کے مہلک مرض میں دم توڑ گیا۔

آج ہندوستان کے ہر فنکار کا یہ فرض ہے کہ وہ نظیر کی طرح اپنے آرٹ میں مقامی ماحول کو جگہ دیں اور اپنی مقامی بولیوں کو نہ صرف نظموں میں بلکہ غزلوں میں بھی اجاگر کرتے ہوئے کھوکھلے محاوروں، پسی ہوئی پامال تشبیہات اور بیمار روایات سے دامن بچا کر صحت مند اقدار کو توازن اور توانائی کے ساتھ پیش کریں۔ ورنہ شاعری صرف مشاعروں کے اسٹیج تک اپنی بہاریں دکھا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دم توڑ دے گی۔

■

Aleem Saba Naveedi
No: 266, Triplicane High Road
Chennai-600005
Cell:9176137462

نظیر اکبرآبادی

برج دیش کا سچا عاشق

نعیمہ جعفری پاشا

کھیتوں میں سرسوں پھولی اور شاہراہوں پر بسنتی چندریاں لہرانے لگیں۔ بسنت آگئی۔ بسنت ایک ایسا تہوار ہے جو ہمارے ملک کے عوام میں بلاتفریق مذہب و ملت منایا جاتا ہے۔ اگر ایک طرف مندروں میں بسنت پنچمی کی پوجا کی جاتی ہے تو دوسری طرف حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کی درگاہ پر اجمیر میں اور حضرت نظام الدین اولیا کے مزار پر دہلی میں بسنت چڑھائی جاتی ہے اور یہی بسنت ہمارے دلوں میں ایک ایسے شاعر کی یاد تازہ کرتی ہے جو اس تہوار ہی کی طرح بلاتفریق سب کا شاعر تھا، جو عوام کا شاعر تھا، جو انسانیت کا شاعر تھا، جس کے دل میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، جین، پارسی سب کے لیے یکساں احترام تھا، یکساں خلوص تھا اور اپنے وطن کے لیے محبت تھی۔ یہ شاعر ہے نظیر اکبرآبادی۔ ولی محمد جو عرف عام میں 'میاں جی' اور میاں نظیر کہلاتا تھا، کل کے نقاد جسے شاعروں میں ہی شمار کرنے سے گریز کرتے تھے اور آج کے ناقد جسے کلاسیکی شعری آفاق کا عظیم شاعر مانتے ہیں۔ منفرد، بے مثل اور یکتا۔

بسنت پنچمی کے موقع پر آگرے میں نظیر کے مزار پر ایک شاندار اور باوقار میلہ لگتا ہے جس میں ہر طبقے اور ہر مکتب فکر کے لوگ بلاتفریق مذہب و ملت شریک ہوتے ہیں اور اپنے اپنے انداز میں نظیر کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں، اس نظیر کو جو اردو کا عظیم ترین شاعر ہو یا نہ ہو ہندوستان کا عظیم شاعر ضرور تھا۔ برج دیش کا سچا عاشق، آگرے کا دیوانہ جس کے اپنے وطن کی خامیوں سے بھی پیار تھا، ایسا وطن پرست جس پر۔

خارِ وطن از سنبل و ریحاں خوشتر

کی مثال صادق آتی ہے۔ اسے وطن اور وطن کی ہر شے سے بے اندازہ محبت ہے۔

عاشق کہو اسیر کہو آگرے کا ہے
ملا کہو دبیر کہو، آگرے کا ہے
مفلس کہو فقیر کہو آگرے کا ہے
شاعر کہو نظیر کہو آگرے کا ہے

1934 میں جب نظیر کی صد سالہ برسی منائی گئی تو یہ حقیقت سامنے آئی کہ آگرے کے عاشق، اس عوامی شاعر کی قبر ایک کھلے میدان میں نہایت ہی کسمپرسی کی حالت میں ہے جہاں مویشی چرتے ہیں اور اس شاعر کی اہمیت سے ناواقف لوگ قبر کی بے حرمتی کرتے ہیں۔ کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ آگرے کے باذوق اور حساس لوگوں نے اس ناقدری کو محسوس کیا اور کچھ کر گزرنے کے جذبے کا اظہار اور کوشش وقتاً فوقتاً ہوتی رہی۔

نتیجے کے طور پر 1934 میں آگرے کے چند ادیبوں، شاعروں اور معزز حضرات کی ایک نشست علامہ میکش اکبرآبادی کے دولت کدے واقع میوہ کٹرا منعقد ہوئی جس میں اس وقت آگرے میں موجود اردو اور ہندی کے قلم کاروں نے متفقہ طور پر یہ طے کیا کہ نظیر اکبرآبادی آگرے کے ایک ایسے مقبول و معروف عوامی شاعر تھے جن پر آگرہ اور آگرے والوں کو جتنا بھی فخر ہو کم ہے نیز آگرے والوں کا یہ فرض ہے کہ تیزی سے بدلتے ہوئے اس منظرنامے میں نظیر اور ان کے کلام کو محفوظ اور سدا بہار بنائے رکھنے کے لیے کچھ ایسا انتظام کیا جائے کہ آنے والی نسلیں بھی اس عظیم عوامی شاعر کو یاد رکھیں جو نہ صرف آگرے کا بلکہ پورے ہندوستان کا قومی شاعر کہلائے جانے کا مستحق ہے۔ اس نشست میں علامہ میکش اکبرآبادی کے علاوہ ل احمد (لطیف الدین احمد اکبرآبادی) ڈاکٹر گروکھ رام ٹنڈن، مغیث الدین فریدی اور بہت سے ہندی کے کوی اور محقق شامل ہوئے۔ اس نشست میں یہ طے کیا گیا کہ ایک بزم نظیر قائم کی جائے جو ہر سال بسنت پنچمی کے موقعے پر میاں نظیر کے مزار پر ایک عوامی میلے کا انعقاد کرے۔ بسنت پنچمی کا دن اس لیے چنا گیا کہ نظیر کو اس تہوار سے خاص رغبت تھی نیز یہ تہوار بلاتفریق مذہب آگرے کے واسی ذوق و شوق سے مناتے ہیں۔ چنانچہ بزم نظیر قائم ہوئی۔ میکش اکبرآبادی کو بالاتفاق رائے اس کا صدر منتخب کیا گیا اور میوہ کٹرے میں واقع ان کی حویلی کو بزم کا صدر دفتر بنایا گیا۔ جنرل سکریٹری کے عہدے کے لیے غالباً ڈاکٹر گروکھ رام ٹنڈن مقرر ہوئے۔ ممبران میں ل احمد کے علاوہ ہندی کے کئی نامور شاعر اور محقق شامل تھے جو اس وقت آگرے میں موجود تھے۔ انھیں حضرات کی کوششوں سے اگلے سال بسنت پنچمی کے موقعے پر پہلا نظیر میلہ نظیر کے مزار کے گرد پھیلے ہوئے

میدان میں منعقد کیا گیا اور اس وقت سے لے کر آج تک پابندی سے اس میلے کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ ممبران کی تعداد بڑھتی گئی۔ نئے لوگ شامل ہوتے گئے۔ عہدے داران کی ذمے داریاں بھی بدلتی رہیں لیکن علامہ میکش اکبرآبادی 1989 تک اس بزم کے صدر کے عہدے سے منسلک رہے یعنی اپنے انتقال سے صرف دو سال پہلے تک جب تک کہ وہ جسمانی طور پر فعال رہے، ان کے علاوہ دیوی پرساد شرما، راجندر رگھوونشی، جتندر رگھوونشی، معین فریدی، شمیم مرزا، رام بالو سنگھ راٹھور وغیرہ کی فہرست بہت طویل ہے۔ 77-1976 تک بزم نظیر کا صدر دفتر بھی میوہ کٹرہ ہی رہا پھر تبدیل ہوگیا۔ پرانے لوگ رخصت ہوئے نئے ادب دوست جواں مرد شامل ہوئے۔ بحمداللہ بزم نظیر اب بھی قائم ہے اور بسنت کے موقعے پر نظیر میلے کا انعقاد بھی پورے جوش وخروش سے ہوتا ہے۔ لوگ بسنتی پگڑیاں، ٹوپیاں اور پٹکے پہن کر میلے میں شرکت کرتے ہیں۔ نظیر کے مزار پر نظیر کے کلام کے حافظ اور مداح اپنے خاص انداز میں ان کا کلام گا کر اور تحت میں پڑھ کر عوام کو سناتے ہیں۔ راگ رنگ کی محفلیں سجتی ہیں۔ عمائدین شہر نظیر کے مزار کی گل پوشی کرتے ہیں اور طرح طرح کے پھیری والے میلے کی رونق بڑھاتے ہیں۔

اس تمام قدر ومنزلت کے باوجود نظیر کی قبر کسمپرسی کی حالت میں تھی۔ میلے کے ایام کے علاوہ باقی سال اس کی دیکھ بھال یا صفائی کا کوئی انتظام نہیں تھا، کیونکہ میونسپلٹی کا کام تھا اور سرکاری زمین پر دخل اندازی کا جوکھم عوام اٹھانے کے لیے تیار نہیں تھے، حالانکہ بزم نظیر کے ارکان نے کئی مرتبہ انتظامیہ کو اس کی طرف متوجہ کیا۔ آخر 1978 میں آگرے کے سابق منتظم اعلیٰ (پرشاسک) شری جیوتی سروپ گپتا کی کوششوں سے نظیر کے مزار کی تعمیر نو عمل میں آئی۔ میدان کو چہار دیواری سے گھیر کر پارک کی شکل دی گئی جو نظیر پارک کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ہیمنت لوانیہ اپنے ایک مضمون (لیکھ) میں اس میلے کی اہمیت کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

''جن کوی نظیر کا آج نہ تو جنم دوس ہے اور نہ ہی ان کی پنہ تتھی۔ اس کے باوجود آج بسنت پنچمی، تاج گنج میں استھت ان کے مزار پر میلا لگتا ہے۔ صحیح معنی میں آج کا دن سامپرادایک ایکتا اور اکھنڈتا کا دوس ہے جس کے لیے میاں نظیر جیون بھر کوشش کرتے رہے۔'' (حوالہ 1972) کا ہندی ایک مقامی اخبار)

آلوک شرما اپنے ایک لیکھ میں لکھتے ہیں:

''نظیر صحیح معنوں میں ساماجک چیتنا کے اگر دوت جن کوی تھے۔ آگرے کا جن جیون، جمنا میا، میلے ٹھیلے، عید، دیوالی، دشہرہ، ہولی، ان کی جن کویتا کا وشے ہیں۔ ہر استھانیہ گھٹنا اور پروانہیں الاس سے بھرا قلم چلانے پر مجبور کردیتا ہے۔''

یہ تھیں بزم نظیر کے چند ممبران کی آرا جن کا اظہار نظیر میلے کے موقعے پر وقتاً فوقتاً تقاریر اور مضامین کے ذریعے کیا گیا۔

اردو کی کلاسیکی شاعری کا جو قابل لحاظ سرمایہ ہے وہ عموماً غیر ملکی امثال سے بھرا ہوا ہے۔ ہر صفحے پر دجلہ و فرات، نیل لہریں مارتا نظر آتا ہے، ہر باغ میں سرو وصنوبر کے سائے ملیں گے اور ان پر بلبلیں اور قمریاں نغمہ خواں سنائی دیں گی۔ قیس ولیلیٰ اور شیریں وفرہاد کی داستانِ عشق کا بیان اور حوالے ملیں گے، سمرقند و بخارا کے تذکرے ملیں گے لیکن نظیر اس ساری بھیڑ سے بالکل الگ اور منفرد نظر آتے ہیں۔ ان کا ذہن سمرقند و بخارا کے بجائے متھرا، برج اور بنارس کی سیر کرتا ہے۔ ان کی آنکھیں دجلہ و جیحوں کی جگہ گنگا اور جمنا کے نرمل جل سے سیراب ہوتی ہیں۔ ان کے باغات میں غیر ملکی درختوں کے بجائے:

''پیلو، پاکھر، نرما، سنبھل، کپچا، سنبھالو، بڑ، پیپل'' کے سائے نظر آتے ہیں۔ ان کے گلشن کی کیاریاں لالہ و گل کے رنگ و بو سے ہی مزین نہیں ہیں بلکہ دیسی پھولوں کی مہک سے بھی معطر ہیں۔

راہبیل، تگیر اور مولسری، مدمالت، بیلا اور سمن
دوپہری، گیندا، گل لالہ، نافرماں، کرنا، بان مدن
جائی، جوہی، شبو، نرگس، سنگار، چنبیلی، سیم بدن
کیا پھول گلابی گل طرہ، کیا ڈیلا، بانسا، سکھ درسن

گرمی کا موسم، پھر آگرے کی جھلسا دینے والی گرمی، کہ ہر شخص پریشان ہے۔ کسی جا، کسی کل چین نہیں ہے۔ نظیر کے الفاظ میں۔

ایدھر تو پسینوں سے پڑی جھگنے کھائیں
گرمی سے ادھر میل کی کچھ چیونٹیاں کاٹیں
ننگا جو بدن رکھیے تو پھر مکھیاں چاٹیں
کپڑا جو پہنیے تو پسینے اسے آٹیں

ایسے جاں کاہ موسم میں 'ککڑی لوککڑی' آج کے برف، ریفری جیٹر اور آئس کریم کے دور میں بھی خوش آئند لگتی ہے نہ کہ آج سے پونے دو سو سال پہلے جب کہ عوام کے لیے برف کا حصول بھی آسان نہ تھا، کتنی دلکش لگتی ہوگی اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جنھوں نے اس ماحول میں آنکھ کھولی ہو اور اسے قریب سے دیکھا اور برتا ہو۔ پھر نظیر سے زیادہ اس کا مزہ کون جان سکتا ہے۔

نظم:

نے چین کے پرے کی اور نے ورے کی ککڑی
دکھن کی اور نہ ہرگز اس سے پرے کی ککڑی
کیا خوب نرم و نازک اس آگرے کی ککڑی
اور جس میں خاص کافر اسکندرے کی ککڑی
کیا پیاری پیاری میٹھی اور پتلی پتلیاں ہیں
گنے کی پوریاں ہیں، ریشم کی تکلیاں ہیں
فرہاد کی نگاہیں شیریں کی ہنسلیاں ہیں
مجنوں کی سرد آہیں لیلیٰ کی انگلیاں ہیں

***

کوئی ہے زرد مائل کوئی ہری بھری ہے
پکھراج منفعل ہے پنے کو تھرتھری ہے
ٹیڑھی ہے سو تو چوڑی وہ ہیر کی ہری ہے
سیدھی ہے سو وہ یارو رانجھے کی بانسری ہے

اس نظم میں دیسی تشبیہات دیکھنے کے قابل ہیں۔ لیلیٰ مجنوں اور شیریں فرہاد کے ساتھ ہیر اور رانجھا بھی موجود ہیں۔ زمرد و الماس کے بجائے پکھراج اور پنے سے تشبیہ دی گئی ہے، کیونکہ یہ اسی دیس کی پیداوار اور نام ہیں جس میں نظیر سانس لیتے ہیں۔ ہیر کی ہندوستانیت کے ساتھ ہری چوڑی کا تصور اتنا ہی حقیقت پسندانہ ہے جتنا رانجھے کے ساتھ بانسری کا تصور اور پھر تشبیہات کی ندرت دیکھیے، تازگی سادگی اور بے ساختگی کے ساتھ اپنے

دیش کی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو بھی ہے۔ عرصے تک آگرے کی ککڑی فروشوں کی زبان پر، مجنوں کی سرد آہیں، لیلیٰ کی انگلیاں ہیں کا وردرہا کرتا تھا۔

محلّہ تاج گنج سے میاں نظیر اپنے ٹٹو پر بیٹھ کر لڑکے پڑھانے شہر آگرہ جایا کرتے تھے۔ راہ میں مختلف پیشے والے اور خوانچے فروش اپنی اپنی صدائیں لکھوا کے لے جاتے۔ (شہباز، زندگانی بے نظیر) تل کے لڈو کے خوانچے والا آیا ''میاں جی سب کو نظمیں کہہ کہہ کر دیتے ہو۔ ہمیں بھی کچھ کہہ کے دو تو مانیں'' اور نظیر نے فی البدیہہ نظم کہہ کے دے دی:

رکھ خوانچے کو سر پہ پکار یوں پکارا
بادام بھونا چابو یا کرکرا چھوہارا
جاڑا لگے تو اس کا کرتا ہوں میں اجارا
جس کا کلیجہ یارو سردی نے ہوے مارا
نو دام کے وہ مجھ سے لے جائے تل کے لڈو

نظیر کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ خواص نے انھیں صف اوّل کے شاعروں میں جگہ دینے میں کتنا ہی تامل کیا ہو لیکن عوام نے انھیں ہمیشہ سر چڑھا کے لیا اور نہ صرف خود ان کے دور میں 'میاں نظیر' عوام کے ہر دلعزیز شاعر تھے بلکہ آج بھی ان کی مقبولیت نہ صرف مسلم ہے بلکہ آج کے دور میں جب مذہبی رواداری اور سیکولرزم کے نفاذ کی ضرورت سب سے زیادہ محسوس کی جارہی ہے، نظیر کی اہمیت اور ان کی شاعری کی قدر و قیمت میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔

چاہے عید، شب برات ہو، ہولی، دیوالی ہو، جنم اشٹمی ہو، راکھی ہو، بسنت پنچمی ہو، بلدیو جی کا میلہ ہو یا شیو اور درگا دیوی سے متعلق تہوار ہوں، گرمی ہو، سردی ہو، برسات ہو، امس ہو، بچپن، جوانی اور بڑھاپے کے تاثرات ہوں، ہر موقع پر ہر تقریب میں ہر کیفیت میں نظیر ہمیں یاد آتے ہیں، ان کی نظمیں یاد آتی ہیں کیونکہ ان سارے میلوں، تہواروں اور موقعوں پر نظیر کی حیثیت محض ساحل سے تماشا دیکھنے والے کی نہیں بلکہ تیراک کی ہوتی ہے۔ وہ خود اس طوفانِ رنگ و بو میں شریک ہیں۔ خوشیوں کا لطف بھی اٹھا رہے ہیں اور مصیبتوں کو بھی جھیل رہے ہیں۔ ان کی نظر ہر باریک سے باریک اور چھوٹی سے چھوٹی شے پر پڑتی ہے اور ان کا قوی مشاہدہ اسے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ نظیر پیشے سے معلم تھے۔ ان کے شاگردوں میں مسلم امرا اور ہندو ساہو کاروں کے لڑکے بھی تھے لیکن جب وہ اپنے گھر کے باہر نیم کے پیڑ کے نیچے درس دیتے نظر آتے ہیں تو ان کے شاگردوں میں معاشی طور پر کمزور لڑکوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہوگی

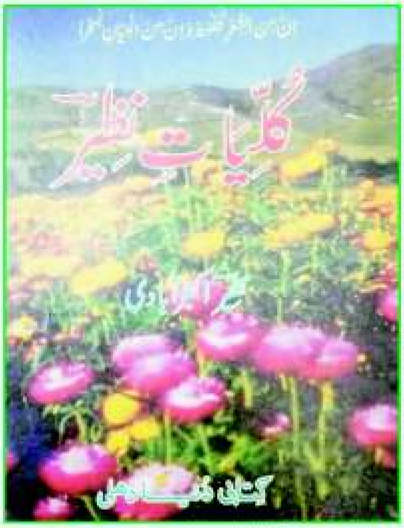

کیونکہ اپنی ایک نظم مفلسی میں وہ کہتے ہیں۔

وہ جو غریب غربا کے لڑکے پڑھاتے ہیں
ان کی تو عمر بھر نہیں جاتی ہے مفلسی

اس شعر سے واضح ہوتا ہے کہ نظیر کا تعلق بھی اسی طبقے سے تھا جس میں ہندوستان کی اکثریتی آبادی سانس لیتی ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ سردی کے موسم میں ٹھنڈ کیسی تکلیف دہ ہوتی ہے جب عیش و عشرت کے سامان مہیا نہیں ہوتے۔ جب 'تھر تھر کا اکھاڑا' ہوتا ہے اور 'بتیسی بجتی ہے' انھیں معلوم ہے کہ برسات کا موسم صرف حسن و دلکشی کے خزانے ہی نہیں لٹاتا جہاں امیر اپنے اونچے محلوں میں برسات کا نظارہ کرتے ہیں وہیں متوسط اور غریب طبقے کے لیے کیسا جان لیوا ہوتا ہے جن کے مکان پرانے ہو چکے ہیں یا ناپختہ ہیں۔ بارش کی ہر بوند انھیں بہاروں کی پیامبر نظر آنے کے بجائے اپنی تباہی کی قاصد نظر آتی ہے۔ ملاحظہ ہو نظم:

جھڑیوں کا اس طرح کا دیا آکے جھڑ لگا
سنیے جدھر اُدھر کو دھڑا کے کی ہے صدا
کوئی پکارے ہے مرا دروازہ گر چلا
کوئی کہے ہے ہائے کہوں تم سے اب میں کیا
تم در کو جھینکتے ہو مرا گھر پھسل پڑا

***

باراں جب آکے پختہ مکاں کے تئیں ہلائے
کچا مکاں پھر اس کی بھلا کیونکہ تاب لائے
ہر جھونپڑے میں شور ہے ہر گھر میں وائے وائے
کہتے ہیں یارو دوڑیو جلدی سے ہائے ہائے
پاکھے بچھیت سو گئے چھپر پھسل پڑا

ایک اور نظم میں یہی مضمون ان الفاظ میں باندھا ہے:

کوئی پکارتا ہے لو یہ مکان ٹپکا
گرتی ہے چھت کی مٹی اور سائبان ٹپکا

چھلنی ہوئی اٹاری، کوٹھا ندان ٹپکا
باقی تھا اک اسارا سو وہ بھی آن ٹپکا
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

اپنے دیس کی محبت ان کی رگ رگ میں بسی ہے اور یہاں کے ماحول کا وہ خود ایک حصہ ہیں۔ ہر جگہ، ہر قدم پر انھیں اپنی شاعری کے لیے موضوعات بکھرے نظر آتے ہیں جن کے بیان کے لیے زبان اور الفاظ کی ان کے یہاں کبھی کمی نہیں ہوتی۔ میلے ٹھیلے اور تہواروں پر ان کی رونق اور چہل پہل کے وہ دل سے شیدائی ہیں۔ عید اور شب برات پر ان کی ایک ایک نظم ہے جب کہ ہولی پر ان کی نو نظمیں ہیں۔ ہولی کا رنگین تہوار، اس کی رنگ فشانی، رقص و سرود، چہلیں اور شوخیاں انھیں سب سے زیادہ لبھاتی ہیں اور ان کی توجہ کھینچ کر ان کے قلم کو کاغذ پر رنگینیاں بکھیرنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔

نظم

جب پھاگن رنگ جھمکتے ہوں، تب دیکھ بہاریں ہولی کی
اور دف کے شور کھڑکتے ہوں، تب دیکھ بہاریں ہولی کی
پریوں کے رنگ دمکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
خم، شیشے، جام جھلکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
محبوب نشے میں چھکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

ایک اور مخمس میں ہولی کا بیان کچھ اس طرح ہے۔

ہر جاگہ تھالی گلالوں کے خوش رنگت کی گلکاری ہے
اور ڈھیر عبیروں کے لاگے اور عشرت کی تیاری ہے
ہیں راگ بہاریں دکھلاتے اور رنگ بھری پچکاری ہے
منہ سرخی سے گلنار ہوئے تن کیسر کی سی کیاری ہے
یہ روپ جھمکتا دکھلایا یہ رنگ دکھایا ہولی نے

بحر اور قافیوں کی نغمگی اور الفاظ کا انتخاب اپنی انتہائی حدوں کو چھو رہا ہے۔ جس کی مدد سے ہولی میں ناچنے والوں کے کھِلتے جسم اور گلنار چہرے نظروں کے سامنے آجاتے ہیں۔ صوتی اثرات ایسے کہ ہولی کے ڈھول اور تاشے بجتے سنائی دیتے ہیں۔ دیوالی کے دیوں کی جگمگاہٹیں ہیں۔ ہر گھر خوشی سے معمور ہے۔ دوکانیں سجی ہوئی ہیں، حلوائی آواز لگا لگا کر مٹھائیاں بیچ رہے ہیں۔ کھلونے والے کی دوکان پر اس سے زیادہ ہنگامہ ہے اور سب سے زیادہ دھوم جوئے بازوں کی ہے۔ یہ سارا ہنگامہ صرف کاغذ تک محدود نہیں رہتا بلکہ نظیر کی جزئیات نگاری ان کے زور تخیل اور زور بیان کے سہارے ان مناظر کو ہماری آنکھوں کے سامنے لا کھڑا کرتی ہے۔ یہ تماشے ہم تصور کی نظر سے زندہ ہوتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں، یہ صدائیں ہمیں اپنے کانوں سے سنائی دیتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔

مٹھائیوں کی دکانیں لگا کے حلوائی
پکارتے ہیں کہ لالہ دیوالی ہے آئی
بتاشے لے کوئی برفی کسی نے تلوائی
کھلونے والوں کی ان سے زیادہ بن آئی
کہ گویا ان کے واں راج آ گیا دیوالی کا

جوئے بازوں کا نقشہ ملاحظہ ہو۔

کسی نے گھر کی حویلی گرو رکھا ہاری
جو کچھ تھی جنس میسر بنا بنا ہاری
کسی نے چیز کسی کی چرا چھپا ہاری
کسی نے گٹھری پڑوسی کی اپنی لا ہاری
یہ ہار جیت کا چرچا پڑا دیوالی کا

ہولی اور دیوالی کی دھوم دیکھنے کے بعد لگے ہاتھ 'بلدیو جی کے میلے' کی بھی سیر کر لی جائے۔

شہری، قصباتی اور گنواروں کا ہجوم ہے اور ہجوم بھی ایسا کہ تھالی پھینکو تو سروں پر گرے۔ میلے کی رونق طرح طرح کی دوکانوں اور سودے والوں نے دوبالا کر رکھی ہے۔ ایک طرف بساطی اپنی دوکان لگائے بیٹھے ہیں تو دوسری طرف زیورات کی خریداری ہے۔ ایک طرف خورد ونوش اور چاٹ کے خوانچے ہیں تو کسی طرح کھلونوں کے ڈھیر ہیں، کوئی کمہارن سے بھاؤ تاؤ کر رہا ہے تو کوئی پھل والی کنجڑن سے لڑ رہا ہے۔ غرض ایک ہنگامہ برپا ہے۔ سچ مچ کا جیتا جاگتا میلا جس میں مندر کی گھنٹیوں کی آواز بھی ہے اور اشلوکوں کے بول بھی کان میں پڑ رہے ہیں۔ حسن والوں کا بھی جمگھٹا ہے، راز و نیاز، عہد و پیمان ہیں۔ ایسی بھیڑ میں کسی کی پگڑی اتر جاتی ہے اور کسی کی جیب کٹ جاتی ہے، کسی کی دوکان لٹ جاتی ہے اور کوئی اچکا کسی کی گٹھری چرا کر بھاگ جاتا ہے۔

خلق آتی ہے سب جڑی جیڑی
چیز رکھے ہیں باندھ کر گٹھری
کوئی دوڑے ہے ہاتھ لے لکڑی
دوڑیو چور لے چلا گٹھری
جیب کتری کہیں گئی پکڑی
کہیں موٹی دوکان اور ہٹری
چور کی تاک سے کہیں پکڑی
سو تماشے ہنسی، خوشی پھکڑی
رنگ ہے، روپ ہے، جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلہ ہے

حسن والوں کا رنگ سب سے الگ اور نرالا ہے۔

کوئی چنچل چلے ہے ٹھسکی چال
کچھ وہ پتلی کمر وہ لمبے بال
آنکھوں میں حسن کے نشے وہ لال
مصری ماکھن کا ہاتھوں اوپر تھال
کچھ وہ پوشاک کچھ وہ حسن و جمال
مالنوں سے زیادہ ان کا کمال
ڈال دیں ہار کا گلے میں جال
بڑھی ہو کر لیں صاف دل کو نکال

ایک طرف اردو غزل میں سراپا نگاری میں مبالغہ آرائی حد سے بڑھی ہوئی ہے وہاں نظیر کی یہ سادگی اور حقیقت پسندی قابلِ لحاظ ہے کمر کو بال سے تشبیہ دینے یا کالعدم ثابت کرنے کے بجائے صرف پتلی کمر کہنے پر اکتفا کرتے ہیں اور بالوں کو درازیِ شبِ ہجراں کا استعارہ دینے کے بجائے صرف لمبے بال کہہ دیا لیکن اس سادگی میں جو حسن ہے وہ اس تصنع اور مبالغے میں کہاں!

نظیر کی وہ نظمیں جو 'جنم کنہیا جی'، درگا درشن، ہر کی تعریف اور مہادیو جی کے بیاہ کی روایتوں پر مشتمل ہیں، ہمارے ادب کا ایسا سرمایہ ہیں جس کا اطلاق اردو اور ہندی دونوں زبانوں کے شعری ادب پر ہوتا ہے اگر وہ قواعد کی رو سے اردو سے متعلق ہیں تو ہندی اور برج بھاشا کے الفاظ کی کثرت اور موضوع کے اعتبار سے ہندی سے قریب ہیں۔ نظیر شاید وہ واحد کلاسیکی شاعر ہیں جن کے یہاں ہمیں اردو اور ہندی کے بیچ کھڑی دیوار گرتی نظر آتی ہے اور دونوں زبانیں شیر و شکر ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں کیونکہ یہاں عربی وفارسی کے الفاظ بھی موجود ہیں۔ موضوع کے اعتبار سے بھی یہ منظومات محض کسی کی خوشنودی یا دل دہی کے لیے کہی ہوئی نہیں ہیں اور نہ ہی ہندی الفاظ کے استعمال سے ان میں ہندوانہ رنگ پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے بلکہ ان کے جذبے میں خلوص ہے، یگانگت ہے۔ اپنے موضوع کے تئیں نظیر پوری طرح مخلص نظر آتے ہیں اور ہر موضوع کو انھوں نے ڈوب کے برتا ہے جو نہ صرف ان کے دور کے ہندو مسلم اتحاد کی طرف اشارہ کرتا ہے بلکہ آج کے دور کے لیے بھی مشعلِ راہ ہے۔

نظیر نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ عام آدمی سخت مشکلات کے دور میں بھی کس طرح زندہ رہنا سیکھ لیتا ہے اور پل بھر کو مسکرا کے سارے دکھ بھول جاتا ہے۔ نظیر کی شاعری اپنے عہد کے زوال پذیر معاشرے کے عیب اور ثواب کا ایسا اظہار ہے کہ جس کا بیان شاید کسی تاریخ کی کتاب میں بھی نہ ملے۔ تہذیب کے زوال کے ساتھ معاشرے میں جو عیوب پیدا ہوجاتے ہیں مثلاً طوائف گردی، بے شرمی، گالی گلوج کا زبان زد ہونا، شریفوں کی بدحالی اور رذیلوں کا عروج ، غرض کون سا نکتہ ہے جو نظیر کے قلم کی گرفت سے چھوٹا ہو۔

کرشن جی جو نظیر کو بہت ہی محبوب ہیں، ان کی شان میں نظیر کے جذبات قابلِ لحاظ ہیں نیز کرشن جی کے جتنے ناموں کا ذکر نظیر کے اس ایک بند میں ملتا ہے اس کی مثال غالباً ہندی ادب میں بھی نظیر سے پہلے کسی کوی کے ہاں ملنی مشکل ہے۔

نظم کا بند

تعریف کروں میں اب کیا کیا اس مرلی دھرن بجیا کی
نت سیوا کنج پھریا کی اور بن بن گوؤ چریا کی
گوپال، بہاری، بنواری، دکھ ہرنا، مہر کریا کی
گردھاری، سندو، شیا، برن اور پنڈر جوگی بھیا کی
یہ لیلا ہے اس نند لالن، من موہن، جسمت چھیا کی
رکھ دھیان سنو، ڈنڈوت کرو، جے بولو کرشن کنھیا کی

ایک طرف نظیر کا شہر آشوب پڑھیے جہاں چھتیس پیشے والوں کا کاروبار بند ہو چکا ہے۔ زوال پذیر معیشت کا دردناک نقشہ پیش کیا گیا ہے ، جہاں امیر اور غریب یکساں طور پر متاثر اور بدحال نظر آتے ہیں اور دوسری طرف یہ تہوار میلے ٹھیلے، تیراکی، پتنگ بازی، کبوتر بازی، مرغ وبٹیر بازی، ریچھ کے بچے اور گلہری کے بچے کے تماشے ہیں۔ نظیر نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ عام آدمی سخت مشکلات کے دور میں بھی کس طرح زندہ رہنا سیکھ لیتا ہے اور پل بھر کو مسکرا کے سارے دکھ بھول جاتا ہے۔ نظیر کی شاعری اپنے عہد کے زوال پذیر معاشرے کے عیب اور ثواب کا ایسا اظہار ہے کہ جس کا بیان شاید کسی تاریخ کی کتاب میں بھی نہ ملے۔ تہذیب کے زوال کے ساتھ معاشرے میں جو عیوب پیدا ہوجاتے ہیں مثلاً طوائف گردی، بے شرمی، گالی گلوج کا زبان زد ہونا، شریفوں کی بدحالی اور رذیلوں کا عروج ، غرض کون سا نکتہ ہے جو نظیر کے قلم کی گرفت سے چھوٹا ہو۔ لیکن اس کے باوجود نظیر کو آگرہ بہت عزیز ہے اور وہ اس کی بقا اور خوش حالی کے لیے دعا گو ہیں۔

شہرِ سخن میں اب تو ملا ہے مجھے مکان
کیونکہ نہ اپنے شہر کی خوبی کروں بیان
دیکھی ہیں آگرے میں بہت ہم نے خوبیاں
ہر وقت اس میں شاد رہے ہیں جہاں تہاں
رکھیو الٰہی اس کو تو آباد جاوداں

■

Dr. Nayeema Jafri Pasha
141, Ground Floor
Pocket 2, Jasola
New Delhi - 110025
Mob.:9911802189

مصباح احمد صدیقی

پروفیسر نورالحسن نقوی

بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم (وفات: 16/اگست 1961) نے سید محمود ابن سرسید احمد خاں کی وفات پر لکھا تھا:

''اس میں شک نہیں کہ موت اٹل ہے اور سب کو آنے والی ہے اور اس لیے کوئی ڈر کی چیز نہیں؛ لیکن ایسی موت جو بے وقت ہو، خصوصاً جب کہ اس کا وار ایسے شخص پر پڑے جو اپنی خوبیوں اور لیاقتوں میں عدیم النظیر ہو، اور خاص کر جب کہ یہ سانحہ ایسی قوم میں واقع ہو جہاں پہلے سے ہی قحط الرجال ہے تو ایسی موت غضب ہے اور قیامت ہے۔'' (چند ہم عصر،ص 20)

بلاشبہ موت سے کس کو رستگاری ہے؛ لیکن اپنے جانے والوں کا صدمہ بھی انسانی فطرت ہے اور یہ صدمہ اس وقت اور بھی جاں گسل ہو جاتا ہے جب کوئی جانے والا ایسا شخص ہو جس کی نظیر یا مثال مشکل ہو اور اس کا نعم البدل بھی نہ ہو تو اس کے چلے جانے کا غم کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے۔

محترم پروفیسر نورالحسن نقوی ایک طویل عرصہ سے بیمار تھے اور 25/جنوری 2006 بروز بدھ، نئی دہلی کے گنگا رام اسپتال میں اپنے تمام چاہنے والوں کو سوگوار چھوڑ کر رخصت ہو گئے۔

پروفیسر نورالحسن نقوی امروہہ کے ذی علم و جاہت گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ اس گھرانے میں بہت سے نامور علما، اطبا اور شعرا ہوئے ہیں جن میں مولانا حکیم محمد حسن مفسر قرآن (وفات: 19/رمضان المبارک 1323ھ/ 1905 بروز جمعہ) اپنے وقت کے اکابر علماء کرام میں تھے اور بڑے کثیر التصانیف تھے۔ مؤرخ امروہہ محمود احمد عباسی نے آپ کی سولہ تصانیف کا ذکر کیا ہے۔ تصانیف میں غایۃ البرہان معروف بہ 'تفسیر شاہی' بڑی اہم و معرکۃ الآرا تصنیف ہے۔ دوسرے حکیم مولوی عبدالصمد بڑے حاذق اور نامور طبیب ہوئے جن کے لائق و فائق فرزند مولوی ابوالحسن ساکت امروہوی اردو کے مشاہیر اور قادر الکلام شعرا میں سے تھے۔ ان ہی میں حضرت مولانا حافظ زاہد حسن (وفات: 1371ھ) حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی (وفات: 18/اکتوبر 1899) کے خاص و مقرب مریدین میں سے تھے۔ ان ہی کے لائق فرزند مولانا حامد حسن مرحوم (وفات 18/دسمبر 2003) سابق صدر مہتمم مدرسہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد امروہہ اور حضرت مولانا طاہر حسن (وفات: 11/اگست 2004) شیخ الحدیث مدرسہ ہذا امروہہ کے اکابر علماء کرام میں سے تھے۔ مولانا حامد حسن صاحب مرحوم کے صاحب زادگان آج بھی علمی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ خصوصاً استاذ گرامی محترم پروفیسر سید محمد طارق حسن سابق صدر شعبۂ فارسی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علم کا روشن منارہ ہیں۔ آپ ادبیات فارسی کی تفہیم و تدریس میں خاص ملکہ رکھتے ہیں۔ آپ کے چھوٹے بھائی پروفیسر سید محمد ہاشم سابق چیئرمین شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی کی بھی معتد بہ علمی و ادبی خدمات ہیں۔

پروفیسر نورالحسن نقوی کا سلسلۂ نسب اپنے مؤرث اعلیٰ شیخ داؤد بڑگہ سے اس طرح متصل ہوتا ہے:

''نورالحسن بن عبدالحکیم بن حسین علی بن اکبر علی بن سید حسن بن رستم علی بن محمد حسن عرف میاں موتی بن فیض محمد بن مسعود بن حبیب اللہ بن شیخ مکھن بن شیخ منجھو بن شیخ داؤد بڑگہ۔'' (بحوالہ تحقیق الانساب 318)

اسی نامور علما و فضلا کے گھرانے کی ایک شمع فروزاں تھے پروفیسر نورالحسن نقوی، اللہ کے اس اٹل فیصلہ موت نے انھیں رہتی دنیا تک کے لیے خاموش کر دیا؛ لیکن اس روشن شمع کے ذریعے کیا گیا اجالا کبھی ختم نہیں ہوگا۔ پروفیسر نورالحسن نقوی ایک ذہین، ہوشیار، اچھی علمی نظر رکھنے والے، کثیر المطالعہ، غیر جانب دار تنقید نگار اور محقق تھے۔ استاد مکرم پروفیسر نثار احمد فاروقی مرحوم (وفات: 18/نومبر 2004) نقاد کے اوصاف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

نقاد صحیح معنوں میں وہ شخص ہو سکتا ہے جو عام انسانوں سے، بلکہ فن کار سے بھی ذہنی سطح کے اعتبار سے بہت بلند ہو، علوم حاضرہ میں پوری بصیرت رکھتا ہو، غیر جانب دار ہو، ذوق سلیم اور ذہن رسا کا مالک ہو۔ اصول

وقواعد سے نہ صرف باخبر ہو بلکہ ان پر عامل بھی ہو، ماضی کے تمام سرمائے کا اسے اچھی طرح علم ہو، حال کی رفتار پر اس کی نظر ہو اور مستقبل کا صحیح خاکہ اس کے ذہن میں ہو، وہ نہ ادب کو کسی خانے میں بند کرے نہ خود کسی خانے میں بند ہو۔'' (دید و دریافت 167)

پروفیسر نورالحسن نقوی کی تمام تحریریں پڑھ کر یہ اندازہ لگانا کچھ دشوار نہیں کہ ان میں یہ تمام خوبیاں بدرجۂ اتم موجود تھیں اور وہ ان سے بھرپور کام بھی لیتے تھے۔ ان کی زیادہ تر تحریریں تحقیقی ذہن اور تنقیدی بصیرت کی غماز ہیں جس میں آپ نے پوری طرح حق گوئی و بیباکی سے کام لیا ہے۔ راقم الحروف نے ان کی چند کتابیں مثلاً: 'اقبال فن اور فلسفہ'، 'فلسفۂ جمال اور اردو شاعری'، 'فن تنقید اور اردو تنقید نگاری'، 'تصویریں اجالوں کی' (خاکوں کا مجموعہ) وغیرہ پڑھی ہیں، جس سے ان کی فن پر گرفت اور تنقیدی بصیرت نے پورے طور پر متاثر کیا۔ پروفیسر نورالحسن نقوی نثر اتنی سلیس اور سادہ لکھتے تھے کہ ایک ادنیٰ طالب علم بھی ان کے بیان کردہ رموز کو بخوبی سمجھ لیتا۔ وہ ایک اچھے، ماہر اور تجربہ کار استاد تھے۔ انھیں احساس تھا کہ میری گفتگو بھلے عالمانہ موضوعات پر ہے؛ لیکن میرے مخاطب عوام اور یونیورسٹی و کالجز کے طلبہ ہیں۔

پروفیسر نورالحسن نقوی کی ابتدائی گھریلو مالی حالت بہت نازک تھی انھوں نے بہت پاپڑ بیل کر اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور پھر اللہ نے ان کو بے شمار نعمتوں سے نوازا۔ انھوں نے اپنی ابتدائی تعلیم ہائی اسکول کے زمانہ کا ایک واقعہ لکھا ہے، جو نہ صرف ان کی حقیقت نگاری پر مبنی ہے بلکہ ان کے حوصلہ کی بھی غمازی کرتا ہے کہ انھوں نے ان نامساعد حالات کے باوجود اپنی تعلیم جاری رکھی۔ آپ مؤرخ امروہہ محمود احمد عباسی (وفات: 14/ مارچ 1974) کے خاکے میں لکھتے ہیں:

''امام المدارس اسکول میں زیر تعلیم تھا کہ والد کا انتقال ہوگیا، ناچار فیس معافی کا خواست گار ہوا۔ درخواست پر تصدیق ضروری تھی، عباسی صاحب محلے کے معزز آدمی تھے اور شہر کے آنریری مجسٹریٹ بھی۔ ان کی سفارش کے ساتھ درخواست منیجر صاحب کی خدمت میں پیش کر دی۔ انھوں نے پوچھا: یہ تمھارے ہم محلہ ہیں یا رشتہ دار بھی۔ دس برس کی ناسمجھی کی عمر، کچھ نادانی، کچھ شیخی، میں نے رشتہ کے پھوپا کو سگا پھوپا بتایا، درخواست رد ہوگئی۔'' (تصویریں اجالوں کی 46-145)

پروفیسر نورالحسن نقوی کو طالب علمی کے زمانے سے ہی محنت کرنے کی عادت سی ہوگئی تھی، وہ پوری طرح ایک ذہین وفطین انسان ہونے کے ساتھ ساتھ بلا کے محنتی بھی تھے۔ اس بات کا اندازہ ''کلیات مصحفی'' کی تدوین سے لگایا جاسکتا ہے کہ کس طرح انھوں نے یہ بھاری پتھر پوری توانائی سے اُٹھایا، چوما اور یہ جناتی کام کر دکھایا۔ یعنی مصحفی کے نو کے نو دیوان ایڈٹ کرکے چھپوا ڈالے اور ساتھ ہی 'مصحفی حیات اور شاعری' پر بھی ایک مستند کتاب لکھی جو مجلس ترقی ادب لاہور سے 1998 میں شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ 'تاریخ ادب اردو' (1977)، 'تصویریں اجالوں کی' (خاکوں کا مجموعہ مطبوعہ 1999) اور 'کلیات جرأت' وغیرہ تالیفات بھی ان کی ذہانت و محنت اور لگن کا ثبوت پیش کرتی ہیں۔ آپ نے پروفیسر سید محمد طارق حسن کی مدد و معاونت سے ایک اہم علمی کام یہ بھی کیا ہے کہ تذکرہ 'عیارالشعرا' ایڈٹ کردیا۔ آپ نے بہت سی انگریزی اور ہندی کتابوں کے ترجمے بھی کیے جن میں 'رام چرت مانس'، 'راجہ رام موہن رائے'، 'نہرو کے ان دیکھے روپ'، 'اشارات تعلیم'، 'میرابائی اور اس کے گیت' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سے علمی و تحقیقی مقالات ہیں جو ہندو پاک کے مختلف رسائل و جرائد میں بکھرے ہوئے ہیں۔ کچھ اہم کتابوں پر تبصرے اور پیش لفظ بھی ہیں جن کو یکجا کرکے کتابی صورت میں شائع کیا جاسکتا ہے اور یہ خدمت ان کے لیے بڑا خراج عقیدت ہوگی۔

پروفیسر نورالحسن نقوی مرحوم جہاں اور بہت سی خوبیوں کے مالک تھے وہاں ان کی ایک بڑی اور اہم خوبی یہ بھی تھی کہ وہ انتہا درجے کے خردنواز تھے۔ اپنے چھوٹوں بالخصوص شاگردوں کی ہر ممکنہ مدد کرنا وہ اپنا اولین فرض سمجھتے تھے۔ ڈاکٹر اطہر پرویز کے خاکہ میں استاد کی خوبیاں گناتے ہوئے آخیر میں لکھتے ہیں:

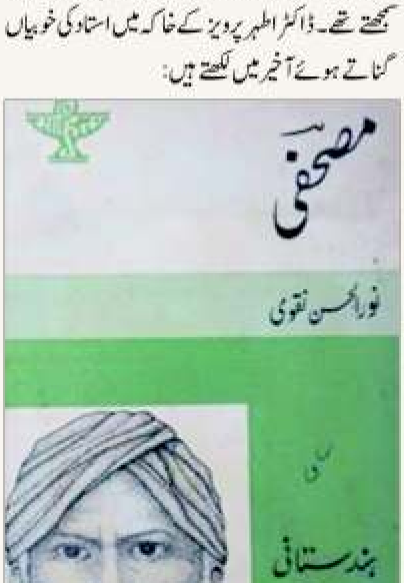

پروفیسر نورالحسن نقوی کی ابتدائی گھریلو مالی حالت بہت نازک تھی انہوں نے بہت پاپڑ بیل کر اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور پھر اللہ نے ان کو بے شمار نعمتوں سے نوازا. انہوں نے اپنی ابتدائی تعلیم ہائی اسکول کے زمانہ کا ایک واقعہ لکھا ہے, جو نہ صرف ان کی حقیقت نگاری پر مبنی ہے بلکہ ان کے حوصلہ کی بھی غمازی کرتا ہے کہ انہوں نے ان نامساعد حالات کے باوجود اپنی تعلیم جاری رکھی.

''آخری شرط ذاکر صاحب کے لفظوں میں یہ کہ استاد کی کتاب زندگی کے سرورق پر لفظ محبت لکھا ہونا چاہیے۔'' (تصویریں اجالوں کی 172)

نورالحسن نقوی صاحب کا میں باقاعدہ شاگرد تو نہیں رہا؛ لیکن ان کی صحبت فیض اثر سے بہت فیض پایا وہ مجھ سے بالکل اپنے شاگرد اور عزیزوں کی طرح برتاؤ کرتے تھے۔ ان کی دیرینہ خواہش تھی کہ 'ناموران علی گڑھ' کی طرح وہ امروہہ پر بھی کام کریں؛ لیکن اپنی علمی مصروفیات کے سبب کبھی اس طرف پوری توجہ نہیں کرسکے۔ مجھ سے ملاقات کے بعد میرے کاموں کو دیکھتے ہوئے انھیں اندازہ ہوا تھا کہ شاید ان کی یہ خواہش میرے ذریعے پوری ہوجائے گی، اس لیے انھوں نے میری پوری طرح مدد اور رہنمائی کرنے کا بیڑا اُٹھایا۔ اس سلسلے میں ان کے چند محبت ناموں کے اقتباسات یہاں پیش کرتا ہوں جس سے نہ صرف ان کی خردنوازی ظاہر ہوگی بلکہ اپنے وطن عزیز امروہہ سے انھیں کس درجہ لگاؤ تھا اس کا بھی بخوبی اندازہ ہوگا۔ ایک گرامی نامہ مؤرخہ 16/ فروری 1999 میں بہت سے القاب اور دعاؤں کے بعد لکھتے ہیں:

علی گڑھ آنے کے بعد آنکھوں کے علاج کے سلسلہ میں دو دن کے لیے دہلی گیا۔ پرسوں واپس آیا۔ کل طارق صاحب سے تمھارے سلسلے میں گفتگو کی۔ وہ خاصے مایوس اور خفا نظر آئے۔ انھوں نے بتایا کہ ابھی کئی تقرر ہوئے ہیں۔ مصباح لائن میں ہوتے تو پہلا نمبر انھی کا ہوتا جو اساتذہ پہلے صرف مصباح کا ہی ذکر کرتے تھے انھیں بھولتے جاتے ہیں۔ خیر اب تک جو ہوا سو ہوا۔ اب میری بات غور سے سنو۔''

اس گرامی نامہ میں مجھے کئی ہدایات دینے کے بعد لکھتے ہیں:

''میرا یہ خط اپنی خوش دامن صاحبہ اور ہماری بہن برجیس کو پڑھوا دینا۔ دراصل میں تو تمھاری صلاحیت کا

قائل تھا اس لیے تمھاری ترقی کا خواہاں تھا۔ یہ اب معلوم ہوا کہ تم سے رشتہ بھی ہے۔''

اسی مکتوب میں چند سطور کے بعد شعرائے امروہہ کی ترتیب و تدوین کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مقالہ (پی ایچ ڈی) سے فارغ ہونے کے بعد 'ناموران امروہہ' مرتب کرنے کا ارادہ کرنا، عربی، فارسی، اردو، ہندی کے جن شاعروں کی تفصیل موجود ہے، اسے مختصر کرکے ترتیب دے لو، یہ ایک یادگار کام اور وطن کی ناقابل فراموش خدمت ہوگی۔ تم نے اب تک جو علمی کام کیے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کام بھی بہ آسانی کرگزروگے۔''

ایک دوسرے نوازش نامہ مؤرخہ 17/اپریل 1998 میں لکھتے ہیں:

''شعرائے امروہہ سے متعلق مواد کی فراہمی بہت مشکل کام ہے یوں کہ شعرا کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ کتنی بھی محنت کرلی جائے بہت لوگ چھوٹ جائیں گے...... اب ہمہ تن اس کام میں مصروف ہوجایئے۔ محمود احمد عباسی صاحب نے بھی اس کام کا بیڑا اُٹھایا تھا مگر اس بھاری پتھر کو اب تک کوئی اُٹھا نہ سکا۔ ان شاءاللہ آپ اٹھالیں گے۔ کام میں جان کھپا دینے والے چند لوگ ہی ہوتے ہیں، ان میں سے ایک ماشاءاللہ آپ ہیں۔''

اللہ کا لاکھ لاکھ فضل و احسان اور محترم پروفیسر نورالحسن نقوی کی مشفقانہ دعاؤں کا نتیجہ ہے کہ شعرائے امروہہ کی ایک جلد (ابتدا سے سنہ دو ہزار تک کے مرحوم شعرا پر مشتمل) رضا لائبریری رام پور سے 2004 میں شائع ہوگئی۔ دوسری جلد کا کام تیزی سے جاری ہے جو ان شاءاللہ موجودہ تمام شعرائے امروہہ پر مشتمل ہوگا۔ اس کا اسّی فیصد کام مکمل ہوچکا ہے۔

پروفیسر نورالحسن نقوی صاحب اگرچہ آخر عمر میں بہت سخت بیمار رہے؛ لیکن اس ہوش ربا بیماری کے باوجود آخری سانس تک علمی کاموں میں مصروف رہتے اور اپنے وطن امروہہ کے مشاہیر کی نئی تاریخ مرتب کرنے میں کوشاں تھے، اس کا اندازہ ان کے مکتوب کے اس اقتباس سے ہوگا:

آپ اپنی کتاب 'علمائے امروہہ' عنایت فرمانے غریب خانے (نظام الدین ایسٹ) آنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ میں کچھ گفتگو کرنا چاہتا تھا؛ لیکن غالباً مصروفیت کے سبب نہ آسکے اور سیمینار کے درمیان کتاب عنایت فرما دی۔ میں سخت بیمار تھا، ڈاکٹروں نے خطرناک بیماری کا شک ظاہر کیا ہے۔ مایوسی کا غلبہ تھا پھر بھی آپ سے ضروری گفتگو کرنا چاہتا تھا۔ لیٹا ہوا لکھ رہا ہوں۔ بہت بڑا آپریشن ہوا ہے، صاف نہیں لکھا جارہا، پڑھنے کی زحمت گوارا کرہی لینا............ اس دوران یہ ہوا کہ 'ناموران علی گڑھ' کے بعد 'محمڈن کالج سے مسلم یونیورسٹی تک' شائع ہوئی، ساری دنیا کی علی گڑھ برادری نے دل چسپی لی اور یہ کتاب ہر ملک میں پہنچی اور فروخت ہوگئی۔ بہت لوگوں نے خریدی جو اردو نہیں جانتے تھے، بہت سے دوستوں نے مجھے لکھا کہ ایک کام اور کرو۔ اسے مختصر کرکے انگریزی میں منتقل کردو۔ یہ دونوں کام تو میں نے کرہی دیے ہیں ایک کام اور کیا............ اسے پڑھنے سے زیادہ خوبصورت رنگین دیکھنے کی چیز بنا دیا مطلب یہ کہ رنگین تصویروں کی بھرمار کردی۔ پریس میں ہے آنے پر آپ کو ضرور دکھاؤں گا............ کتاب نہ پڑھو صرف تصویریں دیکھ لو ہر تصویر کے سامنے یہ پڑھ لو۔ ان کا نام کیا ہے، زمانہ کیا ہے اور انھوں نے علی گڑھ کی کیا خدمت کی۔''

یہ گرامی نامہ پورے فل اسکیپ کے سولہ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں 'ناموران امروہہ' پر کس طرح کام کرنا ہے، پورا خاکہ لکھا ہے، بیماری کے عالم میں اتنا طویل اور اہم خط لکھنا کتنا دشوار گزار کام ہے۔ جو شخص علمی کاموں میں دوسروں کو مخلصانہ طور پر 'جان کھپا دینے' کا مشورہ دے وہی اس طرح کے علمی کام کرسکتا ہے۔

پروفیسر نورالحسن نقوی کی ایک ایک کاوش کو دیکھ کر جہاں ان کے علمی مرتبہ اور تحقیقی ذہن کا پتا چلتا ہے وہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ کام کس طرح محنت، لگن اور جان گھپا کر پِتہ ماری کے ساتھ کرتے تھے۔ اگر وہ زندگی میں صرف کلیات مصحفی (نو جلدوں) میں مرتب کرنے کے بعد کچھ بھی نہ کرتے تو اردو دنیا ہمیشہ ان کی احسان مند رہتی؛ لیکن وہ امروہہ میں پروفیسر خلیق احمد نظامی، نثار احمد فاروقی اور منظور احمد افسر صدیقی (کراچی) کی طرح اس قبیلہ کے یگانہ فرد تھے، جنھوں نے اپنی زندگی علم و فن کی خدمت میں فنا کردی تھی۔ یہ شخصیات اپنے اپنے میدانوں میں تازندگی تشنہ کامانِ ادب و تحقیق کو سیراب کرتی رہی ہیں۔ ان لوگوں نے علم و ادب کی خدمت میں کبھی اپنی جان کی فکر نہیں کی۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی کی اہلیہ محترمہ نے ان کے چچا مفتی نسیم احمد فریدی (وفات: 18/اکتوبر 1988) کو ایک خط میں لکھا تھا کہ انھیں سمجھایے یہ دن رات اس قدر محنت کرتے ہیں جس سے ان کی صحت خراب ہورہی ہے۔ یہ خط اس زمانہ کا ہے جب پروفیسر نثار احمد فاروقی امروہہ کے ایک معروف بزرگ حضرت شاہ عضدالدین محمد جعفری کی کتاب 'مقاصدالعارفین' ایڈٹ کررہے تھے۔ 'مقاصدالعارفین' کے مخطوطات راقم الحروف نے بھی دیکھے ہیں واقعی ان کا پڑھ لینا پروفیسر نثار احمد فاروقی جیسے ہی صاحب علم و فن کا کام تھا۔

افسوس کہ 25/جنوری کے نامبارک دن امروہہ کا پروفیسر نورالحسن نقوی نامی ایک فرہاد جو نہر کھودتے کھودتے اپنی پیاری شیرین امروہہ تک پہنچنے والا تھا (ناموران امروہہ پر کام کرنے کے لیے) وہ کینسر نامی تیشے سے لہولہان اور گھائل ہوکر ابدی نیند سوگیا اور ناموران امروہہ کا کام شاید ان کمزور و ناتواں کاندھوں پر چھوڑ دیا جس کی کئی برس تک بڑی مشفقانہ طور پر تربیت کی تھی۔

آخر میں انھیں کے ایک اقتباس سے مضمون کو مکمل کرتا ہوں جو انھوں نے اپنے ایک محسن کے بارے میں لکھا ہے

''احسان کا بدلہ بھلا کون چکا سکتا ہے مگر اتنا ضرور ہے کہ شکر گزاری کے ساتھ کسی محسن کا ذکر کرنے اور دعائے خیر میں اسے یاد رکھنے سے دل کا بوجھ ہلکا ہوجاتا ہے۔''

راقم السطور بھی ان کے لیے دعائے مغفرت کرتا ہے، علامہ اقبال کے اس مصرعہ کے ساتھ کہ

''آسماں تری لحد پر شبنم افشانی کرے''

■

Dr. Misbah Ahmad Siddiqui
Mohalla: Gher Munaf
Amoroha - 244221 (UP)

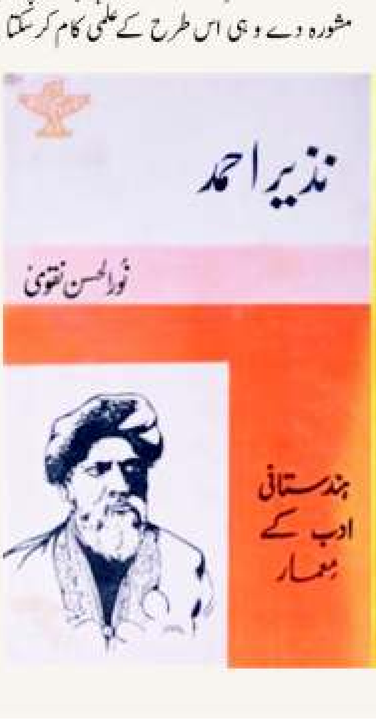

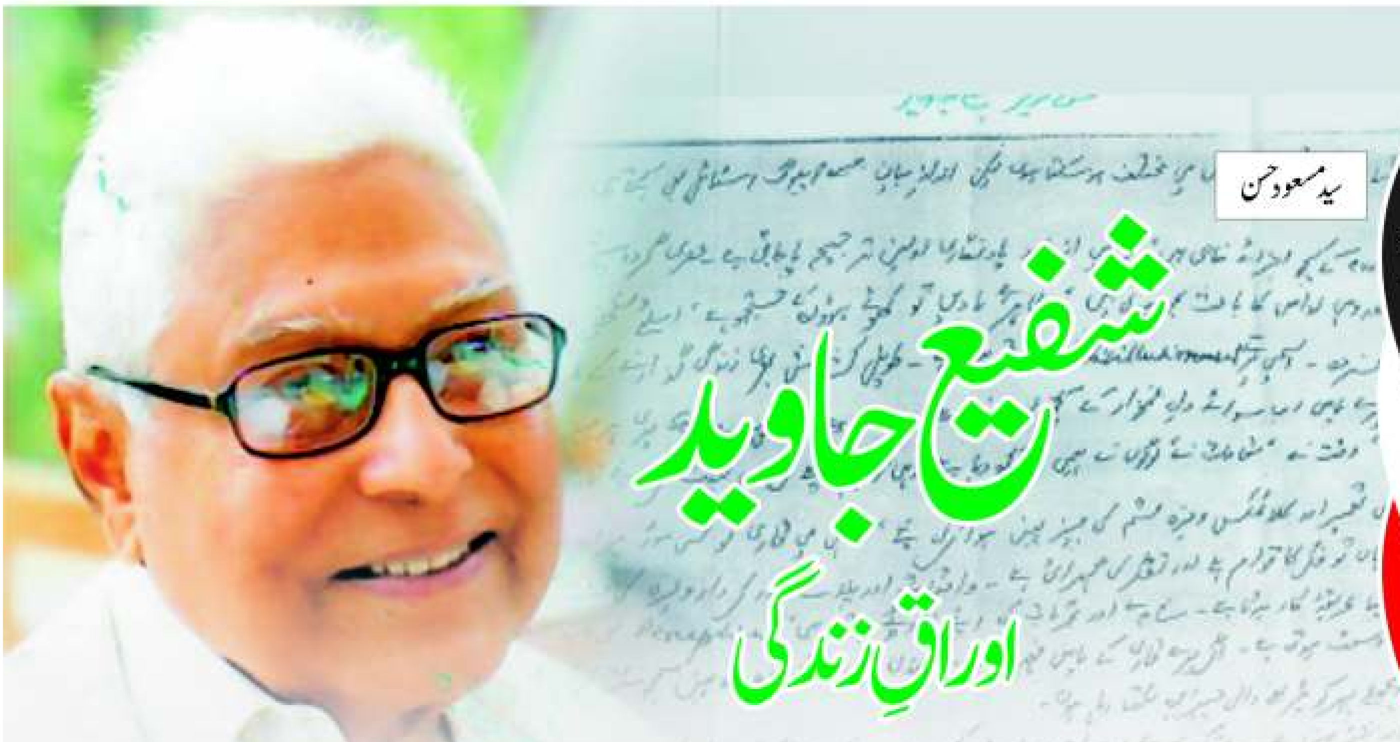

شفیع جاوید

اوراقِ زندگی

سید مسعود حسن

شفیع جاوید صاحب سے میری ملاقات کب ہوئی یہ تو یاد نہیں لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ ملاقات کا ذریعہ کتاب بنی تھی۔ غالباً پندرہ سال قبل کی بات ہے میں ان دنوں اکیوزیشن سیکشن کا انچارج تھا۔ شفیع صاحب کسی کتاب کی تلاش میں پہنچے تھے۔ میں نے وہ کتاب انھیں مہیا کرادی اور اس طرح انھیں اپنی کتاب اور مجھے ایک سنجیدہ قاری مل گیا۔ شفیع صاحب کے مطالعے کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ وہ اردو ادب کے ساتھ ساتھ انگریزی ادب کے بھی قاری تھے۔ عربی فکشن کے تراجم کی تلاش میں رہتے اور میں انھیں لائبریری کے ذخائر سے مطلوبہ کتابیں مہیا کردیتا۔ کتاب کی تلاش کے دوران میں نے فلسطینی مصنف Mourid Barghouti کی کتاب I Saw Ramallah جب انھیں پڑھنے کو دی تو اس کتاب نے انھیں بہت متاثر کیا جس کا ذکر وہ اکثر کرتے تھے۔ وہ اکثر مجھے نئی نئی کتابوں کے بارے میں بتاتے اپنی پسند اور ناپسند کا اظہار کرتے۔ Nautej Sarna، Orhan Pamuk کی کتابوں کی طرف انھوں نے ہی توجہ دلائی تھی۔ ہماری لائبریری میں ایسی کتابوں کے قاری خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ ایسی صورت میں شفیع جاوید صاحب ہماری لائبریری کے بہت اہم ممبر تھے۔ یہاں ایک نام اور لینا چاہوں گا اور وہ ہے معصوم عزیز کاظمی صاحب کا۔ کاظمی صاحب پٹنہ میں ہوں، گیا میں یا پھر بنگلور میں، نئے کتب و رسائل کے بارے میں ضرور دریافت کرتے ہیں اور ساتھ ہی نئی کتابوں کی طرف توجہ بھی دلاتے ہیں۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ ایسے لوگوں کو یقیناً کتابیں دعائیں دیتی ہوں گی۔ لائبریری میں اگر آپ کی انتخاب کی ہوئی کتاب کو ایسے قاری مل جاتے ہیں تو یہ بڑی خوشی کی بات ہوتی ہے۔ میں نے اسے محسوس کیا ہے۔

جب تک شفیع صاحب کی صحت ٹھیک رہی تب تک وہ خود لائبریری آتے اور اپنی پسند کی کتابیں لے جاتے۔ جب پیر کی تکلیف زیادہ بڑھی تو آنا کم ہوگیا۔ ایسے میں جاوید اختر ان کے مددگار ثابت ہوئے اور مطالعے کا سلسلہ جاری رہا۔

شفیع جاوید صاحب جہاں لائبریری کے لیے ایک معتبر قاری تھے وہیں میرے لیے ایک سرپرست کی حیثیت رکھتے تھے۔ میری اور گھر والوں کی خیریت دریافت کرتے۔ حسب ضرورت مفید مشورے دیتے خاص کر اگر بیماری کی خبر ملتی تو طبی مشورے دیتے۔ ہومیوپیتھک دواؤں کی انھیں اچھی معلومات تھی اور مرض کے لحاظ سے ہومیو دوا بھی تجویز کرتے۔

شفیع صاحب کو مطالعے کا ہی صرف شوق نہیں تھا بلکہ وہ مطالعے کے بعد اپنی نوٹ بک میں کثرت سے نوٹس تیار کرتے تھے۔ ہارون نگر جب ملنے جاتا تو اکثر مجھے سناتے تھے اور پڑھنے کے لیے بھی دیتے تھے۔ ان ڈائریوں میں شفیع جاوید صاحب کی الگ ہی دنیا ہے۔ ڈاکٹر عبدالواحد ندوی صاحب نے اپنے مضمون 'شفیع جاوید: افسانہ اور حقیقت' میں لکھا ہے کہ ''اسی ڈائری میں اصلی شفیع جاوید ہے جو اپنے مختلف افسانے میں کبھی ظاہر ہوتا ہے اور کبھی خود کو چھپاتا ہے۔ بغیر اس ڈائری کے دنیا نے ایک نامکمل شفیع جاوید کو جانا ہے۔''

(روزنامہ پندار (پٹنہ) 23دسمبر 2019)

اکثر وہ اپنی گذری زندگی کے واقعات بتاتے اور کہتے میرے مرنے کے بعد یہ سب لکھیے گا۔ ایک ذمے داری انھوں یہ دے رکھی تھی کہ ان تحریروں کی نقل محفوظ رکھوں۔ ان پر قلم اٹھانے والا جب ان سے رجوع کرتا تو وہ میرا نمبر دے دیتے۔ اور میں مطلوبہ چیزیں مہیا کردیتا۔ اس کی خبر ملتے ہی ڈھیر ساری دعائیں دیتے۔

نوجوانی کے زمانے میں موسیقی کا شوق تھا۔ ایک دن بتانے لگے کہ بسم اللہ خاں کی شہنائی اور کلاسکی گانا سننے ڈمراؤں جایا کرتے تھے۔ بعد میں یہ شوق ریڈیو اور ٹی وی تک محدود ہوگیا اور بعد میں وہ بھی ختم ہوگیا۔ ایک جگہ ڈائری میں لکھا ہے کہ ''وہاب اشرفی کے انتقال سے کچھ ہی دنوں قبل گانوں کے کسیٹ خریدنے کے سوال پر میں نے ان کے سوال پر کہا تھا۔ ''میں گانا کہاں میں تو وقت کو سنتا ہوں''

شفیع صاحب بڑے اصول پسند اور مذہبی انسان تھے۔ ایک ملاقات میں انھوں نے بتایا تھا کی پچھلے چالیس سالوں سے آیۃ الکرسی روزانہ رات کو پڑھنے کا معمول ہے۔ صحت کی خرابی کے باوجود نہ صرف نماز کے پابند تھے بلکہ تہجد گزاری بھی کرتے تھے۔

حکومت بہار میں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ گورنر کے پریس سکریٹری سے لے کر ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات و تعلقات تک۔ مگر اپنے اصولوں سے کبھی سمجھوتا نہیں کیا۔ اکثر ملاقات میں کہتے ''تنگ دست نہ رہا لیکن دست تہہ سنگ رہا۔''

شفیع صاحب کی نوٹ بک میں ادبی، سیاسی، مذہبی ساری چیزیں ہوتی تھیں۔ کتاب کے مطالعے کے دوران وہ طویل نوٹس لیتے تھے۔ شفیع صاحب اپنی خودنوشت بھی لکھ رہے تھے۔ مشتاق احمد نوری صاحب نے اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''وہ اپنی جیون گاتھا'' بھیگا ہوا شیشہ'' کے نام سے لکھ رہے تھے جس کا کچھ حصہ انھوں

نے مجھے سنایا بھی تھا''(روزنامہ پندار (پٹنہ) 13 دسمبر 2019)۔مگر وہ مکمل نہ کرسکے۔شفیع صاحب کے اب تک پانچ افسانوی مجموعے''دائرے سے باہر (1979)''،''کھلی جو آنکھ (1982)''،''تعریف اس خدا کی (1984)''، 'وقت کے اسیر (1991) اور رات شہر اور میں (2004) شائع ہو چکے ہیں۔اب جلد ہی ڈاکٹر صفدر امام قادری صاحب اسے کلیات کی شکل میں شائع کرنے والے ہیں۔شفیع صاحب اپنے مضامین بھی جمع کروا رہے تھے۔ مجھے مجموعے کا عنوان تجویز کرنے کے لیے کہا تھا۔میں نے کچھ عنوان تجویز کیے جن میں 'متاع لوح وقلم' انھیں پسند آیا تھا۔مضامین کا یہ مجموعہ بھی صفدر امام قادری صاحب مرتب کررہے ہیں۔

یہاں ان کی نوٹ بک کی اس تحریر کا ذکر مقصود ہے جو ان کی زندگی اور شخصیت سے متعلق ہے۔ ان کے گذر جانے کے بعد اس کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔بغیر کسی ترمیم واضافہ کے یہ خودنوشت درج ذیل ہے:

''والد کا نام: ایس ایم رفیع الدین (مرحوم) ولد امیر الدین امیر گیاوی ولد جناب محمد بندہ علی، ایڈوکیٹ، گیا۔ والدہ کا نام: بی بی سعیدہ خاتون (مرحومہ) بنت خواجہ محمد عبدالجلیل مرحوم، موضع سونائی، ضلع جموئی (سابق مونگیر)''

''جو کچھ میں نے سنا ہے گھر میں بزرگوں سے وہ یوں ہے کہ میرے پڑ دادا محمد بندہ علی صاحب، شکراواں ضلع نالندہ سے گیا اپنے پیشے یعنی وکالت کی وجہ سے منتقل ہوگئے تھے، ان کی رہائش محلہ Delha گیا میں اس مشہور زمانہ کوٹھی میں تھی جو ڈیلہا کوٹھی کے نام سے آج بھی مشہور ہے اور ان کی قبر آج بھی اس میں موجود ہے۔زمانے کی تبدیلیوں کے ساتھ یہ دوسروں کے قبضے میں چلی گئی۔مجھے میری اس آبائی کوٹھی کے واپس ملنے کے دو موقعے ملے لیکن میری بدقسمتی کہ دونوں بار ہم نے یہ موقع کھو دیا۔ میرے دادا، ضلع جج گیا کے دفتر میں Judgement writer تھے۔یہ عہدہ انھیں کے لیے تھا جو بعد میں ختم ہوگیا۔میرے دادا کے چھوٹے بھائی تھے جناب ضمیر الدین عرش گیاوی جو مومن کے شاگرد اور اردو کے سرکردہ شاعر تھے۔کلیات عرش 1922 میں کلکتہ سے شائع ہوئی تھی۔رام بابو سکسینہ نے اپنی تاریخ اردو ادب میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔میرے دادا کے ایک چھوٹے بھائی جناب نصیر الدین، جو ریلوے کے بڑے عہدے پر ان دنوں فائز تھے۔سنتے ہیں کہ ان کی تنزلی کی وجہ خواجہ غریب نواز کی شان میں گستاخی تھی۔واللہ عالم بالصواب۔میرے دادا بڑے مذہبی تھے۔میرے دادا کی شادی موضع ارول، جو پہلے گیا ضلع میں تھا، کے شاہ خاندان میں ہوئی تھی۔میری دادی شرف النساء بیگم شاہ محمد عزالدین صاحب کی بیٹی تھیں اور اکلوتی تھیں اور پانچ بھائیوں میں سب سے بڑی تھیں۔ ان کے بھائیوں میں بڑے تھے شاہ فرید الدین، دوسرے تھے شاہ مجید الدین، تیسرے تھے ڈاکٹر شاہ رشید الدین، چوتھے شاہ سعید الدین اور سب سے چھوٹے تھے شاہ توحید الدین جو شکیلہ اختر کے والد اور اختر اورینوی کے خسر تھے۔

''میرے والد بہار کے محکمہ پولس میں داروغہ تھے اور جب وہ گیا کہ مفصل تھانہ کے انچارج بنا کر پوسٹ کیے گئے تو وہیں ان کا انتقال ہوا، اس وقت ان کی عمر صرف 55 سال تھی، وہ گیا ہی میں کریم گنج کے قبرستان میں مدفون ہیں۔میری والدہ پٹنہ کے جنت القبور میں آسودہ خاک ہیں''

''میری صرف دو اولاد ہے ایک بیٹی رعنا تبسم اور بیٹا طارق احمد''

''میرا نام شفیع جاوید یوں ہوا کہ میرے ایک چچا زاد بھائی تھے صغیر جاوید۔بڑا بلند اور بے حد ستھرا ذوق ان کا تھا اور اردو ادب سے انھیں بڑی محبت تھی۔عین عالم جوانی میں جب وہ بی اے کے فائنل ایر میں تھے، ان کا انتقال ہوگیا۔ہم ان کے چہیتے تھے۔میرے ادبی ذوق کو انھوں نے ہی جنم دیا تھا اور سنوارا تھا۔اس لیے جب ان کا انتقال ہوگیا، اور ہم نے خود کو بالکل اکیلا محسوس کیا تو ہم نے ان کا نام جاوید اپنا لیا۔میرے والدین نے اس کی سخت مخالفت کی لیکن ہم نے جو طے کرلیا تھا وہ آج بھی قائم اور میرے نام میں صغیر بھائی آج بھی زندہ ہیں''

''ہم اسکول میں کبھی نہ پڑھ سکے۔ابا کا خیال تھا کہ اسکول جانے سے صحبت خراب ہوجاتی ہے۔اس لیے ہماری تعلیم پرائیویٹ طور پر ہوئی اور بے حد سخت ہوئی۔ تقریباً چار پانچ ماسٹر آیا کرتے تھے۔ان میں ایک مولوی صاحب بھی ہوا کرتے تھے۔اس طرح کی میری تعلیم مظفرپور، سمستی پور، ناتھ نگر اور گیا میں ہوئی۔گیا ہی کے ضلع اسکول سے ہم نے پرائیویٹ طور پر 1950 میں میٹریکولیشن کا امتحان سکنڈ ڈیویژن میں پاس کیا۔اس سے قبل مجھے امتحان دینے کا کوئی تجربہ نہ تھا''۔

''اس کے بعد ابا کا تبادلہ مظفرپور ہوگیا اور پروفیسر عبدالماجد صاحب جو ابا کے بہت گہرے دوست تھے، ان کے کہنے سننے پر ابا نے میرا داخلہ ایل ایس کالج مظفرپور میں کروایا۔وہاں ہم نے 1955 میں بی۔اے کیا۔ایک سال یعنی 1954 یوں ضائع ہوا کہ ہم Meningitis کے بہت خطرناک طور پر شکار ہوگئے تھے۔حیات تھی جو بچ گئے لیکن لگ بھگ ایک سال تک صحت بیحد خراب رہی۔ مظفرپور میں کئی Cases ہوتے تھے Meningitis کے، ہم واحد Survival بتائے جاتے ہیں۔شاید یہ میرے والد کی گریہ وزاری کا اثر تھا جو کچی سرائے مظفرپور کی مسجد میں دوران نماز یا دعاؤں میں وہ کیا کرتے تھے۔لوگوں نے مجھے بتایا تھا کہ کچی سرائے کی مین روڈ تک ان کے رونے کی آواز جایا کرتے تھی''۔

''ہم اپنے والد کی واحد اولاد ہیں نہ کوئی بھائی نہ کوئی بہن۔اس لیے ابا Apprehensive بہت رہتے تھے۔ایک سپاہی ہمیشہ میرے ساتھ خفیہ طور پر چلا کرتا تھا۔چونکہ ہم اس بات پر خاصے بدکتے تھے اس لیے ابا اس بات کو ہم سے پوشیدہ رکھتے تھے لیکن اتنی محبت کے باوجود سخت بہت تھے۔یوں کہیں کہ Strict diciplinarian تھے۔میرے ادبی رجحان یا ذوق پر سخت برہم رہا کرتے تھے۔یہاں تک کہ ادبی چیز ہم ان سے چھپ کے پڑھا کرتے تھے۔اگر دیکھ لیتے تو بہت ناراض ہوتے اور کہتے ''تمھارا حال بھی تمہارے دادا کی طرح ہوجائے گا کہ ہر وقت تخیلات میں گم رہا کروگے اور عملی طور پر صفر ہوجاؤ گے۔جانتے ہو اس ادب اور شاعری کے چکر میں ہم لوگوں نے ڈیلہا کی کوٹھی کھو دیا۔زمین جائداد کی بربادی بھی اس مشاعرے، محفلیں اور ادب کے چکر میں ہوئی''۔ اور کبھی کہتے''اس لڑکے کا حال بھی اختر اورینوی والا ہوگا کہ خون تھوکنے لگے گا۔ایسے کڑے لمحات میں اماں میری مدافعت کرتیں اور ابا پستول چلاتے چلاتے رہ جاتے''۔

''1955 کے اواخر میں ہم ابا کے ساتھ نرکٹیا گنج چلے گئے۔14 مارچ 1955 کو میری شادی ہوچکی تھی۔ میری بیوی بھی نرکٹیا گنج ساتھ گئیں۔میری بیوی ابا کی اپنی ماموں زاد بہن شمسی بیگم کی بیٹی ہیں۔نرکٹیا گنج کی کھلی ڈھلی فضا مجھے بہت راس آئی۔وہاں ایک چینی کا کارخانہ تھا۔ابا ایک دن ہم لوگوں کو وہ کارخانہ دکھانے کے لیے لے گئے۔اس سے پہلے ہم نے کسی چینی کا کارخانہ دیکھا نہ تھا۔اس کے جنرل مینیجر تھے مسٹر فتح لال واڈیا۔انھوں نے چائے کے دوران مجھ سے میری تفصیلات پوچھیں اور کچھ دیر خاموش رہ کر بولے تھے۔ Why dont you join us young man? میں نے حیرت سے پوچھا''کس طرح''؟ تو انھوں نے Yard officer کا آفر دے دیا۔ ہم بھی فارغ تھے، اس عہدہ پر جوائن کرلیا۔ڈیوٹی سخت تھی لیکن لطف آتا تھا۔تنخواہ اچھی خاصی تھی پھر ابا کے ساتھ رہنا۔اس لیے کوئی فکر ہی نہ تھی۔تقریباً 4 یا 5 مہینوں کے بعد ایک دن واڈیا صاحب سے میرے ادبی ذوق کی باتیں ہونے لگیں، اس کے بعد میں نے کہا کہ میں آگے پڑھنا چاہتا ہوں لیکن ابا تیار نہیں ہوتے۔ان کا کہنا تھا کہ گریجویٹ ہوگئے کافی ہے۔اب چلو تم کو پولس میں

سرجنٹ کے عہدے پر بحال کروادیتے ہیں۔اماں نے زندگی بھر پولس محکمہ کی پریشانیاں دیکھی تھیں اور جھیلی بھی تھیں۔اس لیے وہ اور ہم اس کے سخت مخالف تھے۔

واڈیا صاحب نے کہا کہ آگے تو ضرور تم کو پڑھنا چاہیے اور اگر تم Labour یا Sociology میں ایم۔اے کرلو تو ہم بہت کم وقت میں تم کو Labour officer بنالیں گے۔انھوں نے ابا کو بہت سمجھایا،ابا کسی طرح مان گئے۔اس سمجھانے اور منانے کے دوران کافی وقت نکل گیا۔ہم جب پٹنہ یونیورسٹی میں داخلہ کے لیے پہنچے تو Labour میں کوئی جگہ نہ تھی۔مجبوراً Sociology میں داخلہ لینا پڑا۔لیکن یہ بھی اللہ کا ہی انتظام تھا کہ Sociology نے میرے ادبی ذوق کو نکھارنے میں بڑی مدد کی۔اس طرح ہم 1956-58 کے Session میں ایم۔اے سوشیولوجی کے لیکچر مکمل کیے لیکن پھر ابا اور کچھ دوستوں نے کہا کہ بھائی تم کمیشن کا امتحان دے ڈالو تو ہم 1958 میں BPSC کے امتحان میں بیٹھ گئے اور ایم اے کا امتحان چھوٹ گیا۔ 1959 سے ہم بہار سرکار کی نوکری میں آگئے اور ابا مطمئن ہوگئے کہ ہم سرکاری کرسی پر بیٹھ گئے۔ اس کے کافی دنوں کے بعد میری بیوی نے ایم۔اے کی یاد دلائی،اس وقت ہم دربھنگہ میں محکمہ ماپ تول (Weights & Measures) میں تھے۔ بڑی مشکل سے فرصت ملی کیونکہ محکمہ نیا نیا قائم ہوا تھا اور کمیشن سے بہت کم لوگ آپاتے تھے اور پھر weights & Measures کو Sociology سے کیا مناسبت لیکن خداوند کریم کے معجزات کا کیا کہنا؟ امتحان کی اجازت بھی ایک معجزہ ہی سمجھیے۔ 1963 میں ایم اے سوشیولوجی اس طرح گرتے پڑتے سکنڈ کلاس سے کیا اور پھر 1971 سے محکمہ اطلاعات وتعلقات عامہ میں بہ حیثیت ڈپٹی ڈائرکٹر BPSC کے ذریعے آئے اور 1993 میں ڈائرکٹر Information & Public Relations Deptt., Bihar کے عہدے سے سبکدوش ہوئے اور اس کے بعد بھی Indian Red Cross کے Bihar Chapter کے Administator ایک سال تک رہے اور 1994 سے پوری طرح سبکدوش ہوگئے"۔

" 1953 میں پہلا افسانہ 'آرٹ اور تمباکو' کے عنوان سے ماہنامہ 'اُفق' دربھنگہ میں شائع ہوا جسے شمیم سیفی (مرحوم) نکالتے تھے۔اس کے بعد سے مندرجہ ذیل رسالوں میں شائع ہوئے اور ہوتے رہے"۔

(1) بیسویں صدی (دہلی) (2) چندن (دہلی) (3) تحریک (دہلی) (4) آزاد ایشیاء (دہلی) (5) پروین (الہ آباد) (6) نکہت (الہ آباد) (7) کتاب (لکھنؤ) (8) آہنگ (گیا) (9) ہفتہ وار آدرش (گیا) (10) شب خوں (الہ آباد) (11) صنم (پٹنہ) (12) الفاظ (علی گڑھ) (13) مباحثہ (پٹنہ) (14) خرمن (پٹنہ) (15) مصور (پٹنہ) (16) پاکستان کے آئندہ/ بادبان/ عصریہ/ روشنائی/ خیال/ سیپ/ اوراق/ فنون اور ادب لطیف۔

شفیع صاحب نے حالات زندگی کے علاوہ اپنی افسانہ نگاری پر بھی روشنی ڈالی ہے۔یہ ان کی افسانہ نگاری اور ان کے افکار کی تفہیم کے لیے اہم ماخذ ہے۔

"میں مواد کے اعتبار سے مختلف افسانوں میں مختلف ہوسکتا ہوں لیکن انداز بیان جسے آپ لوگ اسٹائل بھی کہتے ہیں، وہ تو بہر حال وہی ہوگا جو میرا ہے"

"میرے Creative process کے کچھ اجزائے خاص ہیں۔جن میں از خود یادنگاری اولین ترجیح پا جاتی ہے۔عصری گرد وپیش بھی آتا ہے لیکن یادیں ہمیشہ ہمیشہ بھاری پڑ جاتی ہیں اور وہی اداسی کا باعث بھی ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے یادیں تو کھوئے ہوؤں کی جستجو ہے۔اس لیے شخصی طور پر Depressed رہتا ہوں اور فنی طور پر افسردہ۔اس میں میرے Disillusione d کا بھی ہاتھ ہے۔

طویل کشاکش بھری زندگی گذارنے کے بعد یوں بھی بشاشت گم ہوجاتی ہے۔میرے پاس اب سوائے دل غمخوار کے کچھ اور نہیں ہے۔یہ Sense of Loss میری ہر چیز پر چھایا ہوا ہے۔زندگی نے،زمانے نے،وقت نے، مقامات نے،لوگوں نے ہمیں جو کچھ دیا ہے وہی تو ہم اپنے فن میں لپیٹ کر اپنے قارئین کو واپس لوٹا رہے ہیں۔"

"میرے یہاں کہانی کی تعمیر اور کلائمکس وغیرہ قسم کی چیز نہیں ہوا کرتی ہے۔نہ ہی میں قاری کو کسی موڑ پر اچانک چھوڑ کر اچنبھے میں ڈالتا ہوں،میرے یہاں تو فکر کا قوام ہے اور تفکر کی گہرائی ہے۔واقعات اور پلاٹ اور کردار وغیرہ کی حیثیت ثانوی ہے۔"

"ہر تخلیق کار کا اپنا طریقہ کار ہوتا ہے۔مشاہدے اور تجربات کے اپنے زاویے ہوتے ہیں۔ Perceptions کی اپنی سطح ہوتی ہے۔تخیل کا اپنا دائرہ اور اپنی وسعت ہوتی ہے۔اگر میرے قاری کے پاس فہم کی ثروت مندی نہیں ہے تو وہ نہیں سمجھ سکتا کیونکہ میں وقت گذاری والی نہیں بلکہ رات کے پچھلے پہر کو پڑھنے والی چیزیں لکھتا ہوں۔"

"زندگی سپاٹ شے نہیں ہے۔یہ متحرک بھی ہے اور ہشت پہلو بھی ہے۔کسی پہلو پر روشنی ہے،کوئی حصہ تاریکی میں ہے اور کہیں سرمئی اُجالا بھی ہے۔زندگی کو اس طرح مختلف Shades میں دیکھتا ہوں،اگر ایسا نہ ہوگا تو میری تحریر اکہری ہو جائے گی۔اس کی تہہ داری مفقود ہو جائے گی۔ادب اور screenplay میں یہی فرق ہے کہ تخلیقی معنویت Transparent نہیں ہوتی۔"

"میرے یہاں Fusion کی تکنیک ہے جسے آپ Symphony کی تکنیک بھی کہہ سکتے ہیں۔ پروفیسر نرمدیشور پرساد نے میری تکنیک کو Thought process کی Mosaic تکنیک کہا تھا"

" My message is always clear but veiled کیونکہ میں "برہنہ حرف نہ گفتن" کا قائل ہوں اسی لیے میری تحریر Tangent ہوتی ہے اور جو کچھ ہے وہ Strait from the heart ہے"

"پٹنہ نے مجھے موہ لیا اور یہاں کئی اعلی پائے کے دانشوروں کی صحبت نے میرے تخلیقی سفر میں بڑا مثبت رول ادا کیا۔میں شاید تادم آخر عبدالقیوم قائد،ڈاکٹر نرمدیشور پرساد اور 'شب خوں' کے اجراء کے بعد شمس الرحمن فاروقی سے جو تعلقات ہوئے انھیں کبھی بھول نہ پاؤں گا۔یہ تینوں میری ادبی زندگی کے اہم ستون رہے"

"ہر تاریخ ماضی ہے اور ہر ماضی تاریخ ہے جو وقت کی راکھ میں دب کر خاک ہوجاتا ہے اور کبھی میری طرح کوئی اس راکھ کو کرید کر، کسی بجھی ہوئی چنگاری کو اپنی یادوں کی ہوا دے کر تازہ کر دیتا ہے اور رات کے سناٹے میں تاریخ بننے کے لیے بیٹھ جاتا ہے"

"ایسی ہی بے کراں تنہائی میں اور ایسے بے داغ سناٹے میں وہ آنکھ چاہیے جو اندر کھلتی ہے اور وہ کان چاہیے جو بازگشت سنتا ہے اور یادوں کی تاریخ کا تانا بانا اپنا کام کرنے لگتا ہے،یہاں تک کہ صبح ہوجاتی ہے اور دل کے دروازے بند ہوجاتے ہیں۔ایک اور رات تاریخ بن جاتی ہے۔،وقت کی راکھ میں دب کر رہ جاتی ہے اور پھر کبھی میری طرح کا کوئی اسے ہوا دینے کو پچھلی رات کو اٹھ کر بیٹھتا ہے اور داخل کو دیکھتا ہے اور بازگشتوں کو سنتا ہے اور تاریخ کو بُنتا ہے۔اور خود آخر کار موت کے اُس دریچے سے زندگی کی دوسری طرف چلا جاتا ہے۔جس سے اب تک کوئی واپس نہیں لوٹا"

12 دسمبر کو شفیع صاحب بھی موت کے دریچے سے زندگی کی دوسری طرف چلے گئے۔کیا پتہ تھا کہ اس خاموشی سے چلے جائیں گے۔

ملو جو ہم سے تو مل لو کہ ہم بہ نوک گیاہ
مثال قطرہ شبنم رہے رہے نہ رہے

(نظیر اکبرآبادی)

■

Dr. Syed Masood Hasan
Khuda Bakhsh O.P.Library
Ashok Rajpath
Patna-800004
mailme.masoodhasan@rediffmail.com

عبدالحی

اردو اور یونانی لازم و ملزوم ہیں

حکیم سید احمد خاں

عبدالحی: سب سے پہلے آپ اپنی تعلیم و تربیت اور پرورش کے بارے میں بتائیں؟

سید احمد خاں: ضلع بستی (یوپی) کے ایک معروف قصبہ چھتی میں پیدائش ہوئی اور یہیں پر مجاہد آزادی قاضی محمد عدیل عباسی کی تحریک پر قائم ہوئے مدرسہ ومکتب پرائمری اسکول معین الاسلام میں درجہ پانچ تک اردو میڈیم سے تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد ہندی میڈیم اسکولوں سے درجہ آٹھ اور بارہویں جماعت تک تعلیم حاصل کی اور انگریزی میڈیم سے سائنس بائیلوجی کے ساتھ کسان ڈگری کالج بستی سے بی ایس سی کی تعلیم مکمل کی۔ جے پور میں واقع راجستھان یونانی میڈیکل کالج سے بی یو ایم ایس 86-1985 بیچ میں طبابت کی تکمیل کی۔ والد محترم کسان ہونے کے ساتھ ساتھ سرکاری کوٹہ کی دُکان کے مالک بھی تھے اس کے علاوہ گاؤں میں کام آنے والے بہت سے خیر کے کاموں سے وابستہ تھے۔ ان کی شفاف زندگی کا اثر میری زندگی پر بھی پڑا۔ بڑے بھائی مظہرالدین خاں، تفضل حسین خاں، صلاح الدین خاں اور جلال الدین خاں کی ہر طرح سے سرپرستی حاصل تھی۔ کبھی مشکلات کا سامنا نہیں ہوا۔ والدین 1982 میں سفرحج کے لیے گئے اور مدینہ شریف میں والد محترم کا انتقال ہوگیا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد ظاہر ہے کہ تعلیمی اخراجات بھی بھائیوں نے خوشی خوشی برداشت کیے۔ کبھی والد محترم کی کمی کا احساس نہیں ہونے دیا۔ یہ بھی والدین کی تربیت کا بہترین نمونہ ہے۔

ع ح: طب یونانی کی جانب کیوں آئے؟ موجودہ دور میں تو لوگ ایم بی بی ایس کو ترجیح دیتے ہیں؟

س ا خ: طب یونانی میں آیا نہیں بلکہ لایا گیا۔ بڑے بھائی جناب مظہرالدین خاں صاحب مولانا آزاد انٹر کالج خلیل آباد کے پرنسپل تھے، ان کا حکم گھر کے ہر چھوٹے بھائی پر چلتا تھا۔ چنانچہ اُن کے حکم کی تعمیل میں ہی بی یو ایم ایس میں داخلہ لیا۔ حالانکہ مرضی کے خلاف طب یونانی کی تعلیم حاصل کرنے جے پور پہنچا تو کچھ دنوں بعد یہ سمجھ میں آیا کہ اردو اور یونانی آپس میں لازم وملزوم ہیں اور مظلوم بھی۔ بس یہی وجہ تھی کہ مزاج کے خلاف اردو اور طب کی تحریک سے وابستہ ہوگیا جس کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

ع ح: کیا موجودہ عہد میں طب یونانی کا کھویا ہوا وقار واپس آگیا ہے؟

س ا خ: بہت حد تک طب یونانی کا کھویا ہوا وقار بحال ہورہا ہے لیکن جد وجہد جاری رکھنا لازمی ہے۔

ع ح: آج ایلوپیتھی اور انگریزی طریقہ علاج کو چھوڑ کر لوگ دیسی علاج اور آیوروید کی طرف مائل ہورہے ہیں۔ کیا طب یونانی ایک کامیاب طریقہ علاج ہے؟ کیا کہیں گے آپ؟

س ا خ: جی ہاں، حکومت ہند کی جانب سے آیوش وزارت کا قیام اور مختلف پروگراموں سے عوام میں بیداری آرہی ہے اور لوگ دیسی طریقہ علاج خاص طور سے یونانی اور آیوروید طریقہ علاج کو پسند کرتے ہیں۔

ع ح: کیا یونانی اور آیورویدک طریقہ علاج الگ ہیں یا ایک ہی ہیں؟ دونوں میں کیا فرق ہے؟ میں نے یہ سوال اس لیے کیا ہے کیوں کہ کالجوں میں دونوں کے شعبے الگ الگ ہوتے ہیں۔ لیکن مجھے دونوں ایک جیسے ہی لگتے ہیں۔ آپ کیا کہتے ہیں؟

س ا خ: طب یونانی اور آیوروید کے Fundamentals بالکل الگ ہیں اور ذریعہ تعلیم بھی الگ الگ ہے نیز طریقہ علاج بھی الگ ہے۔ البتہ تقریباً 90 فیصد جڑی بوٹیاں دونوں سسٹم میں یکساں استعمال میں لائی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں کو آیوروید اور یونانی میں زیادہ فرق نظر نہیں آتا لیکن طب یونانی میں پاکیزگی کا ہر لحاظ سے خیال کیا جاتا ہے۔

ع ح: آپ آل انڈیا یونانی طبی کانگریس کے سکریٹری بھی ہیں۔ اس طب یونانی کو کتنا فائدہ پہنچا ہے اور طب یونانی کے فروغ میں آپ کی کیا کوششیں ہیں؟

س ا خ: میں 2008 سے اس تنظیم کا سکریٹری جنرل ہوں۔ مسلسل کامیابی مل رہی ہے۔ سب سے بڑی کامیابی یہی ہے کہ پورے ملک میں آل انڈیا یونانی طبی کانگریس کا نیٹ ورک تیار ہو چکا ہے۔ مشیر یونانی حکومت ہند، نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن بنگلور اور غازی آباد، راجستھان اور اترپردیش میں علاحدہ محکمہ یونانی کا قیام اور راجستھان، اتراکھنڈ، ہریانہ اور اترپردیش میں گورنمنٹ یونانی میڈیکل کالج کا قیام ہماری تحریک کی کامیابی کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

ع ح: آپ صفدر جنگ جیسے بڑے ہسپتال میں شعبہ طب یونانی کے انچارج کے طور پر کام کر رہے ہیں۔ اس ہسپتال میں طب یونانی کی مختلف سہولیات پر روشنی ڈالیں؟

س ا خ: صفدر جنگ ہسپتال کا انچارج ہونے کی وجہ سے بڑے پیمانے پر عوام کو طبی سہولیات مہیا کرانا آسان ہوگیا ہے اور سب سے خوشی کی بات یہ ہے کہ صفدر جنگ ہسپتال کے ایلوپیتھی عملہ کا بھرپور تعاون بھی مل رہا ہے۔

ع ح: حکومت کی جانب سے طب یونانی کے فروغ کے لیے کیا اقدامات کیے جارہے ہیں؟

س ا خ: وزارت آیوش کے قیام سے طب یونانی کا استحکام یقینی ہوگیا ہے۔ ہماری تحریک پر ممتاز مجاہد آزادی مسیح الملک حکیم اجمل خاں کے یوم پیدائش کو حکومت ہند نے نیشنل یونانی میڈیسن ڈے کے طور پر ہر سال 11 فروری کو منظوری دے کر بڑا قدم اٹھایا ہے۔ ایمس یونانی اور نیشنل یونانی یونیورسٹی کے قیام کا منصوبہ بھی زیرغور ہے۔ امید ہے کہ مرکزی حکومت اس کے لیے بھی جلد قدم آگے بڑھائے گی۔

ع ح: طب یونانی کی باتیں بہت ہوگئیں اب اردو زبان و

ادب کی بات کرتے ہیں۔ آپ پچھلے 20 برسوں سے عالمی یوم اردو کا انعقاد کرتے آرہے ہیں۔ کیا اردو کو ایک دن میں محدود کردینا مناسب ہے؟ اس دن کے منانے کی کوئی خاص وجہ؟

س ا خ: دراصل مرکزی حکومت کی ملازمت سے بہت سے تجربات حاصل ہوئے۔ اس میں یہ بھی پایا کہ اپنے کاموں کا جائزہ ہر سال لینا چاہیے اور محاسبہ کرنا چاہیے کہ ہم نے گزرے سال میں کیا کھویا اور کیا پایا۔ اسی بنیاد پر آئندہ کا لائحہ عمل طے کیا جاتا ہے۔ واضح ہو کہ 'اردو ڈے' منائے جانے کا بنیادی مقصد سالانہ محاسبہ کرنا ہے نہ کہ سال میں صرف ایک دن۔

ع ح: عالمی یوم اردو کے لیے علامہ اقبال کے یوم پیدائش کو ہی آپ نے کیوں چنا؟ میر و غالب یا پھر امیر خسرو کی تاریخ پیدائش کو بھی تو منتخب کیا جاسکتا تھا؟

س ا خ: دراصل ہمارے لیے ہر شاعر وادیب قابل قدر ہے۔ مگر علامہ اقبال کے یوم پیدائش کا انتخاب محض اُن کی صلاحیت اور آفاقی شخصیت کی بنیاد پر کیا گیا ہے۔ دوسرے ان کا اردو میں قومی ترانہ 'سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا' کے مقابلے تقریباً 118 سال گزرنے کے بعد بھی کسی بھی زبان کے شاعر کے حصے میں اس معیار کا کلام نہیں آیا۔ اس کے علاوہ علامہ اقبال ہر طبقہ فکر میں یکساں مقبول بھی ہیں۔

ع ح: آپ کے عالمی یوم اردو کے انعقاد سے فروغ اردو کی کوششوں کو کس قدر مضبوطی ملی ہے؟ کیا یوم اردو دہلی کے ساتھ ساتھ دوسرے شہروں میں بھی منایا جاتا ہے؟

س ا خ: الحمدللہ ملک و بیرون ملک میں بڑے پیمانے پر لوگ اُردو ڈے منانے کا اہتمام کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ گزشتہ برس بی بی سی لندن نے 9 نومبر کو اردو ڈے کے انعقاد کے موقع پر علامہ اقبال کو نوبل انعام کے لیے مطالبہ بھی کیا تھا۔

ع ح: آپ اس دن اردو زبان وادب اور صحافت سے وابستہ کئی افراد کو ایوارڈ بھی دیتے ہیں۔ ان انعامات کے لیے کن بنیادوں پر لوگوں کا انتخاب کیا جاتا ہے؟

س ا خ: اس کے لیے ایک کمیٹی ہے اور ہم ملک میں جو لوگ اردو کی حقیقی ترقی کے لیے کام کرتے ہیں اُن کا بایوڈاٹا حاصل کرکے بطور حوصلہ افزائی انعام دیتے ہیں۔ اس میں ہندی اخبارات کے وہ صحافی بھی شامل ہوتے ہیں جو حقیقت میں صحافت کا حق ادا کرتے ہیں۔

ع ح: اتنی بڑی تقریب کے لیے مالی تعاون کہاں سے فراہم ہوتا ہے؟ کیا حکومت سے آپ نے کبھی مالی اعانت لی ہے؟

س ا خ: دراصل ہمیں کبھی بھی براہ راست حکومت سے کوئی تعاون نہیں ملا۔ البتہ راجستھان اردو اکیڈمی اور دہلی اردو اکیڈمی سے Collaboration کے طور پر کئی مرتبہ تعاون مل چکا ہے۔ 9 نومبر عالمی یوم اردو کے موقع پر ہر سال کسی عظیم شخصیت کی حیات وخدمات پر مجلّہ 'عالمی یوم اردو' شائع کیا جاتا ہے، جس کی ادارت میں معروف صحافی جاوید اختر، سہیل انجم اور محمد عارف اقبال شامل ہیں۔ اب تک قاضی محمد عدیل عباسی، ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی، علامہ محمد اقبال، مولانا محمد مسلم، مولانا عثمان فارقلیط، محفوظ الرحمٰن، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا ابواللیث اصلاحی، مولانا حامدالانصاری انجم، پروفیسر جگن ناتھ آزاد اور منشی پریم چند کی حیات وخدمات پر 'عالمی یوم اردو' یادگار مجلّہ شائع ہوچکا ہے۔ اس مجلّہ میں اشتہار کے ذریعے اور استقبالیہ کمیٹی کے ممبران کے ذریعے جو رقم اکٹھا ہوتی ہے اُس رقم سے ہم اپنی تقریب کا اہتمام کرتے ہیں۔

ع ح: آپ کے حوالے سے خبریں ہمیشہ اخبارات کی زینت بنتی رہتی ہیں۔ کبھی آپ میڈیکل کیمپ لگاتے ہیں، کبھی سمینار کراتے ہیں تو کبھی بچوں کا نعتیہ مقابلہ۔ آپ کے گھر والے قابل تعریف ہیں کہ آپ کو گھر کے کاموں سے بری الذمہ کررکھا ہے۔ اتنے پروگراموں کو کرانے کے لیے وقت کیسے نکال پاتے ہیں؟

س ا خ: حقیقت میں میرے گھر والے اور خاندان کے افراد قابل تعریف ہیں کہ انہوں نے مجھے گھریلو کاموں کے بارے آزاد کررکھا ہے۔ میں عام طور سے روزانہ 14 گھنٹے کام کرتا ہوں۔ آرام صرف رات گیارہ بجے سے فجر تک ہی ممکن ہو پاتا ہے۔ یہ اللہ کا کرم ہے کہ اس نے ایمان اور صحت کی دولت عطا کی ہے۔

ع ح: اکیسویں صدی سائنس وٹکنالوجی کی صدی ہے، اب لوگ موبائل اور انٹرنیٹ کے رسیا ہیں۔ ایسے میں کتابوں کی اہمیت کم ہورہی ہے۔ آپ کے خیال میں ہم موجودہ دور میں کس طرح اردو کا فروغ کرسکتے ہیں؟

س ا خ: ہر دور میں رائج وسائل سے استفادہ کرنا لازمی ہے۔ موجودہ دور میں انٹرنیٹ سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے پورٹیل ویڈیوز کا بڑا کردار ہے۔ اس پر منصوبہ بند طریقے سے عمل کرنا چاہیے۔

ع ح: اردو زبان کے مستقبل کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

س ا خ: اردو زبان کا مستقبل روشن ہے۔ اردو زبان بہت طاقتور اور پُرکشش ہے اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ دوسرے نوجوان دلوں کی دھڑکن کا احساس بھی اس زبان میں موجود ہے۔ جو بھی اس کے نغمے اور مکالمے سنتا ہے تو وہ اس کا گرویدہ ہوجاتا ہے اور اس کو سیکھنے اور سمجھنے کی طرف اس کی طبیعت راغب ہوجاتی ہے۔

ع ح: اردو کتابوں سے قاری کو کس طرح جوڑا جاسکتا ہے؟

س ا خ: دورحاضر میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور ملک بھر میں قائم اردو اکیڈمیز اس ذمے داری کو ایمانداری سے نبھائیں تو قاری خود بخود جڑ جائیں گے۔

ع ح: آج اردو زبان کو روزگار سے جوڑنے کی باتیں کی جارہی ہیں؟ آپ کے خیال میں اردو کو صحیح معنوں میں فروغ دینے کی کیا کوششیں ہوسکتی ہیں؟

س ا خ: جو لوگ اردو کو روزگار سے جوڑنے کی بات کر رہے ہیں شاید اُن کی معلومات میں کمی ہے۔ دوسری زبانوں کی طرح اردو بھی روزگار سے جڑی ہوئی ہے۔ ملک میں سرکاری اردو اساتذہ (پرائمری تا جامعات سطح تک) ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ پرائیویٹ سطح پر بھی مختلف نوعیت کے کام کرنے والے اردو داں بڑی تعداد میں روزگار سے جڑے ہوئے ہیں۔ جن سات ریاستوں خاص طور سے دہلی، بہار، بنگال، اترپردیش، آندھرا پردیش اور تلنگانہ وغیرہ میں اردو دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل کرچکی ہے۔ ان ریاستوں میں دیگر علاقائی زبانوں کی طرح سرکاری نوکریوں میں اردو کی تعلیم لازمی ہونی چاہیے۔ مطالبات ہورہے ہیں۔ امید ہے کہ ریاستی حکومتیں اس جائز مطالبہ کو جلد ہی تسلیم کرلیں تو مزید روزگار کے نہ صرف مواقع فراہم ہوں گے بلکہ اردو زبان پڑھنے والوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوگا۔

ع ح: اپنی غیر ادبی دلچسپی اور شوق کے بارے میں کچھ بتائیں؟

س ا خ: حقیقت میں ادبی محفلوں اور مشاعروں میں مجھے بڑی دلچسپی ہے مگر قلت وقت کے باعث بہت کم شرکت ہو پاتی ہے۔ پھر بھی اگر تھوڑا بھی موقع ملتا ہے تو شرکت کرتا ہوں اور شعری نشستوں میں تعاون بھی کرتا ہوں۔ غیر ادبی دلچسپی صرف طبابت اور تحقیقی کاموں میں رہتی ہے۔ تنظیمی کاموں کو بحسن وخوبی انجام دینا میرا شوق ہے۔

ع ح: اردو دنیا کے قارئین کے لیے کوئی پیغام۔

س ا خ: اپنے دوستوں کو کتابوں اور رسائل کا تحفہ پیش کریں اور اردو دنیا و دیگر معیاری رسائل کو اپنی میز کی زینت بنائیں تاکہ دوسرے احباب راغب ہوسکیں۔ اس کے علاوہ اپنی بات اپنے جذبات واحساسات کو قلم بند کرکے ایڈیٹر اردو دنیا کو ارسال کریں۔ اس طرح آپ عملی طور پر اردو دنیا سے جڑیں گے۔

Abdul Hai
ahaijnu@gmail.com

ولیم شیکسپیئر کا ڈرامہ

میکبیتھ

ادب کا شاہکار فن پارہ

محبوب حسن

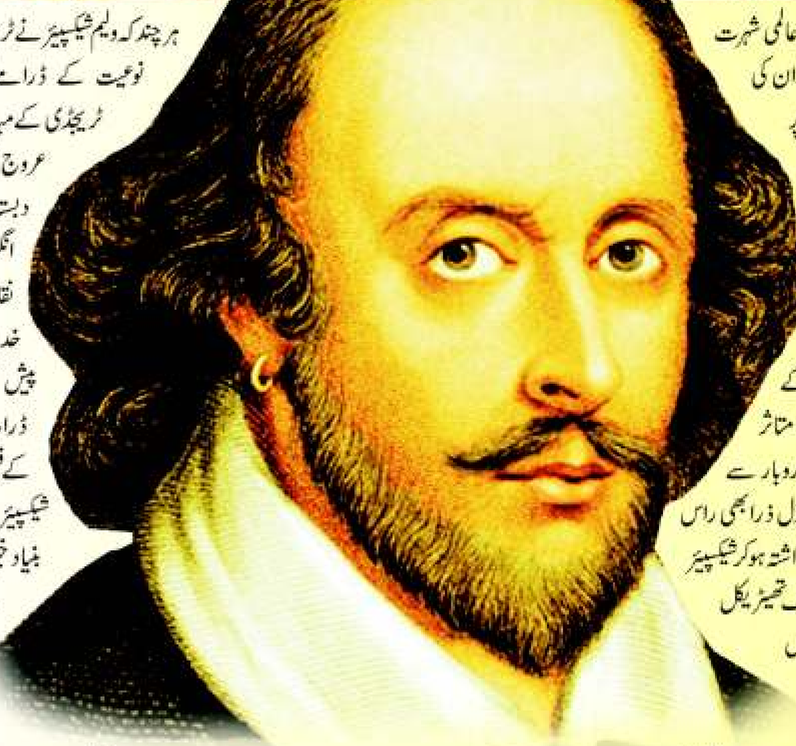

ولیم شیکسپیئر کا شمار انگریزی کے عالمی شہرت یافتہ ادیبوں و فن کاروں میں ہوتا ہے۔ ان کی پیدائش انگلینڈ کی Avon ندی کے تٹ پر ایک چھوٹے سے قصبے Stratford میں 26/ اپریل 1564 کو ہوئی۔ والد جان شیکسپیئر کے کاروبار میں مسلسل نقصان ہونے کے سبب انھیں زندگی کے ابتدائی دنوں میں معاشی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ان نامساعد حالات کے سبب ان کی تعلیمی زندگی بری طرح متاثر ہوئی۔ والد جان شیکسپیئر اپنے بیٹے کو کاروبار سے منسلک کرنا چاہتے تھے لیکن انھیں یہ ماحول ذرا بھی راس نہ آیا۔ ان ناسازگار حالات سے دل برداشتہ ہو کر شیکسپیئر لندن پہنچے، جہاں ان کا رابطہ وہاں کی مختلف تھیٹریکل کمپنیوں سے ہوا۔ در اصل بیس برسوں پر مشتمل وہاں کی تخلیقی سرگرمی ولیم شیکسپیئر کی ادبی زندگی میں راہ کا پتھر ثابت ہوئی۔ قدرت نے ولیم شیکسپیئر کو بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ اگر ولیم شیکسپیئر کے بے مثل ادبی کارناموں اور ان کی تخلیقی کائنات کو ایک الگ دبستان کا نام دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ عالمی ادب کا یہ انوکھا فن کار صفحۂ قرطاس پر اپنے انمٹ نقوش ثبت کرتے ہوئے 23/ اپریل 1616 کو دنیائے آب و گل سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گیا۔

لندن میں دوران قیام شیکسپیئر نے وہاں کی مختلف تھیٹریکل کمپنیوں کے لیے بہت سے اہم ڈرامے تحریر کیے۔ موصوف نے شاعری اور نثر دونوں میدانوں میں اپنی انفرادیت کا پرچم لہرایا لیکن ان کی کلیدی شناخت ایک ڈرامہ نگار کی حیثیت سے ہے۔ انھوں نے کل 38 ڈرامے تخلیق کیے ہیں، جن میں "Macbeth" "King Lear" "Othelo" اور "Hamlet" بطور المیہ غیر معمولی شہرت سے ہم کنار ہوئے۔ شیکسپیئر کی ادبی عظمت کی روشن دلیل یہ ہے کہ ان کے ڈراموں کے ترجمے دنیا بھر کی زبانوں میں ہوئے۔ اردو میں احسن لکھنوی اور آغا حشر کاشمیری وغیرہ نے ولیم شیکسپیئر کے ڈراموں کے حوالے سے قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ آغا حشر کاشمیری نے الفریڈ اور شیکسپیئر تھیٹریکل کمپنی کے تحت ان کے چند اہم ڈراموں کو اسٹیج پر بھی پیش کیا۔ اپنی بیش بہا خدمات کے سبب آغا حشر کاشمیری ہندوستان کے شیکسپیئر کہلائے۔

ہر چند کہ ولیم شیکسپیئر نے ٹریجڈی اور کامیڈی دونوں نوعیت کے ڈرامے تخلیق کیے ہیں، تاہم ٹریجڈی کے میدان میں ان کا فن اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ مختلف دبستان تنقید سے وابستہ انگریزی کے بلند پایہ نقادوں نے شیکسپیئر کی تخلیقی خدمات کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ شاہکار المیہ ڈرامہ "Macbeth" ان کے فن کی معراج ہے۔ ولیم شیکسپیئر نے ڈرامہ ''میکبیتھ'' کی بنیاد خیر و شر کے تصادم پر رکھی ہے۔ انگریزی کے بلند پایہ نقاد Edward Dowden نے حق و باطل کی کشمکش کو ہی ان کے ڈراموں کی کلیدی اساس قرار دیا ہے۔

انگریزی ادب میں ولیم شیکسپیئر ایک روایت شکن فنکار کی حیثیت سے نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ جدت پسند تخلیقی مزاج کے حامل ولیم شیکسپیئر نے اپنی بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں کی بنیاد پر انگریزی ڈرامے کی رگوں میں جمالیاتی حسن کا تازہ لہو دوڑایا۔ موصوف نے اپنے پیش رو ڈرامہ نگاروں کی قائم کردہ روایات کو یکسر نظر انداز نہیں کیا بلکہ اسے نت نئی تخلیقی جہتیں عطا کیں۔ المیہ ''میکبیتھ'' ان کی جدت پسند طبیعت اور تخیل کی بلند پروازی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ ناظرین کی دلچسپی کے پیش نظر ولیم شیکسپیئر نے اس ڈرامے کو اسٹیج کے ہر ممکنہ لوازمات سے آراستہ کیا ہے۔

مذہبی عقیدت یا کسی ازم/ نظریہ کے برعکس انھوں نے اپنے ڈراموں میں زندگی کی آفاقی وروشن قدریں پیش کی ہیں۔ در اصل ''میکبیتھ'' Melodramatic نوعیت کا ایک ایسالافانی ڈرامہ ہے،جس میں خیرو شر کی کشمکش اورجرم وتشدد کی انتہا آشکارا ہے۔اس ڈرامے کی بنیاد پر مختلف ملکوں کی زبانوں میں بہت سی کامیاب فلمیں بنیں۔ ہندوستان کے معروف فلم ڈائریکٹر ویشال بھاردواج کی ہدایت میں ''میکبیتھ'' پرمبنی فلم ''مقبول'' 2003 میں منظر عام پر آئی، جسے مختلف طبقات میں یکساں مقبولیت حاصل ہوئی۔ پانچ ایکٹ پر مشتمل ڈرامہ "Macbeth" میں کرداروں کی خاصی تعداد موجود ہے۔میکبیتھ اور لیڈی میکبیتھ زیر مطالعہ ڈرامے کے مرکزی کردار ہیں۔ڈرامے کے دوسرے اہم کرداروں میں ڈنکن، میلکم، ڈونالبین، بینکو، میڈکف، لیناکس اور فلئینس وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ولیم شیکسپیئر نے ڈنکن کواسکاٹ لینڈ کے راجہ کے روپ میں پیش کیا ہے جبکہ میلکم اورڈونالبین ڈنکن کے صاحب زادے ہیں۔میکبتھ اوربینکو راجہ ڈنکن کی شاہی فوج میں سپہ سالار کے عہدے پر فائز ہیں۔فلئینس ڈنکن کے دوسرے سپہ سالار بینکو کا بیٹا ہے۔انسانی نفسیات کے نباض ولیم شیکسپیئر کے کردار مٹی کے مادھونہیں بلکہ فطری طور پرڈرامے کے پلاٹ کی ترنگوں پر اٹکھیلیاں کرتے نظر آتے ہیں۔

ڈرامہ "Macbeth" کا آغاز جنگ وجدال کے خطرناک ماحول میں ہوتا ہے۔بادشاہ ڈنکن کا ایک قریبی رشتہ دار میکڈونوالڈ اس کے خلاف بغاوت چھیڑ دیتا ہے۔ اس غیر متوقع صورت حال سے ڈنکن بے انتہا فکرمند ہوتا ہے۔وہ اپنے دونوں سپہ سالاروں میکبتھ اور بینکو کواس بغاوت کو کچلنے کے لیے بھیجتا ہے۔میکبتھ اور بینکو میکڈونو الڈ کی فوج کے خلاف نہایت بہادری سے لڑتے ہوئے فتح یاب ہوتے ہیں۔میکبتھ اور بینکو میدان جنگ سے واپس ہورہے تھے کہ راستے میں اچانک ان کی ملاقات تین چڑیل بہنوں سے ہوتی ہے۔یہ تینوں چڑیلیں میکبیتھ اور بینکو کے متعلق پیشین گوئی کرتی ہیں۔ پہلے وہ میکبیتھ کو مستقبل قریب میں اسکاٹ لینڈ کا راجہ بننے کی بات کہتے ہوئے اس کا خیر مقدم کرتی ہیں۔بینکو کے بارے میں کہتی ہیں کہ وہ بذات خود راجہ نہ بن سکے گا لیکن اس کا بیٹا کبھی نہ کبھی اسکاٹ لینڈ کا حکمراں ضرور ہوگا۔ چڑیلوں کے دام فریب میں پھنس کر میکبیتھ اسکاٹ لینڈ کا راجہ بننے کا خواب دیکھتا ہے۔وہ ایک خط کے ذریعے اپنی بیوی لیڈی میکبیتھ کو بھی اس بات کی خبر دیتا ہے۔یہ خبر پڑھتے ہی اس کی بیوی بے چین ہو جاتی ہے۔اپنے خواب کوشرمندہ تعبیر کرنے کے لیے وہ راجہ ڈنکن کے قتل کی خوف ناک سازش رچتی ہے۔ فتح کی اس خوشی میں ڈنکن میکبیتھ کے یہاں مہمان بن کر جاتا ہے۔اپنی بیوی لیڈی میکبیتھ کے بار بار سمجھانے کے باوجود وہ ڈنکن کا قتل کرنے سے انکار کرتا ہے۔لیکن اپنی بیوی کے بار بار اکسانے پر وہ اس گناہ عظیم کے لیے راضی ہو جاتا ہے۔ڈنر کے بعد راجہ ڈنکن کوآرام کرنے کے لیے ایک الگ کمرے کا انتظام کیا جاتا ہے۔میکبیتھ تیز دھار ہتھیار کے ساتھ ڈنکن کی خواب گاہ میں داخل ہوتا ہے۔خنجر کے ایک ہی وار سے راجہ کا سر دھڑ سے الگ ہو جاتا ہے۔ لیڈی میکبیتھ گہری نیند میں سو رہے ڈنکن کی خدمت میں مامور دونوں ملازمین کے جسم پر نہایت چالاکی سے خون کے چھینٹے ڈال دیتی ہے تاکہ قتل کا الزام ان پر لگ سکے۔ڈنکن کے قتل کے بعد میکبیتھ بار بار اپنے جسم پر لگے خون کے دھبوں کودھونے کی ناکام کوشش کرتا ہے۔اپنے والد کے قتل کی خبر سنتے ہی اس کے دونوں صاحبزادے میلکم اورڈونالبین انگلینڈ اورآئرلینڈ بھاگ جاتے ہیں۔

ڈنکن کے قتل کے بعد میکبیتھ اسکاٹ لینڈ کا حکمراں بن جاتا ہے۔اس طرح چڑیلوں کی پیشین گوئی سچ ثابت ہوتی ہے۔اسکاٹ لینڈ کا حکمراں بننے کے بعد میکبیتھ ظلم کی ساری سرحدیں پار کر جاتا ہے۔ چڑیلوں کی باتوں کو یاد کر کے اسے بینکواوراس کے بیٹے فلئینس سے خطرہ محسوس ہوتا ہے۔بینکواور فلئینس کوصفحہ ہستی سے مٹانے کے لیے ان دونوں کومیکبیتھ کی شاہی دعوت میں مدعو کیا جاتا ہے۔ پہلے سے طے شدہ سازش کے تحت بینکو دوران سفر مارا جاتا ہے جبکہ اس کا بیٹا فلئینس کسی طرح اپنی جان بچانے میں کامیاب ہوتا ہے۔ شیطانی طاقتوں کے فریب میں گرفتار میکبیتھ ایک بار پھر چڑیلوں سے ملنے اسی بنجر وسنسان علاقے میں جاتا ہے۔یہ

ولیم شیکسپیئر نے ڈنکن کو اسکاٹ لینڈ کے راجہ کے روپ میں پیش کیا ہے جبکہ میلکم اورڈونالبین ڈنکن کے صاحب زادے ہیں۔ میکبتھ اوربینکو راجہ ڈنکن کی شاہی فوج میں سپہ سالار کے عہدے پر فائز ہیں۔ فلئینس ڈنکن کے دوسرے سپہ سالار بینکو کا بیٹا ہے۔انسانی نفسیات کے نباض ولیم شیکسپیئر کے کردار مٹی کے مادھونہیں بلکہ فطری طور پرڈرامے کے پلاٹ کی ترنگوں پر اٹکھیلیاں کرتے نظر آتے ہیں۔

چڑیل بہنیں میکبیتھ کو میکڈف سے ہوشیار رہنے کا مشورہ دیتی ہیں۔ان تخریبی عناصر کے ذریعے میکبیتھ کو یہ بات ذہن نشیں کرائی جاتی ہے کہ کسی عورت سے پیدا شدہ شخص اسے مارنہیں کرسکتا۔وہ صرف اسی صورت میں شکست کھا سکتا ہے جب ویرنام جنگل ڈنسینین پہاڑی کے اوپر آ جائے!آخر میں چڑیلیں اسے اسکاٹ لینڈ کے بادشاہوں کی ایک فہرست دکھاتی ہیں، جس میں بینکو کے بیٹے فلئینس کا نام سب سے اوپر ہوتا ہے۔میکبیتھ ان اندھی قوتوں کی جھوٹی باتوں پردوبارہ اعتبار کر لیتا ہے۔اُدھر میکڈف اپنے بیوی بچوں کوچھوڑ کرڈنکن کے صاحبزادے میلکم کا ساتھ دینے انگلینڈ چلا جاتا ہے۔اس بات کی اطلاع ملتے ہی میکبیتھ اس کے بیوی بچوں کا بے رحمی سے قتل کر دیتا ہے۔ انسانی لاشوں سے شروع ہونے والا یہ سیاسی سفرجلد ہی دونوں کی تباہی وبربادی کا باعث بنتا ہے۔اس دردوالم سے نجات کے لیے لیڈی میکبیتھ خود کشی کرنے پرمجبور ہوتی ہے۔اس کی موت کی خبر سے میکبیتھ غم سے نڈھال ہو جاتا ہے۔

شہزادہ میلکم اپنے والد کے قتل کا انتقام لینے میکڈف کے ساتھ اسکاٹ لینڈ آتا ہے۔وہ اس جابر بادشاہ سے جنگ کا اعلان کرتا ہے۔میکبیتھ اپنے دشمن میلکم اور میکڈف سے لڑنے کے لیے میدان

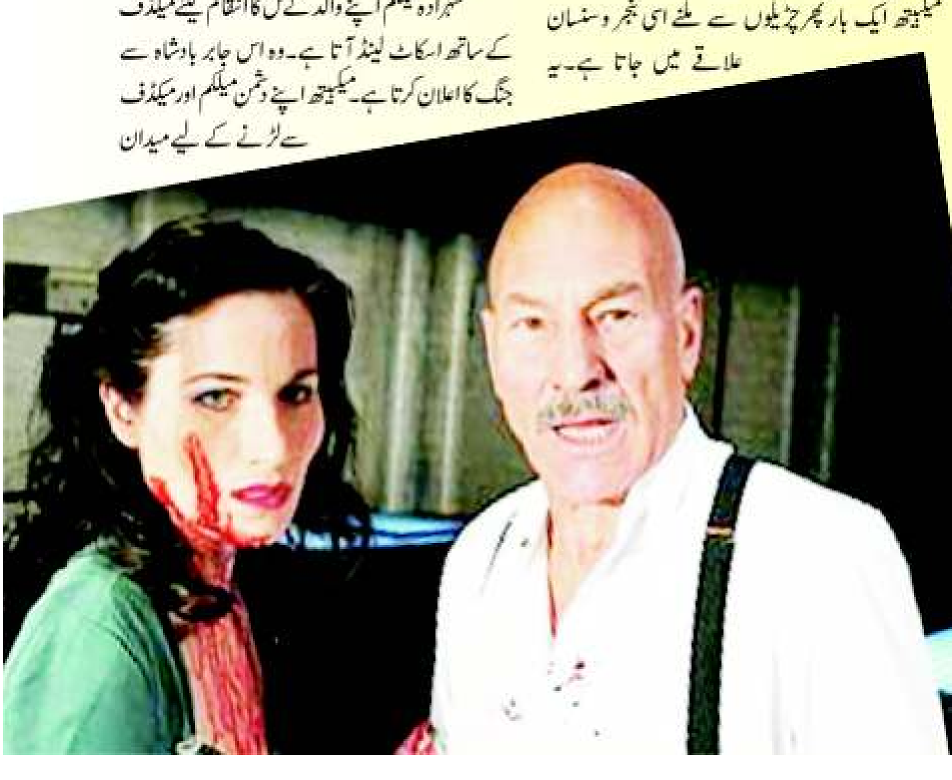

جنگ میں پہنچتا ہے۔ دوسری جانب میکڈف اپنی فوج کے ہمراہ ڈسنینین پہاڑی کی جانب گامزن ہوتا ہے۔ اپنی تعداد چھپانے کی غرض سے پوری فوج ویرنام جنگل کے درختوں کی بڑی بڑی شاخوں سے خود کو ڈھک لیتی ہے۔ ایسا معلوم پڑتا ہے کہ پورا ویرنام جنگل ہی ڈسنینین پہاڑی کے اوپر چڑھ رہا ہے۔ یہ حیرت ناک منظر دیکھ کر میکبیتھ کے سامنے چڑیلوں کی پیشین گوئی کی حقیقت عیاں ہو جاتی ہے۔ اپنے جانی دشمن میکڈف کو دیکھتے ہی میکبیتھ کہتا ہے کہ کسی عورت سے پیدا شدہ شخص مجھے نہیں مار سکتا۔ میکڈف جواب دیتا ہے کہ میں وقت سے پہلے ہی اپنی ماں کے پیٹ سے چیر کر نکالا گیا تھا۔ یہ سنتے ہی میکبیتھ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے۔ آخر کار میکبیتھ میکڈف کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ اس طرح چڑیلوں کی آخری پیشین گوئی سے بھی پردہ اٹھتا ہے۔ حق کی فتح اور باطل کی شکست کے ساتھ ہی ڈرامہ "Macbeth" کا پلاٹ اختتام پذیر ہوتا ہے۔

ڈرامہ نگاری کے فن کا رمز شناس ولیم شیکسپیئر نے پوری دنیا میں اپنی تخلیقی عظمت کا لوہا منوایا۔ کئی صدیاں گزر جانے کے بعد بھی اس قابل رشک فنکار کی مقبولیت و ہردل عزیزی میں ذرہ برابر کمی نہیں آئی۔ انھوں نے اپنے ڈراموں کی فنی و تکنیکی خوبیوں پر خصوصی توجہ صرف کی ہے۔ ولیم شیکسپیئر کے ڈرامے پلاٹ و کردار کی چستی، مکالمے و زبان و بیان کی دلکشی اور اسلوب و طرز بیان کی ندرت کے اعتبار سے اپنا جواب نہیں رکھتے۔ موصوف نے ڈرامہ نگاری کے فن پر کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی بلکہ "Whole world is stage" جیسے مقولے کو اپنی تخلیقی بصیرت کا ذریعہ تصور کیا۔ ولیم شیکسپیئر نے ارسطو کے قائم کردہ اصول ''وحدت ثلاثہ'' پر عمل کرتے ہوئے اپنے تخلیقی حسن کو آب و تاب عطا کی۔ ان کے ڈراموں میں وحدت زماں (Unity of time) وحدت مکاں (Unity of place) اور وحدت عمل (Unity of action) کا خوبصورت امتزاج نظر آتا ہے۔ اس ضمن میں ڈرامہ ''میکبیتھ'' کو معتبر حوالے کی شکل میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ دراصل اس ڈرامے کی کامیابی و دلکشی کا اصل راز اس کے خوبصورت پلاٹ اور عمدہ کردار نگاری میں پوشیدہ ہے۔ "Macbeth" کا پلاٹ نہایت سادہ و عام فہم ہے۔ اس میں کسی قسم کی پیچیدگی اور الجھاؤ نہیں ہے۔ ''میکبیتھ'' کا پلاٹ اپنے آغاز، وسط اور نقطۂ عروج سے ہوتے ہوئے بے حد منطقی انداز میں اپنے اختتام کو پہنچتا ہے۔ ولیم شیکسپیئر نے اس ڈرامے میں ضمنی پلاٹ سے شعوری طور پر اجتناب برتا ہے جبکہ ان کے دوسرے اہم ڈرامے "King Lear" اور "Hamlet" میں ذیلی واقعات کی شمولیت ملتی ہے۔

ولیم شیکسپیئر نے اسٹیج کے توسط سے ڈرامے کی فنی و تکنیکی باریکیوں کا عملی مشاہدہ کیا۔ انھوں نے اپنے بیشتر ڈراموں میں Soliloquy یعنی خود کلامی کو ایک اہم فنی حربے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ڈرامہ نگار اس فنی آلہ کے توسط سے کرداروں کی ذہنی و نفسیاتی کیفیات کو اجاگر کرنے کی کاوش کرتا ہے۔ علاوہ ازیں خود کلامی بعض اوقات پلاٹ و واقعات کی گتھیاں سلجھانے میں بھی کارآمد ہوتی ہے۔ ولیم شیکسپیئر کے ڈرامے ''میکبیتھ'' میں Soliloquy ایک ناگزیر فنی Tool کی حیثیت رکھتی ہے۔ ڈرامے کے ہیرو میکبیتھ اور ہیروئن لیڈی میکبیتھ کی خود کلامی قارئین کو Katharsis یعنی تزکیہ نفس کے لیے مجبور کرتی ہے۔

تخلیقی انفرادیت کی ایک خاص وجہ اس کی جاندار کردار نگاری اور مکالمہ نگاری ہے۔ پیش نظر ڈرامے کے کردار ناسازگار حالات سے گھبراتے نہیں ہیں بلکہ اس کے اندر بے رحم وقت سے آنکھ ملانے کا حوصلہ موجود ہے۔ کرداروں کی زبان سے ادا ہونے والے مکالمے ان کی ذہنی کیفیت اور ان کے طبعی مزاج و میلانات کے عین موافق ہیں۔ اپنی فکری بصیرت، فنی ادراک، سماجی شعور، سیاسی آگہی اور تخلیقی توانائی کو بروئے کار لاتے ہوئے شیکسپیئر نے انگریزی ادب کو کئی لازوال کردار دیے ہیں۔

میکبیتھ ڈنکن کی شاہی فوج کا وفادار سپہ سالار ہے۔ بہادری اور قابلیت کے سبب شاہی دربار میں اسے خاص عزت و احترام حاصل ہے۔ لیکن ہوس پرستی اسے قابل رحم بربادی کی تاریکی میں غرق کر دیتی ہے۔ ایک رحم دل

بادشاہ کے تئیں بے وفائی و غداری میں اس کی بیوی لیڈی میکبیتھ بھی برابر کی شریک کار ہوتی ہے۔ شیکسپیئر نے چڑیلوں کو تخریبی قوت کی علامت کے طور پر پیش کیا ہے، یہ ایک فطری امر ہے کہ نیک اور وفادار انسان حد سے بڑھی ہوئی امید و لالچ کے سبب بربادی و تباہی کے خونی پنجے کا شکار ہو جاتا ہے۔ شاد عظیم آبادی نے حد سے بڑھی ہوئی امیدوں کو بجا طور پر طلسمی سانپ سے تشبیہ دی ہے۔ شیکسپیئر نے اپنے لازوال کردار میکبیتھ اور لیڈی میکبیتھ کے توسط سے زندگی کی اس تلخ حقیقت کو آئینہ دکھایا ہے۔ Thrill اور Suspence کی فضا میں سانس لینے والے یہ کردار انسانی زندگی کی آفاقی قدروں کی فلسفیانہ توضیحات پیش کرتے ہیں۔ ڈرامے کا ہیرو میکبیتھ اپنے گناہوں کے شعلوں میں جھلنے پر مجبور ہوتا ہے تو لیڈی میکبیتھ اپنے گناہوں کا بوجھ برداشت نہیں کر پاتی۔ میکبیتھ اضطرابی کیفیت میں کبھی خنجر کو ہوا میں لہراتے ہوئے دیکھتا ہے تو کبھی نیند کی حالت میں یکا یک چیخ اٹھتا ہے۔

اسکاٹ لینڈ کے راجہ ڈنکن اور سپہ سالار بینکو کے قتل کے بعد میکبیتھ اور لیڈی میکبیتھ بے انتہا روحانی کرب سے گزرتے ہیں۔ انسانی لاشوں اور خون کے دھبوں کا احساس شوہر بیوی دونوں کو مضطرب رکھتا ہے۔ لیڈی میکبیتھ خون کے گہرے دھبوں و چھینٹوں کو صاف کرنے کے لیے اپنے دونوں ہاتھوں کو بار بار رگڑتی ہے۔ واضح رہے کہ ڈرامہ ''میکبیتھ'' موت و تباہی کی کھتونی نہیں ہے بلکہ اس سے انسان کی فطری خامیوں و کمزوریوں کے سیاق میں عقل و دانش اور فکری بصیرت کی روشنی پھوٹ رہی ہے۔

ولیم شیکسپیئر نے اپنے کرداروں کی تشکیل میں نیکی و بدی اور خیر و شر دونوں پہلوؤں کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مرکزی کردار فطری انداز میں ناظرین کو اپنی جانب متوجہ کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ ان کے اندر زندگی کی رمق اور فطری پن موجود ہے۔ کارلائل نے ولیم شیکسپیئر کو فطرت کا نباض کہا ہے۔ ڈرامہ ''میکبیتھ'' کی

مغربی دانشوروں ونقادوں نے جدوجہد، کشمکش اور تصادم جیسے عناصر کا شمار ڈرامے کی بنیادی خوبیوں میں کیا ہے۔اس امر کی تفہیم اس طرح بھی کی جاسکتی ہے کہ یہ دنیا ایک اسٹیج کی مانند ہے اور ہم انسان بحیثیت کردار ''زندگی'' نامی ڈرامے میں مصروف عمل ہیں۔اگر انسان جہد مسلسل سے محروم ہو جائے تو زندگی بے معنی ہو جاتی ہے۔ولیم شیکسپیئر کے ڈرامے زندگی کے اس فلسفے کی تعبیر وتشریح میں ہماری معاونت کرتے ہیں۔ڈرامائی تصادم وکشمکش کی ڈور شیکسپیئر کے ہاتھوں سے کبھی نہیں چھوٹتی۔ "Macbeth" کی یہی خوبی ناظرین کو استعجاب کی پر خطر راہوں سے گزارتی ہے۔شیکسپیئر کا یہ ڈرامہ کشمکش حیات کی ایک نئی شعریات پیش کرتا ہے۔ڈرامہ "Macbeth" میں داخلی تصادم پیدا کرنے کے لیے موصوف نے Supernatural Elements یعنی اساطیری عناصر کو شعوری طور پر شامل کیا۔دراصل ولیم شیکسپیئر کے عہد میں دیومالائی واساطیری عناصر کے استعمال کا چلن عام تھا۔ انسان کی فطری کمزوریوں و خامیوں کو اجاگر کرنے کی غرض سے ''میکبیتھ'' میں چڑیلوں کو علامتی حربے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔اردو کے چند ایک ڈراموں میں بھی اساطیری عناصر کی جھلک موجود ہے۔محمد حسن کا معروف ترین ڈرامہ ''ضحاک'' اس کی عمدہ مثال ہے۔ اس ڈرامے کے مرکزی کردار ضحاک کے شانوں پر اگنے والے دوسانپ اور انسانی بھیجا تجویز کرنے والا شیطان اس کی بین ثبوت ہیں۔''میکبیتھ'' کی چڑیلوں کی طرز پر یہ بوڑھا شیطان بھی ضحاک کو حیوانیت کے اندھیروں میں بھٹکنے پر مجبور کرتا ہے۔ان دونوں ڈراموں میں مستعمل دیومالائی عناصر کے پس پشت یکساں مقاصد کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ڈرامہ ''میکبیتھ'' کے پلاٹ کا آغاز ہی تین چڑیلوں کی آمد کے ساتھ ہوتا ہے۔ان چڑیل بہنوں کے ذریعے کی گئی پیشین گوئی ہی ڈرامے کے پلاٹ کو استحکام بخشتی ہے۔

ڈرامہ "Macbeth" اپنی تخلیقی توانائی کے باعث جغرافیائی ،لسانی اور زماں ومکاں کی حدود سے آزاد ہے۔ اس ڈرامے کی اشاعت کے بعد لندن میں تخلیقی محاورے کے جدید ڈسکورس کا آغاز ہوتا ہے۔ڈرامہ ''میکبیتھ'' میں قدم قدم پر تصادم اور Conflicts کی صورتیں پیش آتی ہیں۔شیکسپیئر نے اس ڈرامے کو اپنی شاعرانہ خوبیوں سے بھی مالا مال کیا ہے۔انھوں نے لندن کے تہذیبی اور روایتی لوک گیتوں سے خاطر خواہ استفادہ کیا ہے۔ولیم شیکسپیئر کے عہد میں Chorus ڈراموں کا اہم حصہ ہوا کرتا تھا، جسے چند کردار اسٹیج پر ایک ساتھ گاتے تھے۔شیکسپیئر نے ''میکبیتھ'' میں کورس کا خوبصورت اہتمام کیا ہے۔اس ڈرامے کے آغاز میں چڑیل بہنیں "Fair is foul and foul is fair" کو بطور کورس گول گول دائرے میں گھومتے ہوئے گاتی ہیں۔اسے ''میکبیتھ'' کے "Keynote" سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے۔اس کلیہ کے ذریعہ نہایت دور اندیشی کے ساتھ ڈرامے کے مرکزی نکتے کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ڈرامہ نگار نے شعری بحر/وزن کے طور پر Iambic pentameter کو استعمال کیا ہے۔ڈرامے میں "Chorus" کی دوسری عمدہ مثالیں بھی موجود ہیں۔ولیم شیکسپیئر کی تخلیقی جدت پسندی اور فنی نیرنگی اس ڈرامے کی Readibility میں بھی اضافہ کرتی ہے۔

اردو ڈرامہ ''انارکلی'' کی طرح "Macbeth" کے بارے میں بھی نقادوں کے درمیان اختلاف رائے موجود ہے۔چند ناقدین نے اسے ڈنکن کا المیہ قرار دیا ہے تو چند ایک نے میکبیتھ اور لیڈی میکبیتھ کی جانب اشارہ کیا ہے۔ بعض ناقدین نے اسے مقدر اور حالات کا بھی المیہ قرار دیا ہے۔ممتاز مغربی نقاد Snider نے ''میکبیتھ'' کو "Tragedy of imagination" قرار دیا ہے۔درحقیقت ڈنکن جیسے نیک دل بادشاہ کے ساتھ پیش آنے والا یہ اندوہناک واقعہ ناظرین کو شدید رنج وغم سے آشنا کر دیتا ہے۔ڈرامے کا ہیرو میکبیتھ اور ہیروئن لیڈی میکبیتھ خیروشر کی کشمکش سے دو چار نظر آتے ہیں۔ ہیرو میکبیتھ ایک دیانت دار سپہ سالار کے طور پر ڈنکن کے خلاف ہونے والی سیاسی بغاوت کو کچلنے میں کامیاب ہوتا ہے۔وہ اپنی اس عظیم الشان فتح کے لیے اعزاز و اکرام سے بھی سرفراز ہوتا ہے لیکن سیاسی ہوس کے باعث اس کی قابل رشک زندگی عذاب بن جاتی ہے۔ہیرو میکبیتھ سے شدید نفرت وحقارت کے باوجود ہمارے دل میں اس کے تئیں ہمدردی ومحبت کا فطری جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔''میکبیتھ'' کے ہیرو اور ہیروئن کو بے انتہا غمگین اور بے بس دیکھ کر ناظرین کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو چھلک پڑتے ہیں۔کرداروں کے ساتھ پیش آنے والی یہ عبرت ناک صورت حال ولیم شیکسپیئر کی تخلیقی تہہ داری، فکری ہمہ جہتی، نفسیاتی ژرف نگاہی اور فنی باریک بینی کی نشاندہی کرتی ہے۔روح کو تڑپانے اور قلب کو گرمانے والے ایسے مناظر ولیم شیکسپیئر کی تخلیقی عظمت اور فکری بصیرت پر دال ہیں۔اگر اس ڈرامے کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا جائے تو یہ نکتہ ابھر کر سامنے آتا ہے کہ تمام تر ناقدین ومحققین کی آرا میں جزوی سچائیاں پنہاں ہیں۔اس لیے کسی مخصوص پہلو پر اکتفا کرنا مناسب نہیں۔مذکورہ مباحث کی روشنی میں یہ بات زیادہ قرین قیاس لگتی ہے کہ "Macbeth" کرداروں کے علاوہ مقدر اور حالات کا بھی المیہ ہے۔

ولیم شیکسپیئر کی تخلیقی فتوحات کے پیش نظر یہ بات بلا مبالغہ کہی جاسکتی ہے کہ موصوف انگریزی ڈرامے کی دنیا میں تخلیقی دستخط کی حیثیت رکھتے ہیں۔جدت پسند فنکار ولیم شیکسپیئر کا ڈرامہ "Macbeth" ایک ایسا تخلیقی چراغ ہے، جس کی کرنیں ادبی فضا کو منور کرتی رہیں گی۔اپنی تخلیقی تازہ کاری وفنی توانائی کی بنا پر موصوف نے انگریزی ڈرامہ نگاری کی روایت کو کامیابی و بلندی کی اس منزل تک پہنچا دیا ہے، جہاں سے دونوں طرف ڈھلان شروع ہوتی ہے۔ان کے ڈراموں خصوصاً "Macbeth" میں انسانی زندگی کا جمال وجلال اور فنی قدروں کا حسن موجود ہے۔اس نابغہ روزگار شخصیت کی تخلیقی خدمات کے اعتراف میں ان پر سب سے زیادہ تحقیقی وتنقیدی کتابیں تحریر کی گئیں۔کسی نظریاتی وابستگی سے قطع نظر اس ادب پارے کی آزادانہ قرأت ہمیں انسانی زندگی کے نفسیاتی شعور اور فلسفیانہ رموز سے آشنا کرتی ہے۔ مختصر یہ کہ ولیم شیکسپیئر نے ''میکبیتھ'' کے روپ میں انگریزی ادب کو ایک ایسا لازوال وشاہکار ڈرامہ دیا ہے، جس کی فنی تابناکی تادیر قائم رہے گی۔

■

Dr Mahboob Hasan
Asst. Professor, Department of Urdu
Deen Dayal Upadhyay Gorakhpur University,
Gorakhpur, 273009
Mobile: 8381856066

نایاب حسن قاسمی

ابوعثمان الجاحظ
شخصیت اور ادبی امتیاز

عصرِ عباسی اپنی بے مثال علمی وادبی اور فکری وفنی خوبیوں کی وجہ سے ممتاز سمجھا جاتا ہے اور اس دور کی یہ خوبیاں اُن عظیم افراد کی وجہ سے ہیں، جنھوں نے اپنے نتائج فکر سے اسلامی وعربی ادب وفکر کو مالا مال کیا۔ ایسے ہی عظیم لوگوں میں سے ایک جاحظ بھی ہے، یہ ایک جلیل القدر ادیب، نثر نگار، دانشور اور صاحب اسلوب انشاپرداز تھا، اس کی کنیت ابوعثمان ہے اور نام عمرو بن بحر بن محبوب ہے، اس کا خاندان بنوکنانہ سے تعلق رکھتا تھا۔ جاحظ کی پیدائش بصرہ میں 160ھ (781) میں ہوئی۔ جاحظ کا گھرانہ ایک معمولی گھرانہ تھا، اس کے والدین مفلوک الحال اور معاشرے کے حاشیائی طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگ تھے، شاید اسی وجہ سے تاریخ میں اس کے ماں باپ کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا، البتہ بعض مؤرخین نے اس کے دادا کا ذکر کیا ہے، جو بنوکنانہ کے یہاں اونٹ چراتا تھا۔ جاحظ کے والد کا انتقال اس کے بچپن میں ہی ہوگیا تھا، پھر اس کی والدہ نے تمام تر عسرتوں کو جھیلتے ہوئے اس کی پرورش کی۔ گھر کی خستہ حالی کی وجہ سے جاحظ کو بچپن سے ہی تلاشِ معاش میں لگنا پڑا؛ چنانچہ وہ بصرہ میں نہر سیحان کے کنارے روٹیاں اور مچھلیاں بیچنے لگا، مگر چونکہ فطری طور پر وہ ایک ذہین اور حصول علم کا شوق رکھنے والا بچہ تھا؛ اس لیے اس نے اپنا گھر چلانے کے ساتھ وقت نکال کر بعض تعلیم گاہوں میں بھی آمد ورفت شروع کردی اور اس طرح اس نے اپنے حصول علم کا سفر بھی جاری رکھا، حتی کہ مختلف اوقات میں اس نے اخفش، اصمعی، ابوعبیدہ، ابوزید انصاری، ابراہیم بن سیار وغیرہ جیسے اصحاب فکر وادب سے استفادہ کیا اور رفتہ رفتہ خود ایک عظیم ادیب ونثر نگار کی حیثیت سے آسمانِ ادب پر چھا گیا۔ اس نے صرف اپنی مادری زبان عربی میں ہی دسترس حاصل نہیں کی؛ بلکہ عربی کے علاوہ دیگر زبانوں کے آداب وعلوم سے بھی آگاہی حاصل کی اور فارسی، یونانی وسنسکرت زبانوں کے لٹریچر کا بھی گہرائی سے مطالعہ کیا۔ اس سلسلے میں اس نے ان زبانوں کے عربی تراجم کا سہارا لیا یا ان کے مترجمین مثلاً سلمویہ اور حنین بن اسحاق وغیرہ سے اخذ واستفادہ اور مناقشہ ومذاکرہ کے ذریعے ان زبانوں کا علم حاصل کیا۔

حصول تعلیم کے بعد جاحظ نے بصرہ کو خیر باد کہہ کر بغداد کی طرف کوچ کیا، جو اس کے لیے ایک وسیع میدانِ عمل ثابت ہوا اور وہاں پہنچنے کے بعد اس کی ادبی صلاحیتیں ابھر کر سامنے آئیں، بہت جلد وہ اربابِ ادب کے حلقوں میں مقبول ومشہور ہوگیا، اس کی مقبولیت دیکھتی آنکھوں اس حد تک پہنچ گئی کہ بہت سے پرانے اصحاب ادب وقلم اس سے حسد کرنے لگے، کچھ لوگوں نے اپنی تحریروں میں اس کے اسلوب کی نقل کرنے کی کوشش کی، جبکہ بعض لوگوں نے اسے مختلف حیلوں سے بدنام کرنے کی سازش کی، مگر کسی کو کامیابی نہ ملی اور جاحظ روز بہ روز نئی بلندیوں کو چھوتا گیا۔ اس نے امامت (خلافت) کے سلسلے میں ایک کتاب لکھی تھی، جو اس وقت کے عباسی خلیفہ مامون رشید تک پہنچی، اس نے وہ کتاب پڑھی، تو اسے بہت اچھی لگی، اس نے فوراً جاحظ کو دربار خلافت میں طلب کیا، انعامات سے نوازا اور اپنا کاتب (سکریٹری، منشی) مقرر کردیا، مگر جاحظ کی طبع آزاد کے لیے یہ عہدہ موزوں نہ تھا؛ چنانچہ اس نے بہت جلد استعفا دے دیا، اس دوران کئی سرکاری اہل کاروں، وزیروں اور رئیسوں سے اس کے روابط مضبوط ہوگئے، انھی میں سے ایک محمد بن عبدالملک زیات تھا، جو خلیفہ معتصم کا وزیر تھا، جب جاحظ نے "کتاب الحیوان" لکھی، تو اسے بھی ہدیتاً پیش کی، یہ کتاب اسے اتنی اچھی لگی کہ اس نے جاحظ کو بہ طور انعام پانچ ہزار دینار سے نوازا۔ مرفہ الحال ہونے کے بعد جاحظ نے مختلف علاقوں کے دورے کیے اور دمشق، انطاکیہ، مصر کے چکر لگاتا رہا۔ جب متوکل نے خلافت سنبھالی تو زیات پر مصیبت آپڑی، جس کا اثر جاحظ پر بھی پڑا، وہ ڈر کے مارے فرار ہوگیا، مگر پکڑا گیا اور چونکہ متوکل کے قاضی محمد بن ابوداؤد اس سے واقف تھے؛ چنانچہ انھوں نے خلیفہ کے سامنے اس کی علمی وادبی صلاحیت کی تعریف کی؛ اس لیے متوکل نے اسے اپنے پاس رکھ کر اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت پر لگادیا، مگر وہاں بھی زیادہ دن نہ رہ سکا اور جلد ہی اس ذمے داری سے فارغ کردیا گیا۔

جاحظ نے اپنی بے مثال علمی صلاحیت اور ادبی ہنر مندی کے عوض نہ صرف شہرت حاصل کی؛ بلکہ دنیا بھی خوب کمائی جس امیر، رئیس یا خلیفہ سے ملتا، اس کی خدمت میں اپنی کوئی نئی تصنیف پیش کر دیتا اور چوں کہ اس زمانے کے امراو رؤسا بھی علم دوست و ادب شناس ہوتے تھے؛ چنانچہ وہ جاحظ کو جی بھر کر نوازتے، اس طرح اپنے علم و قلم کی بہ دولت جاحظ نے دونوں ہاتھوں سے دولت و شہرت سمیٹی، ان تمام محرومیوں کا بدلہ نکالا، جو اس نے بچپن میں جھیلی تھیں یا جن محرومیوں سے اس کے خاندان اور گھر والے گزرتے آرہے تھے۔

تمام تر علمی وجاہت، ادبی امتیاز اور فکری و ذہنی تفوق کے ساتھ جاحظ ظاہری اعتبار سے نہایت بدہیئت، بدصورت اور قبیح انسان تھا۔ کہتے ہیں کہ اس کا لقب 'جاحظ' اس لیے پڑا کہ اس کی آنکھ کا ڈھیلا باہر کی طرف نکلا ہوا تھا اور عجیب بدہیئت لگتا تھا، اسی وجہ سے اسے 'حدقي' بھی کہا جاتا تھا، البتہ وہ جاحظ کے لقب سے زیادہ مشہور ہوا اور دوسرا لقب اتنا مشہور نہیں ہو سکا۔ جب شروع شروع میں لوگ اسے جاحظ کہتے تھے، تو وہ ناراض ہوتا، مگر پھر رفتہ رفتہ اس کا عادی ہوتا گیا اور ایک زمانے کے بعد یہ لفظ عربی ادب میں عظمت و احترام کی علامت بن گیا۔ اس کی شکل وصورت کے بارے میں عجیب عجیب باتیں بیان کی جاتی ہیں، مثلاً یہ کہ وہ ٹھگنے قد کا تھا، نہایت سیاہ فام تھا، اس کا سر چھوٹا، کان چھوٹے اور گردن پتلی تھی، عربی ادب کی تاریخ میں اس کی بدصورتی سے متعلق بہت سے واقعات مذکور ہیں۔ اس کی بدہیئتی کی انتہا یہ ہے کہ کسی شاعر نے کہا:

لو يمسخ الخنزير مسخاثانيا
ماكان إلادون قبح الجاحظ

اگر خنزیر کو بھی دوبارہ مسخ کر دیا جائے، تو وہ بھی جاحظ سے کم ہی بدصورت ہوگا۔ (شارل بلات، الجاحظ في البصرة وبغداد وسامراء، ط: دار اليقظة العربية، دمشق، ص: 103-98)

جاحظ کو خود اپنی بدصورتی کا احساس تھا؛ چنانچہ اس کا اپنا بیان ہے کہ متوکل نے اسے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت سے اس لیے الگ کر دیا کہ وہ بدشکل تھا اور اس کے بچے اسے دیکھ کر ڈر جاتے تھے، اسی طرح ایک مشہور واقعہ ہے کہ جاحظ ایک جگہ کھڑا تھا کہ ایک عورت اس کے پاس آئی اور اس نے اس سے کہا کہ فلاں پینٹر کی دکان تک چلو، وہ اس کے ساتھ گیا، وہ عورت جاحظ کو لے کر اس پینٹر کے پاس پہنچی اور اس سے کہا کہ: اس کے جیسی۔ جاحظ کو سمجھ نہیں آیا کہ اس کی بات کا مطلب کیا ہے؟ چنانچہ اس نے دکان دار سے پوچھا کہ بھئی اس عورت کے یہ کہنے کا کیا مطلب تھا؟ تو اس نے کہا کہ دراصل وہ عورت مجھ سے شیطان کی پینٹنگ بنانے کا کہہ رہی تھی، تو میں نے اس سے کہا تھا کہ کوئی نمونہ ہونا چاہیے، جس کی روشنی میں میں وہ تصویر تیار کر سکوں، تو وہ تمھیں لے کر آگئی اور اس کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ میں اسے تم جیسی تصویر بنا کر دوں۔

البتہ بدصورتی کے باوجود اس کے جسم کی ساخت سڈول اور بھلی تھی، باتیں اچھی کرتا تھا، مضبوط شخصیت کا مالک تھا، دل کا صاف تھا، واقعیت پسند تھا، دلچسپ اوصاف کا مالک تھا، لوگوں سے خوش طبعی کے ساتھ ملتا اور خندہ پیشانی سے بات کرتا، ان سب کے ساتھ وہ ایک نہایت ذہین، دانش مند قوت مشاہدہ سے ہم کنار اور باریک بیں قسم کا انسان تھا۔ وہ کبھی مایوس نہیں ہوتا تھا، نہ کسی کو مایوس دیکھ سکتا تھا، ہمیشہ پرامید رہتا اور دوسروں کو بھی حوصلہ دیتا۔ اس طرح اس کی ذات میں دو متضاد قسم کی شخصیتیں جمع تھیں، ایک کو لوگ حد درجہ ناپسند کرتے تھے، جبکہ دوسری شخصیت کو دل سے چاہتے اور پسند کرتے تھے۔ اس کے پسند کیے جانے کی ایک اہم ترین اور مسلم وجہ اس کی علمی و ادبی برتری تو تھی ہی۔

اخیر عمر میں اس کی حالت نہایت ناگفتہ بہ ہوگئی تھی مختلف بیماریوں کا شکار ہو گیا تھا، متوکل نے اس کی قدرشناسی کے جذبے سے اسے بلا بھیجا، تو اس نے جواب دیا: ''امیر المومنین ایک ایسے شخص کو کیوں یاد فرماتے ہیں، جو از کار رفتہ ہو چکا ہے، اس کے کندھے جھک گئے ہیں، اس کے منہ سے لعاب گرتا رہتا ہے اور اس کا رنگ نہایت بھدا ہے''۔ مبرد ایک بار اسی زمانے میں اس سے ملنے گئے اور حال دریافت کیا، تو اس نے کہا: ''وہ شخص کیسا ہوگا، جس کے جسم کا آدھا حصہ مفلوج ہو چکا ہے، اگر اس پر آرا بھی چلوا دیا جائے، تو کچھ اثر نہیں ہوگا اور دوسرا آدھا حصہ ایسا زخم آلود ہے کہ اگر اس کے قریب سے بھی مکھی گزرے، تو تکلیف ہوتی ہے''۔

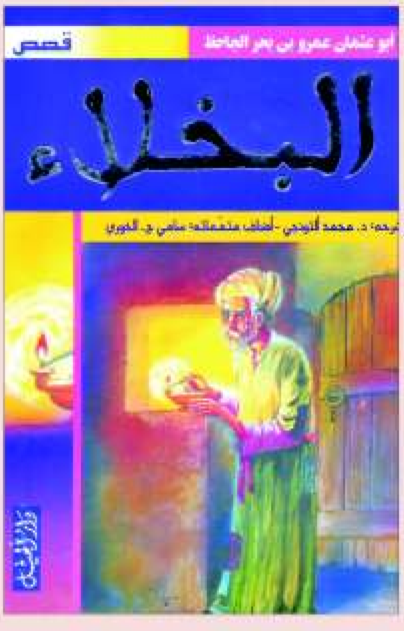

اس کی تکلیف روز بروز بڑھتی گئی، مگر اس حال میں بھی کتابوں سے اس کا عشق کم نہیں ہوا؛ بلکہ مزید بڑھ گیا؛ چنانچہ وہ اپنے شب و روز کتابوں کے درمیان گزارتا حتی کہ ایک دن وہ کتابوں کے نیچے دب کر ہی وفات پا گیا۔ یہ سانحہ 255ھ (868) میں پیش آیا، اس وقت اس کی عمر تقریباً نوے سال تھی۔ مطالعہ و کتب بینی سے اس کا عشق بے نظیر تھا، بچپن میں اس کی اس عادت کی وجہ سے اس کی والدہ پریشان رہا کرتی تھی، کتابوں سے اس کی محبت کا عالم یہ تھا کہ وہ صرف مطالعے کے لیے کتابوں کی دکانیں کرایے پر لیتا اور اکثر و بیشتر رات بھر اس دکان میں رہ کر اپنے مطالعے کی شوق کی تکمیل کیا کرتا تھا۔

کہتے ہیں کہ جاحظ نے اپنی زندگی میں چھوٹی بڑی لگ بھگ ایک سو ستر کتابیں تصنیف کیں، بعض لوگوں نے اس کی تصانیف کی تعداد ساڑھے تین سو بتائی ہے، مگر ان میں سے زیادہ تر کتابیں دست برد زمانہ کی نذر ہو گئیں۔ اس کی جو کتابیں عام طور پر دستیاب ہیں، ان میں البیان والتبیین، البخلاء اور کتاب الحیوان ہیں۔ البیان والتبیین اس کا سب سے بڑا تصنیفی کام سمجھا جاتا ہے، یہ اس کی زندگی کی آخری تصنیف بھی ہے۔ اس کتاب میں اس نے عربی ادب کی مختلف اصناف مثلاً خطبات، قصائد، خطوط اور تبصروں کے اقتباسات جمع کیے ہیں، اس کے علاوہ بلاغت و بیان کے اصولی و فنی مباحث سے بھی گفتگو کی ہے، جس کی وجہ سے اس کی یہ کتاب علم بلاغت کی اساسیات اور فلسفۂ عربی زبان و ادب کی تشریح و تنقید کے سلسلے میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ کتاب البخلاء عربی زبان میں بخیلوں کے تعلق سے باضابطہ لکھی جانے والی پہلی کتاب ہے۔ اس کتاب میں ادب ہے، علم ہے، فکاہت ہے اور بھی بہت کچھ ہے، اس میں جاحظ نے بخیلوں کی نفسیات، ان کے رویوں، ان کی خواہشات و رجحانات اور عام زندگی کو دیکھنے اور برتنے کے ان کے نظریے پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ جاحظ نے اس کتاب میں بخیلوں سے متعلق مختلف دلچسپ واقعات، پرلطف کہانیاں بیان کی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جاحظ نے یہ کتاب دراصل کسی وزیر کی فرمائش پر لکھی تھی۔ کتاب دو جلدوں پر مشتمل

ہے اور تقریباً 140 مختلف عناوین کے تحت بخیلوں کے واقعات اوران سے متعلق امور کو بیان کیا گیا ہے۔اس کی تیسری مشہور ترین کتاب، کتاب الحیوان ہے اور یہ بھی عربی زبان میں حیوانات کے متعلق لکھی جانے والی پہلی مفصل کتاب ہے۔اس کتاب میں صرف حیوانات کی زندگی اوران کی خصوصیات پر ہی گفتگو نہیں کی گئی ہے؛ بلکہ اس میں مختلف علوم و معارف اوران سے متعلق نکات و اسرار بیان کیے گئے ہیں،یہ کتاب دراصل بہت سے علوم کی انسائیکلو پیڈیا ہے،اس میں طبعیات، فلسفہ، طب، جغرافیہ، ماحولیات،نباتات،تاریخ اور دیگر دسیوں علوم کے جواہر پارے بکھرے ہوئے ہیں،حالانکہ جاحظ سے پہلے اصمعی،ابوعبیدہ،ابن الکلبی،ابن الاعرابی اور بجستانی وغیرہ نے بھی حیوانات پر کتابیں لکھیں،مگر وہ جامع نہیں تھیں،انھوں نے کسی ایک حیوان کی لغوی تحقیق تک اپنے آپ کو منحصر رکھا،مگر جاحظ نے کتاب الحیوان میں جانوروں کی طبعیات واحوال کے بیان کے علاوہ دیگر متذکرہ علوم پر بھی غیر معمولی مواد فراہم کردیا ہے۔ چونکہ جاحظ وسیع العلم انسان تھا؛اس لیے اس کتاب میں اس نے قرآن و حدیث کے علاوہ توریت وانجیل،اقوال حکما،یونانی علوم، فارسی لٹریچر، ہندوستانی حکمت و فلسفہ اور خود اپنے علمی تجربات ومشاہدات سے بھی کام لیا ہے۔اس کتاب میں جاحظ کا اسلوب الف لیلوی ہے،جس طرح داستان الف لیلہ کی اساسی کردار شہرزادشہریار سے ایک قصہ بیان کرتی ہے، پھراس قصے کا کوئی کردار ایک ذیلی کہانی سناتا ہے، پھراس قصے کے بیچ تیسرا،چوتھا قصہ آجاتا ہے،حتی کہ کہانی پھراپنے مرکزی نقطے پرلوٹ جاتی ہے،ٹھیک اسی طرح جاحظ اس کتاب میں کسی جانور کے اوصاف وخصائص کو بیان کرتے ہوئے کسی دوسرے موضوع پر نکتہ آفرینی کرنے لگتا ہے، پھراس کا قلم کسی تیسرے موضوع کی طرف منتقل ہوجاتا ہے،حتی کہ وہ پھر اصل موضوع کی طرف لوٹ آتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ جانوروں کی طبعیات وخصائص پر لکھی گئی اس کتاب میں دیگر بہت سے علوم ومعارف بھی جمع ہوگئے ہیں اور ہرعلم سے دلچسپی رکھنے والے کے لیے یہ کتاب لائق مطالعہ و استفادہ ہوگئی ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ جاحظ کی مشہور و متداول کتابوں میں سحرالبیان، التاج، الاخبار، عصام المرید، امہات الاولاد،احدوثۃ العالم،دلائل النبوۃ اور الجد والھزل وغیرہ ہیں۔

جاحظ کے بعض اساتذہ معتزلی الفکر تھے،جس کا جاحظ پر بھی خاصا اثر پڑا اور وہ بھی نظریاتی طور پر معتزلی ہوگیا تھا،اس کی اس فکر کا اثر اس کی کتابوں پر بھی واضح طور پرمحسوس کیا جاسکتا ہے۔اس نے اپنی زیادہ تر تصانیف میں فکرِ اعتزال کی تشریح وتوضیح اور دفاع پر زور دیا ہے۔ حتی کہ وہ اپنے زمانے میں معتزلہ کا ترجمان اور نفسِ ناطقہ تھا،اس نے معتزلہ کی عقلیت پسندی کی توسیع کی اور ہر چیز میں عقل کو فیصل قرار دیتے ہوئے ایسی ہرنقل وروایت کا سرے سے انکار کیا،جو عقل کے معیار پر پوری نہ اترتی ہو،اس سلسلے میں اس نے نہ صرف بعض شرعی نصوص کو ماننے سے انکار کیا؛ بلکہ خود منطق وتعقل پسندی کے بعض ائمہ کی خلاف عقل باتوں کوبھی جھٹک دیا۔مثال کے طور پر ارسطو ایک ایسا مفکر اورامام المنطق والفلسفہ ہے کہ جسے مشرق ومغرب والے یکساں طور پر مانتے اور اس کے نظریات وافکار کے سامنے سرِتسلیم خم کرتے ہیں،مگر جاحظ ایک ایسا جری الفکر انسان تھا کہ اس نے کئی موقعوں پر ارسطو کی بعض باتوں کو نہ صرف مسترد کیا؛ بلکہ اس کی تضحیک وتحقیر بھی کی۔مثلاً کتاب الحیوان میں ایک جگہ ارسطو کا ذکر کرتے ہوئے اس کے حوالے سے ایک واقعہ نقل کرتا ہے اور لکھتا ہے:''صاحب منطق (ارسطو) کہتے ہیں کہ یونان میں ایک طبقون نامی بستی ہے،جہاں چھوٹے چھوٹے سخت زہریلے سانپ ہوتے ہیں،ان کے ڈنک کا علاج بعض قدیم بادشاہوں کی قبر کے پتھر سے ہی ممکن ہے''۔ جاحظ اسے بیان کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ:''یہ بات میری سمجھ سے باہر ہے،آخر ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟''۔ایک اور جگہ لکھتا ہے کہ:''صاحب منطق کا بیان ہے کہ انھوں نے دوسروں والا سانپ دیکھا ہے،میں نے یہ پڑھنے کے بعد ایک دیہاتی سے پوچھا کہ کیاایسا سانپ واقعی پایاجاتا ہے؟تواس نے بھی اثبات میں جواب دیا،تو میں نے اس سے کہا کہ وہ رینگتا کس طرف سے ہے؟ کھاتا اور کاٹتا کس طرف سے ہے؟تواس نے جواب دیا کہ وہ معروف معنوں میں رینگتا نہیں ہے،بچے کی طرح الٹ پلٹ کرتا ہے،جہاں تک کھانے کی بات ہے،تو وہ رات میں ایک منہ سے کھاتا ہے اوردن کو دوسرے منہ سے اور وہ دونوں سروں سے کاٹتا ہے''۔اس پر جاحظ نے اپنا ردعمل یہ لکھا ہے کہ:''وہ ساری دنیامیں سب سے جھوٹا انسان ہے''۔ہوسکتا ہے یہ بات اس اعرابی کے بارے میں کہی ہواور یہ بھی ممکن ہے کہ ارسطو کے بارے میں کہی ہو؛کیوں کہ دوسروالے سانپ کی بات اولاً اسے ارسطو کے ذریعے ہی معلوم ہوئی تھی۔

بہرکیف جاحظ عربی ادب کے ان درخشندہ ستاروں میں سے ہے،جن کی روشنی رہتی دنیا تک عالمِ ادب کو منور کرتی رہے گی۔وہ عباسی دور کا نمائندہ نثرنگار ہے،اس نے اس دور کی عربی نثر میں علمیت،واقعیت پسندی اور حقیقت بینی کے اوصاف کا اضافہ کیا،اس کی نثر میں سادگی اور بے ساختگی ہے،واقعات کو بیان کرنے کا اس کا انداز بڑا دلنشیں ہے،اس سلسلے میں اس کی کتاب البخلاء خاص طور پر قابل ذکر ہے۔البیان والتبیین تو اس کی معرکۃ الآرا کتاب ہے،اس میں اس نے عربی ادب کے اسالیب نثرونظم پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے عربی تنقید کو مضبوط اساس فراہم کی ہے۔ابن خلدون نے عربی ادب کے تشکیلی عناصر پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:''ہم نے اپنے اساتذہ کی مجلسوں میں سنا ہے کہ عربی ادب وفن کے اصول و بنیادی ارکان پر چار کتابیں ہیں: ابن قتیبہ کی ادب الکاتب،مبرد کی الکامل،جاحظ کی البیان والتبیین اورابوعلی القالی کی کتاب النوادر،ان کے علاوہ جو کتابیں ہیں،وہ سب انھی سے مستفاد وماخوذ ہیں یاان کی اتباع میں لکھی گئی ہیں''۔

■

Md. Nayab Hasan
A/22, Seema Apartment (G.F)
Gali No 7, Batla House, Jamia Nagar
New Delhi - 110025

عبدالرحمن

اکبر الہ آبادی اور نظریۂ ڈارون

اکبر الہ آبادی کا نام آتے ہی ہمارا ذہن ان کی طنزیہ ومزاحیہ شاعری کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ ایسا ہونا بھی ضروری ہے کیوں کہ اسی سے اکبر کی شناخت قائم ہے۔ وہ اپنے مخصوص مزاج اور لب و لہجے کی وجہ سے ہی پہچانے جاتے ہیں۔ لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ انھوں نے صرف طنزیہ ومزاحیہ شاعری ہی کی ہے۔ اکبر نے غزلیں بھی کہی ہیں اور بہت خوب کہی ہیں لیکن ان کے ساتھ ناانصافی یہ ہوئی کہ ان کی غزلوں کو قابل اعتنا نہیں سمجھا گیا اور نہ صرف ان کی غزلوں کو بلکہ بطور شاعر بھی اکبر کو اتنی اہمیت نہیں دی گئی جتنے کے وہ حقدار تھے۔ جیسا کہ شمس الرحمٰن فاروقی نے کہا ہے کہ:

...اردو کے نقادوں نے کم وبیش یک زبان ہو کر ان کی نکتہ چینی کی ہے کیوں کہ اکبر انھیں ترقی، سائنس اور روشن خیال طرز فکر وحیات کے دشمن نظر آتے ہیں۔

(شمس الرحمٰن فاروقی: جدیدیت کل اور آج، نئی دہلی، نئی کتاب پبلشر، 2007 ص 158)

دوسری جگہ وہ لکھتے ہیں:

اکبر کو بہ آسانی اردو کے پانچ چھ بڑے شاعروں اور دنیا کے عظیم ترین طنزیہ/مزاحیہ شعرا کی صف میں رکھا جا سکتا ہے۔ اکبر کی عظمت کا اعتراف طنزیہ/مزاحیہ شاعری کی عظمت کا اعتراف ہے۔

(شمس الرحمٰن فاروقی: جدیدیت کل اور آج، نئی دہلی، نئی کتاب پبلشر، 2007 ص 162-63)

بہر حال یہاں انھیں ان کا مقام دلانا مقصود نہیں بلکہ ان کی شاعری کی کچھ خصوصیات کو بیان کرنا ہے۔ اکبر الہ آبادی ایک ایسے شاعر ہیں جن کے کلام کا اگر مطالعہ کیا جائے تو ان کا عہد آنکھوں کے سامنے جیتا جاگتا محسوس ہوتا ہے۔ کوئی بھی تخلیق یا فن پارہ اپنے عہد اور سماج کا عکاس ہوتا ہے۔ جہاں تک اکبر کا سوال ہے انھیں تو 'لسان العصر' کا خطاب ہی حاصل ہے۔ وہ اپنے عہد اور سماج کی آواز ہیں۔ ان کے پورے کلام میں ان کا عہد بالکل صاف دکھائی دیتا ہے۔ اسی لیے سید احتشام حسین ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

اکبر کے ارتقائے شعور کا دور غیر معمولی کشمکش کا دور ہے اور اکبر نے اس کشمکش کو چھپایا نہیں ہے بلکہ اسے ہر پہلو سے پیش کر دیا ہے۔ اگر اکبر کی شاعری کا تاریخی حیثیت سے مطالعہ کیا جائے تو مشکل ہی سے عصری تاریخ ہند کا کوئی ایسا واقعہ ہوگا جس کی طرف اشارے نہ مل جائیں، یہی نہیں بلکہ ان کے متعلق اکبر کا رد عمل بھی معلوم ہوگا، روزمرہ کے واقعات سے شاید ہی کسی شاعر نے اتنا فائدہ اٹھایا ہو، اور پھر اکبر کی شاعری واقعات کا سرسری یا سپاٹ بیان نہیں ہے بلکہ اکثر واقعات ان کے تصور زندگی میں منسلک ہو کر کسی بڑے خیال کی ایک کڑی بن جاتے ہیں اور ہم چاہے ان سے متفق ہوں یا نہ ہوں اکبر کے سمجھنے میں وہ ضرور ہماری مدد کرتے ہیں۔

(علی گڑھ میگزین: اکبر نمبر علی گڑھ: مسلم یونیورسٹی پریس، 1950 ص 126)

جب اس حوالے سے ہم اکبر کے کلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اس عہد کے سیاسی، سماجی، ثقافتی، تعلیمی، ملکی وغیر ملکی ہر طرح کے حالات و واقعات کا ذکر ان کے یہاں نظر آتا ہے، گویا ہم ان کی شاعری کے ساتھ اس عہد کی تاریخ کا بھی مطالعہ کر رہے ہوتے ہیں۔ اکبر نے اپنے عہد کے تقریباً ہر طرح کے احوال و واقعات کا ذکر اپنی شاعری میں کیا ہے، چاہے وہ انگریزوں کی سیاسی، سماجی اور تعلیمی پالیسی ہو، یا سرسید اور علی گڑھ تحریک ہو، عورتوں کی تعلیم اور ان کے مسائل ہوں، مسلمانوں کے حالات اور ان کی بے بسی کا ذکر ہو، دیوبند اور ندوۃ العلما کی مذہبی تعلیم کا مسئلہ ہو، کانگریس اور مسلم لیگ کی تحریک ہو، آزادئ ہند کی خاطر گاندھی جی اور ان کے حامیوں کی جد وجہد ہو، خلافت اور عدم تعاون کی تحریک ہو، ہندی اردو تنازعہ ہو یا پھر ہندو مسلم اتحاد کا مسئلہ، غرض کہ کون سا ایسا گوشہ اور کون سا ایسا واقعہ ہے جو اکبر کے زمانے میں وقوع پذیر ہوا ہو اور اس کا ذکر انھوں نے نہ کیا ہو۔ اس عہد کا پورا تاریخی منظر نامہ ان کے کلام میں دکھائی دیتا ہے۔ اسی طرح کا ایک ہنگامی واقعہ جو اس زمانے میں منظر عام پر آیا جسے دنیا ''نظریۂ ڈارون'' کے نام سے یاد کرتی ہے۔ اس نظریہ کے تعلق سے بھی اکبر کے کلام میں کئی اشعار نظر آتے ہیں جن سے ان کی فکر واضح ہوتی ہے۔ اس مضمون کا تعلق اسی ہنگامی واقعہ سے ہے۔

1859 میں جب اکبر کی عمر تقریباً تیرہ چودہ سال کی تھی، اسی سال برطانیہ کے رہنے والے ماہر حیاتیات و ارضیات ''چارلس ڈارون'' نے اپنی تیس سالہ تحقیق پر منحصر ایک کتاب The Origin of Species لکھ کر ایک نظریہ دنیا کے سامنے پیش کیا جسے Theory of Evolution (نظریۂ ارتقا) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ اس وقت دنیا کا سب سے ہنگامہ خیز مسئلہ تھا۔ پوری دنیا میں اسی کے چرچے تھے۔ ہر کسی کی زبان پر ڈارون کا ذکر تھا۔ تو ظاہری بات ہے اکبر اس کی طرف کیوں متوجہ نہ ہوتے۔ اکبر نے بھی اپنے کلام میں کھل کر اس نظریہ سے

متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اور صرف اظہار ہی نہیں کیا بلکہ اپنے مخصوص انداز میں اس نظریہ کی مخالفت بھی کی۔

پہلے اختصار میں یہ جان لیتے ہیں کہ ڈارون کا نظریہ کیا تھا۔ ڈارون کے مطابق زندگی کی ابتدا اربوں سال پہلے سمندر کے کنارے پانی سے ہوئی۔ پانی کی سطح پر پہلے کائی نمودار ہوئی، پھر اس کائی کے نیچے حرکت پیدا ہوئی، پھر اس سے نباتات کی مختلف قسمیں بنتی گئیں، پھر جرثومۂ حیات ترقی کرتے کرتے مختلف طرح کے حیوانات میں تبدیل ہوا، پھر اس نے ریڑھ کی ہڈی والے جانور کی شکل اختیار کی، پھر مختلف طرح کے حیوان بنے، اور پھر بہت سی تبدیلیوں کے بعد بندر اور انسان کی شکل اختیار کی۔ ''ڈارون نے اپنی کتاب Origin of Species میں براہ راست انسان کے ارتقا کی بات نہیں کی تھی۔ تقریباً بارہ سال بعد 1872 میں جب اس نے اپنی کتاب Descent of Man شائع کی تو اس میں اس بات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی کہ انسان کا ارتقا کس طرح دوسرے جانداروں کی طرح ہوا''۔

(افتخار عالم خان: ڈارون اور اس کا نظریہ ارتقا، نئی دہلی، ترقی اردو بیورو، 1991ص،52)

ڈارون کے مطابق ہر زندہ جسم میں ایک مستقل ارتقائی رجحان پایا جاتا ہے جو اسے نہ صرف ماحول سے ہم آہنگ ہونے میں مدد کرتا ہے بلکہ مسلسل ارتقا کا یہ عمل اس میں بہت سی تبدیلیوں کا باعث بنتا ہے۔ مگر ان تبدیلیوں کے واضح ہونے میں لاکھوں برس کا وقت درکار ہوتا ہے۔ اس کا ماننا تھا کہ انسان کی موجودہ شکل کے درپردہ لاکھوں سال کا ایک مسلسل ارتقائی عمل ہے جو اسے اس شکل تک لے کر آیا۔

ڈارون نے اپنے نظریہ کی بنیاد درج ذیل چار اصولوں پر رکھی ہے۔ اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ کن حالات میں اور کس طرح یہ تبدیلیاں واقع ہوئیں یا ہوتی ہیں۔

1۔ Struggle for Existanceاس سے مراد زندگی کی بقا کے لیے کشمکش ہے۔ یعنی تمام جاندار خوراک اور دیگر سہولیات کے لیے دوسرے جاندار سے مقابلہ کرتے ہیں۔ اس میں وہ زندہ بچتے ہیں جو طاقتور اور مضبوط ہوتے ہیں۔ اور کمزور خوراک کی کم یابی کے باعث مزید کمزور ہو کر بالآخر ختم ہو جاتے ہیں۔

2۔ Natural Selection یعنی طبعی یا فطری انتخاب۔ جو جانور دشوار حالات میں بھی اپنے آپ کو موت سے بچا لیتے ہیں انھیں کی نسل باقی رہتی ہے۔ اس میں چونکہ قدرت خود ہی نسل کی بقا کے لیے کچھ جاندار کو چن لیتی ہے اس لیے اس کو Natural Selection کا نام دیا۔

3۔ Adaptation اس کے مطابق اگر کسی ماحول میں جانوروں کی خوراک ختم ہو جائے تو وہ نئے ماحول کے مطابق اپنے کو ڈھال لیتے ہیں۔ اس کی مثال دیتے ہوئے ڈارون کہتا ہے کہ شیر زمین پر رہنے والا جانور ہے کیونکہ اس کو خوراک زمین پر ہی مل جاتی ہے، اگر اسے خوراک ملنے کی واحد صورت یہ ہو کہ اس کے حصول کے لیے درخت پر چڑھنا پڑے تو آہستہ آہستہ اس کے جسم میں ایسے اعضا پیدا ہونا شروع ہو جائیں گے جو درخت پر چڑھنے میں مدد دے سکیں۔ اسی طرح باقی جانوروں اور انسانوں میں بھی پرانے اعضا ختم اور ضرورت کے مطابق نئے اعضا وجود میں آجاتے ہیں۔

4۔ Law of Inheritance اس کے مطابق ہیئت اور ماحول کے اختلاف کی وجہ سے جانداروں میں جو تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں وہ اگلی نسلوں میں منتقل ہو جاتی ہیں اور یہ تبدیلی ہوتے ہوتے ایک نئی نسل کے جاندار کے وجود کا سبب بن جاتی ہے۔ اس طرح ارتقا کا عمل چلتا رہتا ہے۔

ڈارون نے بہت ساری مثالیں بھی دی ہیں، لیکن یہاں ان سب کا احاطہ ممکن نہیں ہے۔ اکبرالہ آبادی نے جب ڈارون کے اس نظریہ پر غور کیا تو انھیں یہ بڑا ہی مضحکہ خیز معلوم ہوا۔ ان کو کامل یقین تھا کہ یہ نظریہ ان کے مذہب اور عقیدے کی رو سے بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔ قرآن وحدیث میں واضح دلائل موجود ہیں جو یہ بتاتے ہیں کہ کس طرح سے اور کس صورت میں اللہ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ.

(سورۃ التین)

''یقیناً ہم نے انسان کو بہترین صورت میں پیدا کیا۔''

اسی طرح قرآن میں بہت ساری جگہوں پر اللہ نے پہلے انسان یعنی حضرت آدم کی تخلیق سے متعلق ارشاد فرمایا ہے کہ کیسے اس نے آدم کی تخلیق کی پھر ان سے حضرت حوا کو پیدا کیا اور ان دونوں سے ہی تمام انسانوں کو اس دنیا میں پھیلایا۔ دنیا میں بسنے والے تمام لوگ چاہے وہ کہیں کے بھی رہنے والے ہوں آدم اور حوا کی اولاد ہیں، جو بندر یا پھر کوئی اور جاندار نہیں تھے، بلکہ ہم جیسے ہی انسان تھے۔ اور سچ بات تو یہ ہے کہ اسلام کے علاوہ عیسائی مذہب میں بھی انسان اول کے طور پر آدم اور حوا کا ذکر ہے۔ اس لیے بہت سارے عیسائی مذہب کے ماننے والوں نے بھی ڈارون کے اس نظریے کی تردید کی تھی۔ یہ ساری باتیں اکبرالہ آبادی کے سامنے تھیں۔ اس لیے ان کو یہ نظریہ نہایت احمقانہ معلوم ہوا اور انھوں نے کھل کر اس پر اپنی رائے کا اظہار کیا۔ چوں کہ اتفاق سے ڈارون کا تعلق برطانیہ سے تھا اور ہندوستان اس وقت برطانوی حکومت کے زیر نگیں تھا۔ انگریزوں نے یہاں صرف سیاسی قبضہ نہیں کر رکھا تھا بلکہ وہ یہاں کی تہذیب و ثقافت، تعلیمی و تدریسی نظام اور یہاں تک کہ وہ ہندوستانیوں کے ذہن اور دل ودماغ پر بھی حکومت کرنے کے خواہش مند تھے۔ اکبر ان سب چیزوں سے بخوبی واقف تھے اور اس کے شدید مخالف بھی تھے۔ جب ڈارون کے نظریہ پر انھوں نے غور کیا تو انھیں انگریزوں کو نیچا دکھانے کا ایک بہترین موقع ہاتھ لگا۔ انگریز چونکہ ہندوستانیوں کو اور یہاں کی تہذیب وثقافت کو بہت گری ہوئی نظر سے دیکھتے تھے، اس لیے اکبر نے ہاتھ آئے اس موقعے کو غنیمت جانا اور ہندوستانیوں کی طرف سے ڈارون کو خطاب کرکے انگریزوں کا مذاق اڑایا۔ اس تعلق سے طنز کے کئی اشعار ان کے کلام میں ملتے ہیں، جیسے یہ شعر۔

یا الٰہی یہ کیسے بندر ہیں
ارتقا پر بھی آدمی نہ ہوئے

اس شعر میں اکبر نے کتنا کاری ضرب لگایا ہے۔ اگر کسی کو براہ راست بندر کہا جائے تو وہ فوراً بگڑ جائے گا اور ہاتھا پائی کی نوبت آجائے گی، لیکن یہاں تو معاملہ مختلف تھا، خود ایک انگریز ہی انسانوں کے ابتدائی وجود کو بندر ہونے کا دعویٰ کر رہا تھا اور بہت مضبوطی سے اس نے اپنی بات لوگوں کے سامنے رکھی تھی، بہت سے لوگ اس سے متفق بھی تھے۔ جس کا اکبر نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ جب کہ ڈارون نے صرف انگریزوں کی نسل کے بارے میں یہ بات نہیں کہی تھی۔ اس نے تو سارے جانداروں کے تعلق سے نظریہ پیش کیا تھا، لیکن یہاں معاملہ اختلاف اور اتفاق کا تھا۔ بات ماننے اور نہ ماننے کی تھی۔ تو اکبر نے ڈارون سے اختلاف کیا اور اس میں بھی طنز سے کام لیا۔

ڈارون صاحب حقیقت سے نہایت دور تھے
میں نہ مانوں گا کہ مورث آپ کے لنگور تھے

یہ اکبر کا خاص انداز ہے۔ ڈارون کی بات ماننے سے انکار بھی کر دیا، یہ بھی کہہ دیا کہ آپ حق پر نہیں ہو اور ایک باریک طنز کے ساتھ لنگور سے ان کا رشتہ بھی جوڑ دیا۔ اسی طرح کا ایک شعر یہ بھی ہے۔

ڈارون صاحب یہ اچھا مسئلہ سمجھا گئے
دعویٰ مخدومیت میں مست ہر لنگور ہے

اکبر نے اپنے زمانے کی جدید اور نئی تعلیم کو لے کر بھی بڑا سخت رویہ اپنایا ہے۔ ڈارون کے تعلق سے ایک شعر میں کہتے ہیں:

نئی تعلیم کو کیا واسطہ ہے آدمیت سے
جناب ڈارون کو حضرت آدم سے کیا مطلب

اکبر کا ماننا تھا کہ نئی تعلیم لوگوں کو اخلاقیات اور انسانیت سے دور کرتی ہے، اس کا اظہار اس شعر میں بھی کیا ہے۔ کتنے اچھے انداز میں اکبر نے آدم اور آدمیت کو اس شعر میں پرو دیا ہے کہ ڈارون صاحب کو آدم سے کیا ہی نسبت ہو سکتی ہے کیوں کہ جو تعلیم انھوں نے حاصل کی ہے اس کا واسطہ جب آدمیت سے ہی نہیں ہے تو ان کو آدم سے کیسے ہوگا۔

اکبر نے اپنے زمانے میں انگریزی تعلیم کی جو مخالفت کی ہے اس کی سب سے اہم وجہ یہ تھی کہ وہ انگریزوں کی تعلیمی پالیسی سے بخوبی واقف تھے، جس کے پیش نظر وہ ہندوستانیوں میں ایک ایسی نسل کے خواہش مند تھے جو رنگ میں کالی اور دل سے انگریز ہو، تاکہ انھیں صرف اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا جائے، انھیں مہذب اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کا جھوٹا خواب دکھا کر ان سے کلرکی اور نوکری کرائی جائے، جس کا فائدہ یہ ہوگا کہ زیادہ اجرت دے کر برطانیہ سے انگریزوں کو نہیں بلانا پڑے گا بلکہ کم پیسے میں ہندوستانی نوکروں سے کام نکالا جا سکے گا۔ یہ انگریزوں کی تعلیمی و معاشی پالیسی تھی جس کا علم اکبر کو ہو چکا تھا۔ اسی لیے تو وہ پورے اعتماد کے ساتھ کہتے ہیں۔

تعلیم جو ہمیں دی جاتی ہے وہ کیا ہے فقط بازاری ہے
جو عقل سکھائی جاتی ہے وہ کیا ہے فقط سرکاری ہے

اس طرح کے بہت سے اشعار اکبر کے کلام میں مل جائیں گے، لیکن یہاں صرف ایک ہی شعر انگریزوں کی پوری تعلیمی پالیسی کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے۔ مگر افسوس بجائے اس کے کہ لوگ اکبر کی بات کو سمجھتے اور انگریزوں کی چال سے واقف ہوتے الٹے لوگوں نے اکبر پر الزام لگائے کہ وہ ترقی اور جدید تعلیم کے مخالف ہیں۔ جبکہ اکبر تعلیم کے خلاف نہیں تھے، جیسا کہ مندرجہ ذیل اشعار اس کے گواہ ہیں:

وہ باتیں جن سے قومیں ہو رہی ہیں نامور سیکھو
اٹھو تہذیب سیکھو صنعتیں سیکھو ہنر سیکھو
بڑھاؤ تجربے اطرافِ دنیا میں سفر سیکھو
خواصِ خشک و تر سیکھو علومِ بحر و بر سیکھو
خدا کے واسطے اے نوجوانو ہوش میں آؤ
دلوں میں اپنے غیرت کو جگہ دو جوش میں آؤ

اور یہ شعر بھی ملاحظہ ہو۔

کون کہتا ہے تو علم نہ پڑھ عقل نہ سیکھ
کون کہتا ہے نہ کر حسرتِ لندن پیدا

کتنے واضح اور صاف انداز میں اکبر نے تعلیم کے سلسلے میں اپنے موقف کا اظہار کیا ہے، لیکن پھر بھی ان پر یہ الزام ہے کہ وہ تعلیم کے مخالف تھے۔ ایسا نہیں ہے کہ اکبر کوئی بھی اعتراض یوں ہی بلا وجہ کر دیتے ہیں بلکہ اس کی وجہ بھی بتاتے ہیں اور دلیل بھی دیتے ہیں۔ اگر ہم ان کے کلام کا بغور مطالعہ کریں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ خیر ڈارون کے ہی تعلق سے ایک جگہ طنزیہ انداز اختیار کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

ہم تو انساں سے بنے جاتے ہیں بندر اے حضور
آپ خوش قسمت تھے جو بندر سے انساں ہو گئے

اس شعر میں اکبر نے انگریزوں کے ساتھ ساتھ ہندوستانیوں پر بھی طنز کیا ہے۔ ہندوستانی عوام جو اپنی تہذیب و ثقافت اور سماجی پہچان کو چھوڑ کر انگریزوں کی نقالی کر رہی تھی۔ انھیں نہ اپنی زبان کی فکر تھی اور نہ ہی تہذیبی شان کی۔ اس لیے اکبر کہتے ہیں آپ تو خوش قسمت ہیں جو بندر سے انسان ہو گئے، ہمیں دیکھو ہم تمہاری نقالی میں انسان سے بندر بننے کی راہ پر ہیں اور ہماری کم عقلی دیکھیے کہ اسی میں خوش بھی ہیں۔ اسی مناسبت سے اکبر نے ایک دوسری جگہ کیا ہی بہترین انداز میں شعر کہا ہے:

اپنی منقاروں سے حلقہ کس رہے ہیں جال کا
طائروں پر سحر ہے صیاد کے اقبال کا

اس شعر میں اکبر نے اپنے دور کی کتنی بہترین عکاسی کی ہے۔ بالکل یہی حال ہندوستانیوں پر انگریزوں کے سحر کا تھا۔ یہ اس جادو کا ہی اثر تھا کہ مسلمان قرآن اور اپنے دین کو بھلائے بیٹھے تھے۔ جس کا اشارہ اکبر نے مندرجہ ذیل شعر میں بھی کیا ہے، جو ڈارون کے تعلق سے ہے۔

عوضِ قرآن کے اب ہے ڈارون کا ذکر یاروں میں
جہاں تھے حضرتِ آدم وہاں بندر اچھلتے ہیں

بظاہر تو اکبر نظریۂ ڈارون پر طنز کرتے ہوئے نظر آ رہے ہیں لیکن اصل میں وہ مسلمانوں کے قرآن کی تعلیم سے دور ہو جانے کے بعد پیدا ہونے والے مسائل کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ کیونکہ قرآن کی رو سے ڈارون کا نظریہ بالکل بے بنیاد ہے۔ چاہے اس نظریے کی بنیاد تمیں سالہ تحقیق پر مبنی ہو یا پھر صدیوں کو محیط ہو۔ قرآن نے کہہ دیا غلط تو غلط۔ یہی اکبر کا عقیدہ اور ایمان تھا۔ اس لیے وہ اس میں کسی بھی قسم کی مداخلت برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن اس وقت مسلمانوں کی بے راہ روی پر انھیں بہت افسوس تھا۔ جس کا ایک طبقہ آنکھ بند کیے انگریزوں کی اندھی تقلید میں مست تھا۔ جب کہ اکبر جانتے تھے کہ یہی انگریز جس کی آج مسلمان تقلید کر رہے ہیں وہ انھیں کی گردن کاٹ کر آج ہندوستان کے حاکم بنے ہیں۔ جس کی طرف اس شعر میں اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

سرفرازی ہو اونٹوں کی تو گردن کاٹیے ان کی
اگر بندر کی بن آئے تو فیضِ ارتقا کہیے

ذرا غور کیجیے تو پتہ چلتا ہے کہ اکبر نے کتنے باریک اور حساس مسئلے کو اتنی آسانی سے ان دو مصرعوں میں بیان کر دیا ہے۔ اکبر اپنی شاعری میں کچھ خاص علامتیں استعمال کرتے ہیں جس کے وہ موجد بھی ہیں۔ ان سے پہلے اس طرح کی علامتیں کسی شاعر نے استعمال نہیں کی تھیں۔ جیسے اس شعر میں لفظ اونٹ کو مسلمانوں کی، اور بندر کو انگریزوں کی علامت کے طور پر استعمال کر کے کتنا معنی خیز طنز کیا ہے۔ کیونکہ انگریزوں نے ہندستان میں مسلمانوں کے ہاتھوں سے ہی حکومت حاصل کی تھی۔ اور اکبر کے ذہن میں 1857 کا انقلاب بھی تھا جس کے بعد بے دریغ مسلمانوں کو قتل کیا گیا۔ اس لیے انگریزوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ جب اونٹ (مسلمان) ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہے تو تم ان کی گردن مارنے سے نہیں چوکتے ہو۔ لیکن بندر کچھ بھی کرے تو اس سے اپنا رشتہ جوڑ کر اسے ارتقائی فیض سے تعبیر کرتے ہو۔

جس طرح سے اکبر نے اپنے عہد کے بہت سارے مسائل پر کھل کر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اسی طرح انھوں نے ڈارون کے نظریے کے تعلق سے بھی اپنی آرا کو شاعری کے ذریعے بیان کیا ہے۔ انھوں نے ایک خاص مقصد کے تحت اپنے اشعار میں طنز کی زہرناکی کو بڑھا کر پیش کیا ہے۔ جس میں ایک تیر سے دو شکار کرنے کی کوشش کی ہے۔ اکبر الہ آبادی کی خاص بات یہ ہے کہ ان کے اشعار میں کوئی نہ کوئی نکتہ ضرور پوشیدہ ہوتا ہے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ان کی شاعری پر طائرانہ نہیں بلکہ غائرانہ نظر ڈالیں، جس سے ہمیں ان کی اہمیت کا اندازہ ہو۔ آخر میں اکبر کے اس شعر کے ساتھ بات ختم کی جاتی ہے۔

تجھے ہم شاعروں میں کیوں نہ اکبر معتبر سمجھیں
بیاں ایسا کہ دل مانے زباں ایسی کہ سب سمجھیں

■

Abdur Rahman
Room No : M252, Sutlej Hostel, JNU
New Delhi - 110067
mail:abdurrahman8971@gmail.com
Mob:9013278015

سوشل میڈیا اور اردو افسانہ

محمد علیم اسماعیل

اردو افسانے کی ترویج و ترقی میں سوشل میڈیا کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ امر روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ سوشل میڈیا پر اردو افسانے کی اشاعت بڑی تیز رفتاری سے ہورہی ہے۔ افسانہ عہد حاضر کی سب سے مقبول صنف بن گیا ہے۔ آج جتنا افسانہ لکھا جارہا ہے اور پڑھا جارہا شاید ہی کوئی دوسری صنف اتنی لکھی اور پڑھی جا رہی ہو۔ دوسری اصناف ادب کے مقابلے میں افسانے کی عمر بہت کم ہے۔ اس صنف کا باقاعدہ آغاز بیسویں صدی سے ہوا۔ اردو کے اولین افسانہ نگاروں میں پریم چند کا نام سب سے اہم ہے۔ ان کا پہلا افسانہ 'دنیا کا سب سے انمول رتن' 1908 میں رسالہ 'زمانہ' کانپور سے شائع ہوا تھا۔ جس طرح اُردو ادب میں افسانے نے بڑی تیزی سے ترقی کی ہے ٹھیک اسی رفتار سے انٹرنیٹ پر بھی اپنی جگہ بنائی ہے۔ جس میں فیس بک، واٹس ایپ، یوٹیوب، ایپس اور مختلف ویب سائٹس قابل ذکر ہیں۔

فیس بک اور اردو افسانہ

فیس بک ایک آن لائن امریکی ذرائع ابلاغ اور سماجی رابطہ کی کمپنی ہے۔ اس کی ویب سائٹ کو 4 فروری 2004 کو مارک زوکربرگ نے اپنے ہاورڈ یونیورسٹی کے ساتھیوں ادوارڈو سورین، اینڈریو میکولم، دوسٹن ماسکوفٹ اور کرس ہیوزس کے ساتھ مل کر لانچ کیا تھا۔ عہد حاضر میں سوشل میڈیا کے مختلف وسیلوں میں سے فیس بک ایک اہم وسیلہ ہے جس پر افسانے کی بڑی دھوم ہے۔ یہاں افسانے کی مقبولیت آسمان چھورہی ہے۔ افسانوی میلے لگ رہے ہیں اور افسانہ نگاروں کی ایک بڑی تعداد اس سے فیض یاب ہورہی ہے۔ ویسے تو فیس بک پر بہت سے گروپس موجود ہیں جو افسانے کی ترویج و ترقی میں دن رات کوشاں ہیں لیکن ان سب میں نمایاں گروپ جو آج ہمیں نظر آتا ہے وہ 'عالمی افسانہ فورم' ہے۔ عالمی افسانہ فورم ایک تنقیدی فورم ہے۔ افسانے کی ترویج و اشاعت کرنا، افسانہ نگاروں کو عالمی سطح پر ایک دوسرے سے اور عام قارئین سے متعارف کرانا، افسانوں پر تنقید، تجزیے اور تبصرے کرنا، سینئر افسانہ نگاروں کے ساتھ نئے افسانہ نگاروں کی بھی بھرپور نمائندگی کرنا، منتخب افسانے مختلف رسائل، ویب سائٹس پر شائع کرنا اور یوٹیوب پر پیش کرنا، افسانہ نگاری کے متعلق مضامین اور مقالات پیش کرنا ہے وغیرہ اس کے مقاصد ہیں۔ یہاں گروپ کے اراکین کے افسانوں کے ساتھ ساتھ اردو کے شاہکار افسانے بھی پیش کیے جاتے ہیں۔ افسانوں پر بے لاگ تنقید ہوتی ہے۔

تنقید نگار کو پوری آزادی ہوتی ہے جبکہ قلمکار کو اپنے افسانے پر کچھ بولنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہاں اچھے تنقید نگار اور اچھے اساتذہ موجود ہیں لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بے لاگ تنقید کے نام پر نئے افسانہ نگاروں کی حوصلہ شکنی اور دل آزاری بھی ہو جاتی ہے۔ 'منصف' یہ ایک تنقیدی گروپ ہے۔ 'تنقید نہیں اصلاح' یہی اس گروپ کا منشور اور موقف ہے۔ اردو ادب کی نئی پیڑھی تیار کرنا، نئے قلمکاروں اور افسانہ نگاروں کی، جو بے جا تنقید کی وجہ سے دل برداشتہ ہو بیٹھے ہیں، حوصلہ افزائی کرنا، مختلف یونٹس کا انعقاد کرنا، اساتذہ کی جانب سے نتائج کا اعلان ہونے کے بعد انعامات تقسیم کرنا اس گروپ کے مقاصد ہیں۔ یہاں گروپ کے اراکین کے افسانوں کے علاوہ عالمی ادب کے افسانے اور اردو کے شاہکار افسانے بھی پوسٹ کیے جاتے ہیں۔ نئے افسانہ نگاروں کے لیے یہ ایک بہترین پلیٹ فارم ہے۔ گروپ 'انہاک' ساؤتھ افریقہ سے شائع ہونے والے اردو کے پہلے عالمی ادبی جریدے کی ذیلی شاخ ہے۔ اس کا مقصد مائکرو فکشن کو اردو ادب میں اپنی الگ پہچان دلانا اور

افسانے کی ترویج و اشاعت کرنا ہے۔ یہاں افسانوی مقابلے اور یونٹس منعقد کیے جاتے ہیں۔ بہترین تخلیقات پر قلمکاروں کو انعامات سے سرفراز کیا جاتا ہے۔ گروپ کی منتخب تخلیقات کو 'انہماک' جریدے میں اور کتابی صورت میں شائع کیا جاتا ہے۔ فیس بک پر گروپوں کی اس بھیڑ میں ایک گروپ 'کہانی گھر' بھی ہے۔ افسانے کا فروغ اور افسانے کو عام کرنا اس کا مقصد ہے۔ اس گروپ پر افسانے اور فن افسانہ نگاری پر مضامین کے علاوہ کچھ بھی پوسٹ کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ یہاں اردو افسانوں کا ایک خزانہ موجود ہے۔ اب تک تین ہزار سے زائد افسانے اپ لوڈ ہو چکے ہیں۔ جن میں ترقی پسند، جدید اور نئے افسانے شامل ہیں۔ یہ کام ابھی اور تیز رفتاری سے جاری ہے۔ ''بزم یاران اردو ادب'' کے نام سے ایک گروپ کام کر رہا ہے۔ اردو ادب کی ترویج، ادب کے تئیں دلچسپی پیدا کرنا اور نئی نسل کی حوصلہ افزائی کرنا اس گروپ کے مقاصد ہیں۔ یہاں افسانوی ایونٹ (Event) منعقد ہوتے ہیں۔ افسانوں پر مضامین پوسٹ کیے جاتے ہیں۔ افسانے و افسانچے کے علاوہ دیگر

واٹس ایپ ایپلی کیشن اسمارٹ فونز کے لیے ایک فوری پیغام رسانی کی خدمت انجام دیتا ہے۔ اس کے ذریعے ایک دوسرے کو ٹیکسٹ پیغامات کے علاوہ تصاویر، ویڈیو اور صوتی پیغامات بھی بھیج سکتے ہیں۔ یہ ایپلی کیشن اینڈروائیڈ، بلیک بیری، ایپل آئی او ایس، نوکیا، سمبئین اور مائیکروسافٹ ونڈوز فون کے لیے بھی دستیاب ہے۔ واٹس ایپ کی بنیاد، جین کوم اور ان کے ساتھی برائن ایکٹن نے 2014 میں رکھی۔

نثری تخلیقات بھی پوسٹ کی جاتی ہیں۔ 'حروف ادب اکیڈمی' لاس انجلیس، امریکہ کا بھی ایک گروپ سرگرم ہے۔ جس کا نام ''حرف ادب'' ہے۔ جہاں افسانوی نشستوں کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ بہترین افسانوں پر انعامات بھی دیے جاتے ہیں۔ منتخب افسانے کتابی شکل میں اور حروف ادب میگزین میں شائع کیے جاتے ہیں۔ منتخب افسانوں کی آڈیو ریکارڈنگ انٹرنیشنل ریڈیو پر نشر کی جاتی ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ 'اردو افسانہ فورم'، 'ترویج افسانہ فورم'، 'عالمی افسانوی ادب'، 'عالمی افسانوی کارواں' گروپس بھی افسانے کی ترویج و اشاعت میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ انہی گروپوں میں ایک نام 'گرداب' بھی ہے۔ جس پر علامتی و تجریدی افسانے پیش کیے جاتے ہیں۔ علامتی و تجریدی افسانوں کی تحریک اور فروغ اس گروپ کا مقصد ہے۔ گروپ 'عالمی ادب کے اردو تراجم' جیسا کہ نام سے ظاہر ہے جہاں اردو میں ترجمہ شدہ عالمی ادب کے افسانے پیش کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ انحراف، ادبی کہکشاں، مہاراشٹر فکشن کلب اور کچھ فیس بک پیج بھی افسانے کی ترقی میں کوشاں ہیں جن میں راقم الحروف کا فیس بک پیج 'اردو افسانہ' بھی شامل ہے۔ ان گروپوں پر افسانے لگائے جاتے ہیں اور ان پر تنقید ہوتی ہے۔ اردو کے شاہکار افسانے اور عالمی ادب کے تراجم شدہ افسانے پیش کیے جاتے ہیں۔ ہر سال عالمی افسانوی میلے، جشن افسانہ ایونٹ، بزم افسانہ ایونٹ، افسانوی مقابلے، مختلف افسانوی ایونٹس اور آن لائن نشستوں کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ جس میں قلم کاروں سے افسانے لیے جاتے ہیں۔ افسانوں کے موضوع کے لحاظ سے بینر بنا کر اسے گروپ کی وال پر پیش کیا جاتا ہے۔ ایک دن میں ایک ہی افسانہ لگایا جاتا ہے۔ دن بھر اسی افسانے پر بات ہوتی ہے۔ افسانے کا تجزیہ ہوتا ہے، تبصرہ ہوتا ہے اور اس پر تنقید ہوتی ہے۔ افسانے کی خوبیوں کی پذیرائی ہوتی ہے اور خامیوں کی نشاندہی کی جاتی ہے۔ معروف و غیر معروف بھی افسانہ نگاروں کو موقع ملتا ہے۔ مختلف گروپس کی انتظامیہ میں وحید قمر، عامر صدیقی، صدف اقبال، ابرار مجیب، علی ثنار، ڈاکٹر ریاض توحیدی، سید تحسین گیلانی، طاہر انجم صدیقی، مجاہد سلیم، شاہد محمود گادری، شمسہ نجم، فوزیہ قریشی اور فرحین جمال وغیرہ شامل ہیں جو ہر وقت فعال اور سرگرم رہتے ہیں، اور گروپ کے اراکین کو بھی متحرک رکھتے ہیں۔ جو افسانے کے شائقین ان گروپوں میں شامل نہیں ہیں وہ گروپ کو اس کے نام سے

سرچ کر کے شامل ہونے کے لیے ایڈمن کو درخواست بھیج سکتے ہیں۔

واٹس ایپ اور اردو افسانہ

واٹس ایپ ایپلی کیشن اسمارٹ فونز کے لیے ایک فوری پیغام رسانی کی خدمت انجام دیتا ہے۔ اس کے ذریعے ایک دوسرے کو ٹیکسٹ پیغامات کے علاوہ تصاویر، ویڈیو اور صوتی پیغامات بھی بھیج سکتے ہیں۔ یہ ایپلی کیشن اینڈروائیڈ، بلیک بیری، ایپل آئی او ایس، نوکیا، سمبئین اور مائیکروسافٹ ونڈوز فون کے لیے بھی دستیاب ہے۔ واٹس ایپ کی بنیاد، جین کوم اور ان کے ساتھی برائن ایکٹن نے 2014 میں رکھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ واٹس ایپ کی بنیاد رکھنے سے پہلے دونوں دوستوں نے فیس بک میں ملازمت کے لیے درخواست دی تھی، جس کو منظور نہیں کیا گیا تھا۔ بعد میں 19 / فروری 2014 کو فیس بک نے واٹس ایپ کو 19 ارب ڈالر میں خریدا۔ واٹس ایپ اس وقت دنیا کی سب سے مقبول موبائل انٹرنیٹ میسیجنگ سروس ہے۔ فروری 2016 میں واٹس ایپ نے اعلان کیا تھا کہ اس کے فعال صارفین کی تعداد ایک ارب سے تجاوز کر چکی ہے، یعنی 2016 میں دنیا کا ہر ساتواں انسان واٹس ایپ استعمال کرتا تھا۔ یقیناً یہ تعداد آج اس سے زیادہ ہی ہوگی۔ واٹس ایپ سے مواد کی ترسیل و وصولیابی بہت آسان ہوگئی ہے۔ یہ کم وقت میں کم خرچ (ڈاٹا) پر تیز اور بہتر ترسیل کرتا ہے۔ محض مواد کی منتقلی کی رفتار ہی اس کے جواز کے لیے کافی ہے۔ اس کے ذریعے پیغامات کی دوطرفہ ترسیل ہوتی ہے۔ فیس بک کی طرح واٹس ایپ پر بھی بہت سے گروپس افسانے کو عام کرنے میں لگے ہیں۔ ان گروپس میں افسانے، افسانچے اور مضامین شیئر کیے جاتے ہیں۔ افسانوں پر تنقید و تجزیے کا عمل ہوتا ہے۔ یوں تو واٹس ایپ پر کئی گروپ بنتے اور مٹتے رہتے ہیں

لیکن افسانے کی ترویج واشاعت میں کوشاں چند سرگرم گروپس اس طرح ہیں۔قلمدان (فرحان دل)، ادبی کہکشاں (مجاہد سلیم)، اردو افسانہ و افسانچہ (محمد علیم اسماعیل)، نوجوان قلمکار (موسیٰ رضا)، اردو چینل (ڈاکٹر قمر صدیقی)، ہمارے مختصر افسانے (بشیر تیلاگامی)، جہان افسانچہ (ڈاکٹر مخشب مسعود اور ڈاکٹر ایم اے حق)، اردو فکشن (اعظم ایوبی)، بزم علم و ادب (عمران عاکف خان)، اردو اسکالرز (غلام نبی کمار)، نگینہ (اختر معراج)، اردو پوئٹری اینڈ لٹریچر (سالک جمیل براڑ)، انجمن محبان ادب (پروفیسر مبین نذیر)، اردو زبان و ادب (منظر علی خان) وغیرہ۔

نوٹ: قوسین میں مذکورہ گروپس کے بانی اور ایڈمن کے نام درج ہیں۔

یوٹیوب اور اردو افسانہ

یوٹیوب، ویڈیو پیش کرنے والی ایک ویب سائٹ ہے، جہاں صارفین اپنی ویڈیو پیش کر سکتے ہیں۔ یہ گوگل کے ماتحت ادارہ ہے۔ یوٹیوب پر صارفین کی جانب سے مواد انفرادی طور سے پیش کیا جاتا ہے۔ اس پر صارفین اپنے کھاتے بناتے ہیں۔ صارفین کے یہ کھاتے 'چینلز' کہلاتے ہیں۔ یوٹیوب پر ویڈیوز کا ایک بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ اس کے صارفین کی تعداد ایک ارب سے زیادہ ہے۔ یہاں ہر منٹ، تین سو گھنٹے کا ڈاٹا اپ لوڈ ہوتا ہے اور ایک دن میں تقریباً 5 ارب ویڈیوز دیکھے جاتے ہیں۔ یوٹیوب پر پہلی ویڈیو 23 اپریل 2005 کو اس کے شریک بانی جاوید کریم نے اپلوڈ کی تھی۔ یوٹیوب افسانے کی ترویج واشاعت کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔ یہاں ہم افسانوں کو سننے کے ساتھ ساتھ دیکھ بھی سکتے ہیں۔ حالانکہ زیادہ تر افسانے ایک تصویر کے ساتھ صرف آڈیو شکل میں پیش کیے گئے ہیں، لیکن کچھ افسانے ایسے بھی ہیں جنھیں سننے کے ساتھ ساتھ دیکھ بھی سکتے ہیں۔ افسانے کے شوقین افراد اور نئے سیکھنے والوں کے لیے یہ ایک بہترین ذریعہ ہے۔ انسان جب کوئی تحریر پڑھتا ہے تو دماغ اس کی تصویر بناتا جاتا ہے لیکن ویڈیو دیکھتے وقت دماغ کو امیج بنانے کی ضرورت نہیں ہوتی اس لیے ذہن میں تھکاوٹ بھی پیدا نہیں ہوتی اور تازگی برقرار رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تین گھنٹے فلم دیکھنے کے بعد بھی لوگ تھیٹر سے تھکے ہارے نہیں نکلتے بلکہ ہنستے ہنستے نکلتے ہیں جبکہ مسلسل تین گھنٹے پڑھنے سے ذہنی تھکاوٹ کا آنا لازمی ہے۔ یوٹیوب چینل 'ریڈیو مرچی' پر 'ایک پرانی کہانی' عنوان کے تحت سعادت حسن منٹو اور دیگر افسانہ نگاروں کے افسانے محترمہ آرجے صائمہ کی بہترین آواز میں موجود ہیں۔ یہاں درست تلفظ، بہترین لب و لہجہ اور مناسب اتار چڑھاؤ کے ساتھ افسانوں کی ویڈیوز اپلوڈ کی گئی ہیں۔ یہاں مکالموں کی درست ادائیگی اور منظر نگاری کا پورا خیال رکھا گیا ہے۔ افسانے میں اگر بارش کا موسم دکھایا گیا ہے تو بارش ہونے کی آواز، بادل گرجنے کی آواز، مختلف حرکت و عمل اور چیزوں کی آواز، لڑکیاں ہنس رہی ہیں تو ان کی کھلکھلاہٹ اور پرندوں کی چہچہاہٹ وغیرہ بیک گراؤنڈ ساؤنڈ کے ساتھ نہایت ہی مؤثر و دلکش انداز میں افسانے پیش کیے گئے ہیں۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا یوٹیوب چینل 'اردو کونسل' پر پریم چند کے افسانوں کے آڈیوز موجود ہیں۔ اس کے علاوہ افسانوی تکنیک پر گفتگو کے ویڈیوز بھی شامل کیے گئے ہیں۔ یوٹیوب چینل 'عابد علی بیگ' پر عابد علی کی خوبصورت، جادو بھری؛ سریلی آواز میں افسانے سنائے گئے ہیں۔ یہاں پر بھی افسانوں کی پیشکش، سرور بخش اور متاثر کرنے والی ہے۔ یوٹیوب چینل 'جشن ادب' پر آرجے صائمہ کے پڑھے گئے افسانوں کی ویڈیوز اپلوڈ کی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ اور بہت سے چینل سرگرم ہیں جو افسانوں کی آڈیو۔ ویڈیو تیار کر کے اپنے چینل پر شیئر کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً: اردو میٹرو، بک لورس، این وائی کے اینڈ بکس، اردو ناولز، نوجوان تخلیق کار، صبا جی لائبریری، ارشد منیم شارٹ اسٹوری، افسانے دیوانے، ادبی دنیا، نادر اردو آڈیو، اردو چینل، ڈاکٹر نگہت نسیم، تسنیم منٹو، آئی اسٹوریز، زندگی نامہ، سکھ جیت بادشاہ، روما رضوی وغیرہ۔ بہت سے ادیب اور ادب نواز حضرات انفرادی طور سے بھی افسانے پیش کرتے رہتے ہیں۔ سرچ کرنے میں آسانی ہو اس لیے چند چینلز کے نام انگریزی میں درج کیے جا رہے ہیں:

Radio Mirchi, Urdu Council, Abid Ali Baig, Urdu Metro, Afsanay Deewanay, Urdu Novels,

Nadir URDU Audio, Adbi Duniya, Urdu Studio, UrduChannel, Zindagi Nama, Book Lovers

Dr. Nighat Nasim, Tasnim Minto, I stories, Saba G Library Arshad Muneem Story, Sukhjit Badshah, Jashn-e-Adab, Roma Rizvi etc.

روز بروز یوٹیوب چینلز تیار ہو رہے ہیں اور کلاسیکل افسانوں کے ساتھ ساتھ نئے افسانے بھی اپ لوڈ ہو رہے ہیں۔ اس طرح یوٹیوب پر افسانے کی ترویج و ترقی بڑی تیزی سے ہو رہی ہے۔ یوٹیوب کے سرچ آپشن میں 'Urdu Afsana' یا 'اردو افسانہ' لکھ کر تلاش کریں تو آڈیو۔ ویڈیو افسانے کے بہت سارے رزلٹ سامنے آجاتے ہیں۔

ایپلی کیشن اور اردو افسانہ:

کتابوں سے کہانیاں پڑھنے والوں کی تعداد دن بہ دن قلیل ہوتی جا رہی ہے، خاص طور پر نئی نسل کتاب بینی سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ کبھی کبھی تو ایسا بھی لگتا ہے کہ کتابوں سے محبت کی یہ آخری صدی ہے۔ کہانی انسان کی پسندیدہ صنف ہے۔ کہانیاں سننے، سنانے اور پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں، لیکن آج کل کہانیاں پڑھنے اور سننے کے ساتھ ساتھ دیکھنے کا چلن زیادہ بڑھ رہا ہے۔ افسانوں کے آڈیو۔ ویڈیو البم ریلیز ہو رہے ہیں۔ فلم، شارٹ فلم، ٹی وی پروگرام اور حقیقی کہانیوں پر مبنی سیریل جیسے کرائم پٹرول اور ساودھان انڈیا وغیرہ۔ ان سب میں کہانیاں ہی ہوتی ہیں۔ 2012 میں 'کہانی ندی' کے عنوان سے ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کے تین افسانے اور تین افسانچوں کا ایک آڈیو البم ریلیز ہوا تھا، جس کو خاصا پسند کیا گیا۔ اس میں موجود تمام افسانے ان ہی کی آواز میں ریکارڈ ہوئے تھے۔

'ریختہ' کی ویب سائٹ پر تو نئی پرانی بے شمار

کہانیاں موجود ہیں۔ اور اب صوتی کہانیاں بھی اپلوڈ ہو رہی ہیں۔ قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان کی ویب سائٹ پر کتابی شکل میں کلاسیکل افسانے مل جاتے ہیں، اردو آڈیو لائبریری میں پریم چند کے افسانوں کی آڈیوز دستیاب ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہی صوتی کہانیاں قومی اردو کونسل کے ایپلی کیشن پر بھی مل جاتی ہیں۔ گوگل پلے اسٹور اور ایپل ایپ اسٹور سے موبائل ایپلی کیشن حاصل کیے جاتے ہیں۔ گوگل پلے اینڈ رویڈ اختراعات کے سافٹ ویئرس کا ایک آن لائن اسٹور ہے، جو گوگل کے ماتحت ہے۔ پہلے اس کا نام اینڈرویڈ مارکیٹ تھا، مارچ 2012 کو نام بدل کر گوگل پلے کر دیا۔ گوگل پلے اسٹور پر افسانے پڑھنے سے متعلق بہت سے ایپس موجود ہیں، جن میں افسانے، اردو افسانے، بہترین

افسانے، منٹو کے افسانے، دلچسپ افسانے، اشفاق احمد کے افسانے، غلام عباس کے افسانے، ممتاز مفتی کے افسانے، پریم چند کے افسانے، کلاسک افسانے اور کہانیاں، قرۃ العین حیدر کے ناولز وغیرہ ایپس مل جاتے ہیں۔ انہی کے ساتھ ساتھ پلے اسٹور میں آڈیو کہانیوں کے لیے بھی ایپس دستیاب ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں بہت سے پبلشرز کتابوں کو صوتی شکل میں بھی پیش کر رہے ہیں۔ گوگل پلے اسٹور پر آڈیو بکس کے ایپس میں ''کنڈل'' اور ''اسٹوری ٹیل'' کافی مشہور ہیں، جس میں انگریزی اور ہندی کے ساتھ ساتھ اردو کہانیاں بھی موجود ہیں۔ مبشر اکبر اپنے مضمون ''صوتی کتابیں اور کہانیاں مطالعہ کا متبادل بن رہی ہیں'' میں لکھتے ہیں:

''ان ایپس میں ایک ایمزون کی 'کنڈل' ہے جبکہ گوگل کی بھی اپنی کچھ ایپس ہیں لیکن ان میں ایک مشہور نام 'اسٹوری ٹیل' ایپ کا ہے۔ ہر چند کہ پلے اسٹور کی سرچ میں یہ کافی نیچے ملتی ہے لیکن ان کے پاس انگریزی کے علاوہ ہندی اور اردو کا بہت بڑا خزانہ ہے۔ ان کی ویب سائٹ جو ہماری توجہ کا مرکز بن گئی، پر اردو کے سلسلے میں خاصا اہتمام کیا گیا ہے۔ وہ اس لحاظ سے کہ یہاں مجتبیٰ حسین کی حیدرآباد کے تعلق سے شگفتہ بیانی کو صوتی کتاب کے قالب میں ڈھالا گیا ہے تو قرۃ العین حیدر کی 'بڑے آدمی' کو بھی آواز عطا کی گئی ہے۔ ان کے علاوہ یہاں پر میر باقر علی کا قصہ ہے، احمد ندیم قاسمی کا مشہور افسانہ 'وحشی' ہے، ضمیر الدین احمد کی تخلیقات ہیں اور امتیاز علی تاج کے چچا چھکن بھی موجود ہیں۔ عصمت چغتائی کی منتخب کہانیاں بھی یہاں لوڈ کی گئی ہیں اور سعادت حسن منٹو کے تقسیم وطن کے پس منظر میں لکھے گئے افسانوں کو بھی آواز عطا کی گئی ہے۔ اس ویب سائٹ پر چند ایک ناول بھی اپلوڈ ہیں جن میں مرزا محمد ہادی رسوا کا مشہور زمانہ ناول 'امراؤ جان' بھی ہے۔ اردو کے سیکشن میں مکمل کتاب کے طور پر منٹو، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، مجتبیٰ حسین، نیر مسعود اور دیگر کی تخلیقات موجود ہیں جبکہ نقوش کا طنز و مزاح نمبر بھی اس ویب سائٹ پر صوتی شکل میں اپ لوڈ کیا گیا ہے۔ اسٹوری ٹیل ہر چند کہ پلے اسٹور میں مفت میں دستیاب ہے لیکن اس پر کچھ کتابیں سننے کے لیے فیس بھی رکھی گئی ہے جو کہ بہت زیادہ نہیں ہے۔''

زمانہ بڑی تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔ نئی نئی چیزیں ایجاد ہو رہی ہیں۔ لوگ ان چیزوں سے فیض یاب ہو رہے ہیں۔ وقت تبدیلی کا مظہر ہے۔ اور تبدیلی زندگی کی علامت ہے۔ یہ ایک مستقل عمل ہے جو ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ زیادہ دور نہیں جاتے اکبر بادشاہ کے زمانے کی ہی بات کرتے ہیں، اس وقت اگر کوئی ویڈیو کالنگ کی بات کرتا اور کہتا کہ دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے پر موجود دو اشخاص ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے بات کریں گے تو اسے پاگل خانے بھیج دیا جاتا۔ ٹیکنالوجی کے اس دور میں اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ادب بھی جدید ٹیکنالوجی سے متاثر ہوگا اور اس بات میں کوئی شک نہیں کہ آنے والا وقت آڈیو-ویڈیو کتابوں کا ہے۔

ویب سائٹ اور اردو افسانہ:

اخبار کی زندگی ایک دن کی، رسالے کی زندگی ایک مہینے کی اور کتاب کی زندگی سو سال کی ہوتی ہے لیکن آن لائن لوڈ کی گئی تخلیقات حیات ابدی حاصل کر لیتی ہیں۔ فیس بک، یوٹیوب، اپلیکیشن اور ویب سائٹ پر پیش کی گئی تخلیقات ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جاتی ہیں۔ جس سے آنے والی نسلیں فیض یاب ہو سکتی ہیں۔ ویب سائٹ کی اگر بات کی جائے تو ایسی بے شمار ویب سائٹس موجود ہیں جہاں افسانے پیش کیے جاتے ہیں۔ ویب سائٹ ایک انٹرنیٹ سروس ہے جو صارفین کی درخواست پر صفحات ویب کی توثیق کرتی ہے۔ ویب سائٹس سے افسانے پڑھنے والوں کی تعداد بھی کافی بڑی ہے۔ ریختہ اردو کی سب سے بڑی معیاری اور حوالہ جاتی ویب سائٹ ہے۔ اس ویب سائٹ کے بانی سنجیو صراف ہیں۔ انھوں نے جنوری 2013 میں اسے لانچ کیا تھا۔ یہاں ای بکس کا ایک خزانہ موجود ہے۔ جس میں نئے پرانے بے شمار قیمتی افسانوی مجموعے موجود ہیں۔ اس ویب سائٹ پر روزانہ تقریباً 58 ہزار صفحات دیکھے جاتے ہیں۔ یہاں تخلیقات اردو کے علاوہ دیوناگری اور رومن رسم الخط میں بھی پیش کی گئی ہیں۔ بزم اردو لائبریری، مفت اردو کتابیں اور اردو کی برقی کتابیں ان تینوں ویب سائٹس پر افسانوی مجموعے اور دیگر کتابیں بڑی خوبصورتی سے یونی کوڈ فارمیٹ میں لوڈ کی گئی ہیں۔ یہاں ہم کتابوں کو آن لائن پڑھنے کے ساتھ ساتھ ڈاؤن لوڈ بھی کر سکتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ کاپی پیسٹ کی سہولت بھی مہیا کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اردو چینل، اردو فکشن، اسٹوری ٹیل، اور فسوں کار، قومی اردو کونسل، شعر و سخن، جہان اردو، اودھ نامہ، ورلڈ اردو ایسوسی ایشن، اردو ڈاٹ ان، اردو یوتھ فورم، عالمی پرواز، قندیل، اردو ویب ڈیجیٹل لائبریری، اردو نوٹس، کتابستان، اردو لائف، اردو پوائنٹ اور پنجند، وغیرہ ویب سائٹس پر بے شمار افسانے دستیاب ہیں۔ ایسی ویب سائٹس بھی موجود ہیں جہاں آڈیو- ویڈیو افسانے بھی لوڈ ہوئے ہیں جن میں ریختہ، قومی اردو کونسل اور اسٹوری ٹیل کی ویب سائٹس نمایاں نظر آتی ہیں۔ ویب سائٹ پر موجود افسانے گوگل سے بہ آسانی سرچ کیے جا سکتے ہیں۔

■

Mohd Alim Ismail (Teacher)
Behind police station, Ward No. 15
At, Post, taluka-Nandura (443404)
Dist-Buldana - 443404 (Maharashtra)
Mob. No. 8275047415

ایس ٹی نوراللہ

جنوبی ہند میں آن لائن اردو رسائل اور ویب پورٹل

آج ٹکنالوجی کی ترقی کے اس دور میں اردو کے اخبار و رسائل کثیر تعداد میں شائع ہو رہے ہیں جن میں خبروں کے علاوہ علمی و ادبی، سماجی و تہذیبی اور سائنس اور ٹکنالوجی پر مشتمل جانکاری، مضامین، مقالے، شذرات، کالم، اداریے اوراشتہارات شائع ہوتے رہتے ہیں۔ یاد رہے کسی زمانے میں اشتہارات قاری پر اور ادارے پر گراں معلوم ہوتے تھے اور زیادہ اشتہارات کی شمولیت ادارے کی کمزوری گردانی جاتی تھی۔لیکن آج اس میدان میں ایسی ترقی ہوئی ہے کہ یہ عیب نہیں بلکہ ہنر بن گیا ہے۔کئی اخبار ایسے ہیں جو اچھے اشتہارات کی وجہ سے دلچسپی سے خریدے جاتے ہیں۔

آج دنیا کے ہر شعبے میں نت نئے تجربات ہو رہے ہیں۔ترقی کی رفتار بہت تیز ہو چکی ہے۔ایسی صورت میں قاری یہ چاہتا ہے کہ اس کو وقت پر صحیح خبریں اور معلومات حاصل ہوتی رہیں۔اسی فکر کی وجہ سے دنیا میں ایسی ترقی ہوئی ہے کہ گھر بیٹھے لمحوں میں دنیا کی خبروں سے بہرہ ور ہونے کی سہولت فراہم ہوتی ہے۔اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مقتضائے حال کے مطابق قاری یہ چاہتا ہے کہ کم سے کم وقت، کم سے کم خرچ اور کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ اطلاعات مہیا ہو جائیں۔ آج زمانے کے ساتھ صحافت میں بھی انقلابی تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔ آپ سب جانتے ہیں کہ یہ دور کمپیوٹر کا دور ہے۔کمپیوٹر اور انٹرنیٹ نے انسانی زندگی کو اسیر بنا رکھا ہے۔اب اخباروں کے ساتھ بڑے پیمانے پر عوام تک رسائی انٹرنیٹ کے ذریعے ہی ہو رہی ہے۔اس سلسلے میں علی احمد فاطمی یوں کہتے ہیں:

''اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ نے نہ صرف مشینی بلکہ ترسیلی اور تہذیبی دنیا میں زبردست انقلاب برپا کر دیا ہے۔''

(ماہنامہ صبح اردو ص 1 نومبر 2018)

اردو صحافت نے ہر دور میں عوامی اور قومی مسائل کو اجاگر کیا اور لوگوں کی رہبری کی۔اردو صحافت میں اخبار و رسائل خاص اہمیت کے حامل ہیں۔مسرت کی بات یہ ہے کہ آج ٹکنالوجی کی ترقی کے اس دور میں اردو کے اخبار و رسائل کثیر تعداد میں شائع ہو رہے ہیں جن میں خبروں کے علاوہ علمی و ادبی، سماجی و تہذیبی اور سائنس اور ٹکنالوجی پر مشتمل جانکاری، مضامین، مقالے، شذرات، کالم، اداریے اور اشتہارات شائع ہوتے رہتے ہیں۔یاد رہے کسی زمانے میں اشتہارات قاری پر اور ادارے پر گراں معلوم ہوتے تھے اور زیادہ اشتہارات کی شمولیت ادارے کی کمزوری گردانی جاتی تھی۔لیکن آج اس میدان میں ایسی ترقی ہوئی ہے کہ یہ عیب نہیں بلکہ ہنر بن گیا ہے۔کئی اخبار ایسے ہیں جو اچھے اشتہارات کی وجہ سے دلچسپی سے خریدے جاتے ہیں۔اشتہارات کی دنیا کی یہ ترقی بھی کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کی مرہون منت ہے۔آج حال یہ ہے کہ مطبوعہ اخبار و رسائل کے علاوہ انٹرنیٹ پر بھی کئی قسم کے اخبار و رسائل اور ویب پورٹل موجود ہیں جو پرنٹ نہیں ہوتے بلکہ صرف آن لائن موجود رہتے ہیں اور ان کی حصول یابی بھی نہایت آسان ہے۔جب چاہے لمحوں میں مطالعہ ہو سکتا ہے۔اپنے مقالے کے عنوان کے مطابق میں یہاں ایسے اخبارات اور ویب پورٹلز کا جائزہ لوں گا جو کاغذی شکل میں شائع نہیں ہوتے بلکہ جن میں سے اکثر و بیشتر نیوز پورٹلز یا ویب میگزین کی شکل میں شائع ہوتے ہیں۔ جنوبی ہندوستان میں تلنگانہ، اور کرناٹک یہ دو ایسی ریاستیں ہیں جہاں اس طرح کے اردو اخبار و رسائل بڑی تعداد میں آن لائن موجود ہیں۔

1۔ **تعمیر نیوز** (Taemeernews.com)، حیدرآباد

یہ ویب پورٹل دسمبر 2012 میں شروع کی گئی۔ یہ پورٹل آئی۔ایس۔ایس۔این (ISSN) کے ساتھ موجود ہے۔اس کے سرورق پر لکھا ہے کہ'' یہ ایک سماجی، ثقافتی اور ادبی نیوز پورٹل ہے''۔ اس پر گزشتہ ایک سال سے روزانہ کی خبروں کی اشاعت مسدود ہے، اس کے بجائے مختلف موضوعات مثلاً تاریخ دکن اور تاریخ ہند، ادب اطفال، علمی و ادبی تحقیق و تجزیہ پر مبنی مضامین کی اشاعت پر زیادہ توجہ مرکوز ہے۔اس پورٹل میں خبروں کے صفحہ میں تازہ خبریں، ملک اور بیرونی ممالک کی خبریں، عالمی

خبریں، انگریزی خبریں کھیل کود اور صفحۂ ہند نامہ میں ہندوستانی مسلمان اور ہندوستانی ثقافت اور صفحۂ 'نقطۂ نظر' میں کالم/ تجزیہ وغیرہ موجود ہیں۔ دکن نامہ کے نام سے ایک صفحہ ہے جس میں تاریخ دکن، سندرلال رپورٹ اور تاثرات دکن پر مختلف مضامین پوسٹ ہوتے رہتے ہیں۔ اگلا صفحہ ادب نامہ کے نام سے موسوم ہے جس کے تحت نثری ادب، کلاسیکی ادب، کتب، شاعری، افسانہ، طنز و مزاح اور تبصرۂ کتب وغیرہ ذیلی عناوین ہیں۔ تفریح والے صفحے میں فلم و تفریح، فلمی نغمے، کارٹون اور تصاویر شامل ہیں۔ انٹرویو کے صفحہ پر گفتگو/ مصاحبہ، اور مکالمہ/ مباحثہ موجود ہیں۔ صفحۂ دینیات میں مذہب و روحانیت، رمضان المبارک کے علاوہ حج اور قربانی کے موضوعات پر مضامین حسب ضرورت شامل رہتے ہیں۔ متفرقات میں ہمارا معاشرہ، شادی شدہ زندگی، سیاست، پریس نوٹ، رپورتاژ اور الیکشن شامل ہیں۔ اس کے علاوہ سائنس نامہ اور آرکیوز کے نام پر بھی الگ الگ صفحات موجود ہیں۔ اس پورٹل پر روزانہ قارئین کی تعداد تقریباً 2500 ہے۔ اس پورٹل کو تقریباً 33 ہزار روپے مالیت کے اشتہارات کی ماہانہ آمدنی متوقع ہے۔ اس کے بانی اور اعزازی مدیر مکرم نیاز ہیں۔ تعمیر نیوز کے اغراض و مقاصد کچھ اس طرح ہیں:

"2018 سے تعمیر نیوز کو ایک علمی، ادبی، سماجی اور ثقافتی پورٹل میں تبدیل کیا گیا ہے۔ تبدیلی کی بنیادی فکر یہی ہے کہ اردو داں قارئین کے ذوق مطالعہ میں اضافے کی خاطر انھیں صرف خبروں تک محدود رکھنے کے بجائے اردو زبان و ادب کے اس علمی ذخیرے سے مستفید کیا جائے جس کی سائبر دنیا میں آج بھی کمی محسوس کی جاتی ہے"۔ (taemeernews.com)

2۔ **وائی دس نیوز** (ythisnews.com)، حیدرآباد

حیدرآباد سے اسی سال کی ابتدا میں شروع ہونے والا نیوز پورٹل اردو اور انگریزی کے علاوہ 'رومن اردو' میں بھی علیحدہ ویب سائٹ بنا رکھا ہے۔ اس پورٹل پر روزانہ ناظرین کی تعداد ایک سو ہے۔ اس پورٹل کے صفحات الگ الگ ہیں جن میں پہلے 'توقعات' ہے جس میں حیدرآباد کے شب و روز، افراتفری، احوال دکن، داخل ہند، روداد عالم، لہو و لعب اس کے بعد مفردات، عجائب و غرائب، صحت و تندرستی، تحقیق و تخلیق، مفاد عامہ، اقتصادیات، نقطۂ نظر اور ویڈیوز وغیرہ پر مشتمل الگ الگ صفحے موجود ہیں۔ اس کے مدیر حیدرآباد کے بے باک صحافی اطہر معین ہیں۔

3۔ **جہانِ اردو** (jahan-e-urdu.com)، حیدرآباد

اردو ادب، نظم و نثر، تحقیق و تنقید اور تبصرۂ کتب کے مواد پر مشتمل یہ ویب پورٹل حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے پروفیسر ڈاکٹر سید فضل اللہ مکرم کی تخلیق ہے جس کا آغاز اکتوبر 2014 میں کیا گیا۔ اس پورٹل کے تعارف، مدیر اعلیٰ اور رابطے کے علیحدہ صفحات مختص ہیں۔ پورٹل پر روزانہ ناظرین کی تعداد 300 ہے۔ اس پورٹل کے اغراض و مقاصد میں کچھ اس طرح لکھا ہے:

"اردو کی نئی نسل کے لیے یہ سائٹ مخصوص ہے۔ اردو کے چاہنے والوں کے لیے مطلوبہ مواد پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔" (jahan-e-urdu.com)

جہانِ اردو میں مختلف موضوعات کے لیے الگ الگ صفحات مختص ہیں جن میں ادب اطفال و نسواں، ادب عالیہ، افسانوی ادب، تاثراتی مضامین، تبصرۂ کتب، تحقیق و تنقید، تعلیم و روزگار، تہذیبی خبریں، جہانِ تقاریب، جہانِ دیگر، سائنس و طب، شخصیت سازی اور متفرقات وغیرہ۔

4۔ **اردو لیکس** (urduleaks.com)، حیدرآباد

یہ ویب پورٹل فروری 2016 میں بنائی گئی۔ اس کے تعارفی صفحے کے بیان کے مطابق 'اردو لیکس' میں پیشہ ور صحافیوں کی ایک ایسی ٹیم کام کر رہی ہے جو صحافت میں کئی سال کا تجربہ رکھتی ہے۔ ویب سائٹ پر روزانہ قارئین کی تعداد 25 ہے۔ اس پورٹل کے سرورق پر لکھا ہے:

"'اردو لیکس' کے آغاز کے ذریعے ہم نے تمام نوعیت کی خبروں کا احاطہ کرنے کی ایک معمولی کوشش کی ہے جس کا مقصد اندرون و بیرون ممالک میں رہنے والوں کو دنیا کی تازہ ترین خبروں سے واقف رکھنا ہے۔ بالخصوص قومی اور ریاستی خبروں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ناظرین کو تازہ واقعات سے واقف کروانا ہی ہمارا واحد منشاء اور مقصد ہے"۔ (urduleaks.com)

'اردو لیکس' کے سائٹ پر مختلف صفحات موجود ہیں جن میں سے خبریں اور اس کے ذیلی عناوین میں سے جرائم، انٹرٹینمنٹ، نیشنل نیوز، بزنس، ایجوکیشن اور ہیلتھ، پھر اسپیشل اسٹوری، تلنگانہ، انٹرنیشنل نیوز، این۔ آر۔ آئی، متفرق خبریں، مبارکباد، ویڈیوز وغیرہ شامل ہیں۔ مدیر اعلیٰ محمد ذیشان علی کی سرکردگی میں اس نیوز پورٹل کا سفر جاری ہے۔

5۔ **الهلال میڈیاڈاٹ کام**

(alhilalmedia.com)، حیدرآباد

اس کے ایڈیٹر مولانا مقصود یمانی ہیں۔ اس سائٹ پر موضوعات کے مطابق مختلف صفحات موجود ہیں۔ ان میں سے پہلا صفحہ ہندوستان، اہم خبریں، حیدرآباد و اطراف، بین الاقوامی، عرب دنیا، مضامین، اسلامیات/ ادبیات اور روزگار کی خبروں پر مشتمل ہے۔ یاد رہے کہ یہ سائٹ مولانا ابوالکلام آزاد کی یاد میں بنائی گئی ہے۔ اس پورٹل کے سرورق پہ لکھا گیا ہے کہ "بیادگار مولانا ابوالکلام آزاد" تو ظاہری بات ہے کہ اس پورٹل کا نام مولانا آزاد کے اخبار 'الہلال' سے لیا گیا ہے۔

6۔ **شعر و ادب ویب میگزین**

(www.sheroadab.org)، گلبرگہ

شہر گلبرگہ سے مارچ 2014 میں اس کا آغاز ہوا۔ اس کے مدیر اعلیٰ ڈاکٹر سید عارف مرشد ہیں۔ اس ویب میگزین کے اغراض و مقاصد میں یوں لکھا ہے:

"ہماری کوشش یہ رہے گی کہ معیاری ادب عوام کے لیے پیش کریں۔ جس میں کہنہ مشق ادبا، شعرا کے ساتھ ساتھ نئے قلم کاروں کی ہمت افزائی ہوتی رہے۔ اس جذبے کے ساتھ ہم آپ کے سامنے یہ E-magzain پیش کر رہے ہیں"۔ (www.sheroadab.org)

وائی دس نیوز
YTHISNEWS.COM
اردو لیکس
NEWS
URDULEAKS
ISSN : 2349-0268
A Social, Cultural & Literary Urdu Portal
تعمیر نیوز
Taemeer News

شعروادب ویب میگزین میں مختلف موضوعات پر کئی صفحات درج ہیں۔ جن میں تحقیق وتنقید، مزاحیہ ادب، نثری ادب، شعری ادب، صحت اور ویڈیو زون وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔

7۔ ساحل آن لائن

(sahilonline.net)، کرناٹک

یہ مارچ 2007 میں قائم ہوا۔ خبروں میں ساحل خبریں، ریاستی خبریں، ملکی خبریں، خلیجی خبریں، عالمی خبریں، اسپورٹس اور سائنس اور ٹکنالوجی پر مشتمل یہ پورٹل کے روزانہ ناظرین کی تعداد 1200 ہے۔ ساحل آن لائن ویب سائٹ کے تعارفی صفحے پر لکھا ہے:

''ساحل آن لائن ریاست کرناٹک سے شائع ہونے والا تین زبانوں (اردو/ کنڑا/ انگریزی) کا منفرد نیوز پورٹل ہے جو ساحلی کنڑا کی خبروں کے ساتھ ساتھ ریاستی، قومی، اور بین الاقوامی خبروں سے آپ کو باخبر رکھتا ہے''۔ (sahilonline.net)

8۔ بھٹکلیس ڈاٹ کام

(bhatkallys.com)، بھٹکل

یہ ویب سائٹ ہندوستان سے اردو کی ان اولین ویب سائٹس کے زمرے سے تعلق رکھتی ہے، جس نے سائبر دنیا میں ہونے والی روز بہ روز ترقی اور تبدیلی کا درجہ بہ درجہ ساتھ دیا ہے اور آج بلاشبہ انٹرنیٹ کی فنی خوبیوں سے مزین ہے۔ محمد محسن شابندری نے اس کا اجرا جنوری 2003 میں کیا۔ ابتدا میں اس ویب سائٹ کے ذریعے مسلمانانِ بھٹکل اور نوائط برادری کے افراد کو تعلیمی اور معاشی میدانوں میں رہنمائی اور کیریئر گائڈنس دینا مقصود تھا۔ اس کا نام بھی اسی مناسبت سے ہے۔ مولوی عبدالمتین منیری کی تیس سال کی محنت سے جمع کردہ گذشتہ نصف صدی پر محیط نادر و نایاب آڈیوز بھی اس ویب سائٹ پر موجود ہیں۔ اس ذولسانی ویب سائٹ کا تعارفی صفحہ، ادارہ اور اس کے اراکین کی معقول معلومات فراہم کرتا ہے۔ اس پورٹل پر مختلف عناوین پر مشتمل کئی صفحات موجود ہیں۔ جیسے پہلا صفحہ ویڈیو ہے جو حمد ونعت، بھٹکل کمیونٹی، نائطی شاعری، طنز ومزاح، اردو کلام، اردو تقاریر اور انٹرویو پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد بکس کا صفحہ ہے جس کے ذیلی عناوین کچھ اس طرح ہیں تازہ کتابیں، مولانا ابوالحسن اکیڈمی بکس اور نائطی بکس، اس کے بعد خبریں والے صفحے میں بھٹکل کی خبریں، خلیجی خبریں، صوبائی خبریں، قومی خبریں، عالمی خبریں، تجارت کی خبریں، ٹکنالوجی کی خبریں، کیریئر اور تعلیمی خبریں، مضامین، کھیل کی خبریں موجود ہیں۔ پھر فوٹو گیلری کے تحت فوٹو نیوز، بھٹکل ہر بیچ، بھٹکل بندر، بھٹکل کے محلے، تعلیمی ادارے وغیرہ مختص ہیں۔ اس کے بعد آڈیو کا صفحہ ہے جس میں بیش بہا سمعی مواد موجود ہے۔ اس کے ذیلی عناوین کچھ اس طرح ہیں جمعہ خطبات، دعاء، درس قرآن، حمد ونعت، انٹرویو، بچوں کی نظمیں، نائطی کلام، تلاوت قرآن، تقاریر، طنز ومزاح اور اردو کلام وغیرہ۔ اس سائٹ پر روزانہ ناظرین کی تعداد 700 ہے۔

9۔ فکر و خبر (fikrokhabar.com)، بھٹکل

ریاست کرناٹک میں شہر بھٹکل سے ستمبر 2012 میں اس کا اجراء ہوا۔ سید ہاشم نظام الدین ندوی اس کے مدیر ہیں۔ اس سائٹ پر روزانہ ناظرین کی تعداد 300 ہے۔ خبریں والے صفحے کے تحت ساحلی خبریں/ کرناٹک، ملکی خبریں، عالمی خبریں، خلیجی خبریں اور عالم اسلام پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد فضائل و مسائل والے صفحے کے ذیلی عناوین میں فضائل و آداب، فقہی مسائل، مناسبات اور دعوت وارشاد ہیں۔ اس کے بعد تعلیم وتربیت ہے جس کے ذیلی عناوین کچھ اس طرح ہیں۔ نصاب تعلیم، درس وتدریس، مدارسِ اسلامیہ، عصری مدارس، تعارف کتب اور کتب خانے وغیرہ۔ اسلامی معاشرت والے صفحے کے تحت حقوق والدین، حقوق زوجین، اور تربیت اطفال ذیلی صفحات ہیں۔ ایک صفحہ تاریخ وسوانح پر مشتمل ہے جس میں تاریخ اسلام، سیرت انبیاء، سیرت صحابہ، سیرت سلف اور سیرتِ مشاہیر معاصر وغیرہ شامل ہیں۔ اگلے صفحے کا عنوان اردو ادب ہے جس میں مضامین، شعروسخن اور طنز و مزاح پر مشتمل مواد پوسٹ کیا جاتا ہے۔ ایک صفحہ خصوصی ہے جس میں بچوں کے نام، خواتین، طب وصحت اور نو جوان جیسے ذیلی صفحات ہیں۔ ایک صفحہ گیلری پر مشتمل ہے جس میں فوٹو گیلری، ویڈیو، آڈیو اور کتاب لائبری شامل ہیں۔ ان کے علاوہ کھیل اور مضامین وتبصرہ پر بھی مشتمل دو صفحات شامل ہیں۔ فکروخبر کے اغراض ومقاصد میں یوں لکھا ہے:

''فکروخبر صرف ایک آن لائن اخبار نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسا ادارہ ہے جس کے بنیادی مقاصد میڈیا اور جدید ٹکنالوجی کا استعمال کرتے ہوئے محبت سے خداوندی پیغام اور حق اور حقیقت کی آواز کو دنیائے انسانیت تک پہنچانا، صالح نوجوانوں اور بالخصوص علماء کو صحافت سے جوڑتے ہوئے معاشرہ کو درپیش تعلیمی، ثقافتی اور سماجی مسائل کا صحیح حل پیش کرنا ہے۔ ساتھ ہی خدمت خلق کے عظیم فریضہ کو انجام دیتے ہوئے نئی نسل کو تعلیمی میدان میں آگے بڑھا کر ملت کی صحیح قیادت کے لیے تیار کرنا ہے''۔ (fikrokhabar.com)

ہند و پاک میں لاتعداد آن لائن اخبار و رسائل کا سلسلہ جاری ہے اور آئندہ بھی اس شعبے میں اور ترقی ہوسکتی ہے۔ سیمینار کا عنوان محدود رہنے کے سبب میں نے جنوبی ہندوستان کے حوالے سے چند نکات کو آپ کے سامنے لانے کی سعی کی۔ آج کا دور ٹکنالوجی کا دور ہے جس میں آن لائن اخبار ورسائل کی کافی اہمیت ہے جس کی وجہ سے لوگ اس طرف راغب ہو رہے ہیں اور وقت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ہم وقت کے ساتھ ساتھ چلیں تو دنیا کی ایجادات اور معلومات سے باخبر رہ سکتے ہیں۔

■

S.T. Noorulla
Ph.D Research Scholar
Dept of Arabic, Persian and Urdu
University of Madras
Chennai - 5 (TN)
Mob.:8008786191

سلطانہ فاطمہ واحدی

اخترمسلمی کا انداز شعر و سخن

کاروانِ اردو غزل کے فن کاروں میں کچھ ایسے پیش رو رہے ہیں جن کے نام اردو ادب میں روزِ اوّل سے روشن ہیں۔ غالب، میر، مومن، ذوق، فیض، فراق، علامہ اقبال جیسے شعرا کی طویل فہرست ہے کہ جنھوں نے اپنی حیات میں ہی شہرت و مقبولیت حاصل کی لیکن ان نامور ستاروں کی کہکشاں میں چند ادیب و شاعر ایسے بھی رہے ہیں کہ جنھیں نہ تو نام کی فکر تھی اور نہ ہی اپنی شہرت کی پرواہ۔ اخترؔ مسلمی ایک ایسے ہی شاعر کا نام ہے جس نے مرکز سے ہٹ کر کہیں دور دیہی علاقے میں رہ کر اردو غزل کی شمع کو جلائے رکھا۔

آ ہی گئے ہو شہرِ سخن میں جو دوستو!
ملتے چلو جو اخترِ رنگیں نوا ملے

(کلیات اخترؔ مسلمی مرتب نعیم احمد ص 33)

اخترؔ مسلمی کا اصل نام عبیداللہ تھا آبائی وطن اعظم گڑھ ضلع پھریہا تھا۔ لیکن ان کے والد نے اسی ضلع کے دوسرے گاؤں مسلم پٹی میں اپنے روزگار درس و تدریس کے انجام دینے کی وجہ سے مستقل سکونت اختیار کرلی تھی۔

اخترؔ مسلمی کی پیدائش یکم جنوری 1928 میں ہوئی ان کی ابتدائی تعلیم مسلم پٹی میں ہوئی۔ انہوں نے وہاں کی مشہور درس گاہ مدرستہ الاصلاح سرائے میر میں داخلہ لے کر اردو فارسی اور متوسطات تک عربی کی تعلیم حاصل کی۔ اور اقبال سہیل مرحوم جیسے قادر الکلام شاعر کی شاگردی اختیار کی۔ والد کے انتقال کے بعد گھر کی مالی پریشانیوں کی وجہ سے درمیان میں ہی تعلیم ترک کرکے پہلے معلمی کا پیشہ اختیار کیا لیکن بعد میں صنعت وتجارت کے پیشے سے وابستہ ہوگئے۔ سرائے میر میں ہی ساری زندگی گذاری اور وہیں 25 جون 1989 میں انتقال کیا۔

قمر اعظمی جو اخترؔ مسلمی کے دوست رہ چکے ہیں اپنے مضمون میں اخترؔ مسلمی کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

’’آنکھوں میں دل پرخوں کی گلابیاں، اضطراب درد سے چہرہ کرن کرن جادو کی طرح بولتا، آبشار کی طرح بجتا، صبا کے دوش پر رنگ ونکہت کا قافلہ لیے کون آرہا ہے ’اخترؔ مسلمی‘ ایک سحر آگیں شخصیت، حُسن کا اداشناس، عشق کا رازداں، غزل کا شہزادہ، دبستان شبلی اور سہیل کا رخشندہ اختر، سرائے میر اور اعظم گڑھ کا بانکا آڑا، ترچھا شاعر جو برابر 1945 سے 1981 تک گیسوئے غزل کو سنوارتا، سجاتا اپنی دھن میں اپنے سے بے خبر، دنیا سے بے نیاز خوب سے خوب تر کی جستجو میں چلا جارہا ہے۔‘‘

(کلیات اخترؔ مسلمی بحوالہ مضمون ’اخترؔ مسلمی اور ان کی شاعری‘ قمر اعظمی کانپور ص 45)

اخترؔ مسلمی نے شاعری کے میدان میں اپنی جگہ خود بنائی انہوں نے کسی کا رنگ اور طرز اختیار کرنے کے بجائے اپنی علیحدہ راہیں تلاش کرکے ہموار کیں۔ وہ جاہ حشمت، شان شوکت کے بجائے فقر و افلاس میں غنی طبیعت رکھنے والے قناعت پسند اور ہر حال میں مطمئن رہنے والے انسان تھے ایک جگہ اپنے فن پر اس طرح ناز کرتے ہوئے ملتے ہیں۔

اخترؔ مسلمی کے پاس ثروت و جاہ گر نہیں
وائے نصیب دشمناں گنج متاع فن تو ہے

ایک دوسری جگہ۔

اخترؔ مسلمی کا نرالا ہے فن
ہے جداگانہ انداز شعر و سخن

اخترؔ مسلمی کے طرز کلام میں سادگی، خلوص، متانت وسنجیدگی پائی جاتی ہے جس میں خود کلامی، خودشناسی بھی

> اختر مسلمی
> نے شاعری کے میدان میں اپنی جگہ
> خود بنائی انہوں نے کسی کا رنگ اور
> طرز اختیار کرنے کے بجائے اپنی علیحدہ راہیں
> تلاش کرکے ہموار کیں. وہ جاہ حشمت، شان شوکت
> کے بجائے فقرو افلاس میں غنی طبیعت رکھنے والے
> قناعت پسند اور ہر حال میں مطمئن
> رہنے والے انسان تھے۔

ہے۔ ان کی شاعری میں عشق کی چاشنی، سوز و گداز کے ساتھ ساتھ غم و انبساط کی بھر پور جھلک ملتی ہے چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں۔

خوشی ہی شرط نہیں لطفِ زندگی کے لیے
متاعِ غم بھی ضروری ہے آدمی کے لیے

(کلیاتِ اختر مسلمی، ص 261)

اختر جنونِ عشق کے ماروں کو دیکھ کر
اہلِ خرد ہنسے ہیں تو رونا پڑا مجھے

(ایضاً، ص 221)

ایک جگہ اپنی شاعری کے بارے میں اس طرح اظہارِ خیال کرتے ہیں۔

میری شاعری کا بانکپن یہ جمالِ شعر و کمالِ فن
سب انہیں کا فیضِ کمال ہے سب انہیں کا عکسِ جمال ہے

(کلیاتِ اختر مسلمی، ص 219)

ان کی شاعری صرف حسن و عشق، گل و بلبل کی داستان کی ترجمان نہیں ہے بلکہ انھوں نے زندگی کے اور دوسرے سنجیدہ مسائل اور حقائق کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔

ان کا دل وطن و قوم کی محبت سے ہمیشہ لبریز رہا ملک میں ہونے والی ناانصافی، نابرابری، زیادتیوں کے خلاف بڑے ہی جرأت مندانہ طریقے سے آواز اٹھائی۔ آزادی کے بعد ہندوستان میں جو فرقہ وارانہ فساد کی آگ بھڑکی جس کا اثر ہر طبقے کے انسانوں پر پڑا ایسے پر آشوب ماحول میں جہاں اخلاقی قدریں دم توڑ رہی تھیں یہ حساس شاعر ہمت ہارنے کے بجائے بہت امنگ و دلیری کے ساتھ اپنی دلی کیفیات کا اظہار اس طرح کرتا ہے۔

ہر شبِ تار خزاں صبحِ بہاراں کردیں
خارِ بے جاں کو بھی رشکِ چمنستاں کردیں
عیش میں اپنے نہ ہو جن کو غریبوں کا خیال
ان کے ہر عیش کا شیرازہ پریشاں کردیں
کرکے باطل کے خداؤں کی خدائی نابود
دوستو! آؤ علاجِ غمِ دوراں کردیں
ظلمتِ شب میں بھٹکتا ہے زمانہ اختر
آؤ ہر ذرے کو خورشید درخشاں کردیں

(کلیاتِ اختر مسلمی، ص 110)

ناطق اعظمی ان کی شاعری کے بارے میں اس طرح تبصرہ کرتے ہیں:

''اختر صاحب مزاج دانِ غزل ہیں تغزل کی روح کے محرم ہیں ان کے تئیں غزل ایک خاص اندازِ بیاں کا نام ہے وہ صرف لب و رخسار، گل و بلبل، قد و گیسو کی بات نہیں کرتے بلکہ زندگی کے تلخ اور ٹھوس حقائق کو بھی غزل میں سمونے کی کامیاب کوشش کرتے ہیں حسن و عشق کی باتیں ہوں یا غم روزگار کا تذکرہ کہیں بھی غزل کی روح کو مجروح نہیں ہونے دیتے۔'' (کلیاتِ اختر مسلمی، ص 273)

ان کی غزلوں میں نغمگی سلاست و روانی اور برجستگی پائی جاتی ہے وہ صرف ہجر و وصال کی ہی باتیں نہیں کرتے بلکہ زندگی اور روزمرہ کے مسائل نشیب و فراز کرب و غم کا ایک حساس اور بیدار شاعر ہونے کی وجہ سے خود تجزیہ کرتے ہیں اور اپنے اطراف کو خود جانچتے پرکھتے ہیں اور پھر ایمانداری سے شعری پیکر میں ڈھال دیتے ہیں۔

لطف ہی کیا حیات کا گر نہ ہو غم کا سلسلہ
ختم نہ ہو خدا کرے رنج و الم کا سلسلہ

(کلیاتِ اختر مسلمی، ص 273)

پروفیسر عنوان چشتی مرحوم نے کلیاتِ اختر مسلمی میں اس شاعر کی اس طرح تعریف و توصیف کی ہے فرماتے ہیں:

''انھوں نے شعری روایات کے شعور میں اپنی ذات کے تخلیقی تجربوں کو آمیز کرکے ایک نیا اور روح پرور شعری منظر نامہ تشکیل دیا ہے۔ شاعر نے اپنے رنگ افشاں جذبات، مجروح تمناؤں اور خون آلودہ خوابوں کو مہذب شعری زبان اور محتاط اندازِ بیاں میں ادا کیا ہے۔ ان کی غزلوں کے چہرے پر اخلاقی اقدار کا نور ہے اور ان کی شاعری کی آنکھوں میں تہذیبی اور سماجی افکار کا سرور ہے انہوں نے اپنے تجربوں کے جمالیاتی مواد کو شاعری کی مہذب زبان میں ایک خاص ادائے احتیاط کے ساتھ پیش کیا ہے۔'' (کلیاتِ اختر مسلمی، ص 1)

29 دسمبر 1969 کو مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں ایک اسلامک اسٹڈیز کانفرنس منعقد کی گئی تھی اس موقع پر اشتیاق احمد راشد صاحب کی فرمائش پر اختر مسلمی نے ایک اصلاحی ترانہ بھی لکھا تھا اور وہ ترانہ اس کانفرنس میں پڑھا گیا تھا۔ اس کا پہلا بند ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے یہ ترانہ آج بھی وہاں پڑھا جاتا ہے۔

یہ ہمارا چمن ہے ہمارا چمن
رحمتِ ایزدی اس پہ سایہ فگن
نورِ شمعِ یقیں زینتِ انجمن
بوئے ایماں ہے پھیلی چمن در چمن
جوئے عرفاں ہے آغوش میں موجزن
یہ ہمارا چمن ہے ہمارا چمن

اختر مسلمی کے تین غزلوں کے مجموعے موجِ نسیم 1961 موجِ صبا 1981 اور جام و سنداں شائع ہو چکے ہیں غزلوں کی زبان سادہ و عام فہم ہے۔ ان کے صاحبزادہ فضل الرحمٰن کی خواہش پر ان کے نواسے فہیم احمد نے ان کے تینوں شعری مجموعے کو یکجا کرکے کلیاتِ اختر مسلمی کے نام سے 2013 میں شائع کیا ہے۔

ان کے کلیات میں زیادہ تر غزلیں ہیں غزلوں کے علاوہ حمد، نعت، قطعات، سہرے اپنی بیٹی جمیلہ کی رخصتی کے علاوہ متفرقات میں کچھ اشعار لکھے ہوئے موجود ہیں۔

■

Sultana Fatima Wahedi
Guest Faculty, Dept of Urdu
Jamia Millia Islamia
New Delhi - 110025

اختر مسلمی کے تین غزلوں کے مجموعے موج نسیم 1961 موج صبا 1981 اور جام و سنداں شائع ہو چکے ہیں غزلوں کی زبان سادہ و عام فہم ہے۔ ان کے صاحبزادہ فضل الرحمن کی خواہش پر ان کے نواسے فہیم احمد نے ان کے تینوں شعری مجموعے کو یکجا کرکے کلیات اختر مسلمی کے نام سے 2013 میں شائع کیا ہے۔

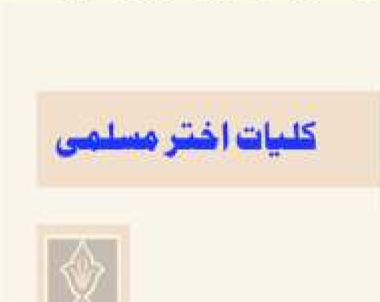

شرافت حسین

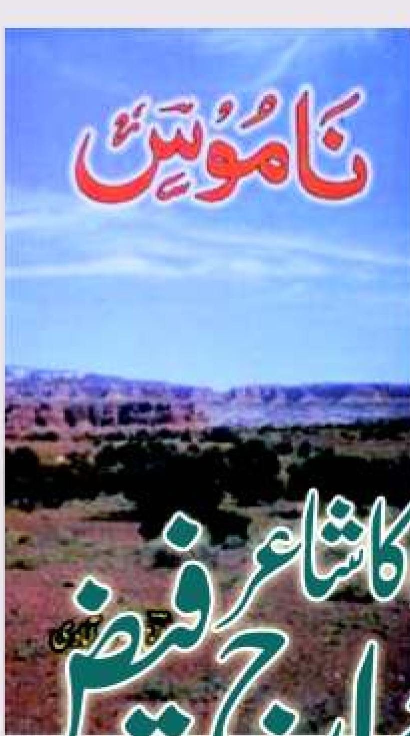

'ناموس' کا شاعر معراج فیض آبادی

معراج فیض آبادی کو میں نے مشاعروں میں دیکھا اور سنا تھا۔ سرسری سی ملاقات بھی ہوئی تھی۔ میرے تعلقات اس وقت گہرے ہوئے جب 2006 میں انھوں نے اپنا شعری مجموعہ 'ناموس' بھیجا۔ میں نے مطالعہ کیا تو لگا یہ صرف مشاعرے کے شاعر نہیں۔ ان کے کلام میں ایک ایسے کردار کی روح جاری و ساری ہے جو زندگی بھر اوبڑ کھابڑ راستے طے کرتا رہا ہے۔ مشاعرے کے سامعین نے انھیں سرآنکھوں پر بٹھایا تھا۔ ان کی عظمتوں کے گیت گاتے تھے لیکن نئی نسل کے سامعین یہ بات جان ہی نہ سکے کہ کوئی معراج فیض آبادی بھی تھا جو مشاعرے لوٹ لیا کرتا تھا۔ ہاں، نصف صدی پیشتر کے سامعین جو باقی ہیں آج بھی ان کے کچھ اشعار پر سر دھنتے ہیں۔

ہماری نفرتوں کی آگ میں سب کچھ نہ جل جائے
کہ اس بستی میں ہم دونوں کو آئندہ بھی رہنا ہے

مجھ کو تھکنے نہیں دیتا یہ ضرورت کا پہاڑ
میرے بچے مجھے بوڑھا نہیں ہونے دیتے

کچھ تو ہم خود ہی نہیں چاہتے شہرت اپنی
اور کچھ لوگ بھی ایسا نہیں ہونے دیتے

معراج فیض آبادی شاعری کی زبان میں معاشرتی اور تہذیبی اصلاح کی صلاحیت رکھتے تھے۔ تجربے کی نمو پذیری کے ساتھ اس کی مناسب لسانی تعمیر و تراش کرتے تھے۔ ان کے یہاں لہجے اور اسلوب کی شائستگی، نفاست اور لچک کے دل پذیر احساس کے ساتھ فنی بصیرت بھی ملتی ہے جو انھیں اپنے ہم عصر مشاعرے کے شعرا سے الگ کرتی ہے۔ ان کے اشعار آج کے منظرناموں سے مماثلت رکھتے ہیں۔

پہلے پاگل بھیڑ میں شعلہ بیانی بیچنا
اور پھر جلتے ہوئے شہروں میں پانی بیچنا

روشنی بانٹتے رہنے کی قسم کھائی تھی
کچھ چراغوں نے مگر آگ لگائی ہے بہت

لگی ہیں صبح پہ پابندیاں کہ اب کے برس
کہاں دکھائی دے سورج کہاں دکھائی نہ دے

یہ بزدلی کی سیاست ہے اس صدی کا کمال
کہ تیر چلتے رہیں اور کماں دکھائی نہ دے

مائیں بچوں کو اب اسکول بھی یوں بھیجتی ہیں
جیسے گھر سے کوئی مقتل کی طرف جاتا ہے

خود الجھ جاتے ہیں ارباب سیاست کے دماغ
مسئلہ جب بھی کسی حل کی طرف جاتا ہے

معراج فیض آبادی حقیقی زندگی کے جانے پہچانے واقعات کی صورت گری میں استعاروں کے سہارے پہلودار جواہر پارے تراشتے ہیں اور فضا کو روشن کرتے ہیں۔ اس طرح سے ان کے وجود کی آگہی صرف مفکرانہ ہوکر نہیں رہ جاتی بلکہ جبلی بھی دکھائی دیتی ہے۔ ان کے یہاں کئی لفظ کلیدی علامتوں کا کام کرتے ہیں۔ جیسے کاسہ، جنگل، جزیرہ، پانی، گاؤں، پاگل، تماشہ، دھواں، الاؤ، آنچ وغیرہ انسانی قدروں کے زوال کا انھیں شدید احساس تھا۔ اس لیے ان کا رنگ سخن کچھ زیادہ ہی تیکھا اور تابناک ہے۔ وہ ایسی صورت حال کو خلق کرنے سے گریز کرتے تھے جو غیر مانوس، ان دیکھی اور پراسرار ہو۔ ان کے عہد کے مشاعروں میں جمالیاتی شاعری کا بول بالا تھا لیکن انھوں نے اپنے سامعین کے ذہن کو نئی سمت کی طرف لے جانے میں کامیابی حاصل کرلی تھی اور انھیں اپنے اشعار سے گرویدہ بنالیا تھا۔

بڑھ گیا تھا پیاس کا احساس دریا دیکھ کر
ہم پلٹ آئے مگر پانی کو پیاسا دیکھ کر

جس کی جتنی حیثیت ہے اس کے نام اتنا خلوص
بھیک دیتے ہیں یہاں کے لوگ کاسہ دیکھ کر

ہم بھی ہیں شاید کسی بھٹکی ہوئی کشتی کے لوگ
چیخنے لگتے ہیں خوابوں میں جزیرہ دیکھ کر

زندہ تھا وہ غریب تو جینے نہیں دیا
جس کی شکستہ قبر سے لپٹے ہوئے ہیں لوگ

آج اک سہمے ہوئے کل کی طرف جاتا ہے
شہر پھر لوٹ کے جنگل کی طرف جاتا ہے

بھیڑ کے جھوٹ سے لڑنے کا جو اعلان کرے
سنگِ الزام اسی پاگل کی طرف جاتا ہے

یہ خوف کی فضا یہ اذیت پسند لوگ
جانے کہاں چلے گئے وہ دردمند لوگ

عمر کی آخری منزل میں معراج فیض آبادی نے مشاعروں میں جانا چھوڑ دیا تھا، ماضی کو سینے سے لگائے جی رہے تھے اور بند آنکھوں سے اپنے اسلاف کے قدموں کے نشاں ڈھونڈھ رہے تھے جس پر چل کر ان کی شخصیت اور فکر کی تشکیل ہوتی تھی۔ خاکساری طبیعت میں اتنی تھی کہ تحریری طور پر لکھا ''میں مانتا ہوں کہ مجھے وراثت میں گونگے الفاظ ملے ہیں جنھیں برتنے کا ہنر مجھے نہیں آتا۔ مگر میں یہ بھی جانتا ہوں کہ شعر کی اصل قدر و قیمت کا تعین عام قاری ہی کرتا ہے کہ اجتماعی پسندیدگی ہی کسی شعر کے زندہ رہنے کی ضمانت ہوتی ہے۔''

معراج فیض آبادی کی نثر بھی اچھی تھی۔ جو 'ناموس' کے ابتدائی پندرہ بیس صفحات پر پھیل کر بطور آپ بیتی ان کے بچپن اور جوانی کی کچھ جھلکیاں پیش کر رہی ہے۔ اس نے مجھے اس قدر متاثر کیا تھا کہ مارچ 2013 کے شمارے میں مستقل کالم 'خودنوشت' میں شریک اشاعت کرلیا تھا۔ میں ان کی نثری زبان پر بات کرنے کے بجائے ان کے اشعار پر گفتگو کرنا ضروری سمجھتا ہوں، جس میں ان کی ذہنی بالیدگی اور شعوری بیداریاں موجود ہیں۔

میں مانتا ہوں کہ مجھے وراثت میں گونگے الفاظ ملے ہیں جنھیں برتنے کا ہنر مجھے نہیں آتا۔ مگر میں یہ بھی جانتا ہوں کہ شعر کی اصل قدر و قیمت کا تعین عام قاری ہی کرتا ہے کہ اجتماعی پسندیدگی ہی کسی شعر کے زندہ رہنے کی ضمانت ہوتی ہے۔

لہجہ لہجہ یہ سلگتے ہوئے ماحول کی آنچ
چیختے ہیں جو مرے لفظ خطا کس کی ہے

میں تو خود اپنی ذات کے صحرا میں کھوگیا
دیوانہ کہہ رہے تھے مجھے ہوشمند لوگ

کل یہی لوگ مرے حلقۂ احباب میں تھے
آج جو دیکھنے نکلے ہیں تماشہ میرا

ہمارے ساتھ سفر کررہا تھا ایک ہجوم
مگر شریکِ سفر کو ترس گئے ہم لوگ

معراج فیض آبادی کی شعری کائنات میں تذبذب، خوف اور محرومی کی فضا ملتی ہے جو غیر معمولی جاذبیت اور تاثیر کی بنا پر قاری کے دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ ان کے کلام میں جمالیات کا گزر بہت کم کم ہے، موجودہ دور کا انتشار، جدید انسان کا عدم تحفظ، بھیڑ میں اکیلے پن کی کیفیت، شعلوں میں گھری سیاست، غیر انسانی قوتوں کی بالادستی، تشدد پرستی، اور سچائی کے اقدار کی پامالی کی مصوری کا اہتمام زیادہ ملتا ہے۔ بلاشبہ ایسی شاعری مدتوں تازہ بہ تازہ رہتی ہے:

ہوشمندوں کی قیادت میں تباہی ہے بہت
رہنمائی کے لیے اب کوئی پاگل بھیج دے

جن کے سینوں میں دہک اٹھے ہیں نفرت کے الاؤ
ان کی خاطر پیار کا تھوڑا سا صندل بھیج دے

دکھ سکھ کی دھوپ چھاؤں سے آگے نکل گئے
آندھی میں ہم ہواؤں سے آگے نکل گئے

دیوار پر سجا تو دیے باغیوں کے سر
اب یہ بھی دیکھ لو پسِ دیوار کون ہے

'ناموس' کی اشاعت کے بعد وہ اپنے قارئین کے ردعمل کا انتظار کرتے رہے۔ آخر موت کے فرشتے نے وقت سے قبل انہیں ہم سے چھین لیا۔ مجھے اس بات کا دکھ ہے کہ ان کی زندگی میں ان کی شاعری پر کچھ نہیں لکھا جاسکا۔

ستم کرو تو ستم کا نشاں دکھائی نہ دے
کچھ ایسے آگ لگاؤ دھواں دکھائی نہ دے

سانس روکے ہوئے چوراہے پہ ٹھہرا ہے سماج
جو بھی رستہ ہے وہ جنگل کی طرف جاتا ہے

یہاں ہر سمت شعلوں کی سیاست رقص کرتی ہے
یتیمی چیختی پھرتی ہے وحشت رقص کرتی ہے

محبت اور یک جہتی کے میٹھے گیت کیا گاؤں
یہاں ہر لفظ میں صدیوں کی نفرت رقص کرتی ہے

غزل کے شاعر معراج فیض آبادی کو شاید بہت پہلے احساس ہوگیا تھا کہ غزل نئے لب ولہجہ کے ساتھ نئے موضوعات اور نئی لسانی تجسیم کاری کا تقاضا کررہی ہے۔ اس کے سحر کو بھی زندہ رکھا جاسکتا ہے جب اسے آسان زبان کے ساتھ حالات کی رفتار سے جوڑا جائے۔ اسی لیے وہ صرف مشاعروں کے ہوکر نہیں رہے بلکہ بالغ نظر قاری کی تشفی کے لیے حقیقی زندگی کے کچھ نئے تجربوں کو بھی متشکل کرتے رہے۔ یہ روش ان کے قد کو بہرحال اونچا کرنے میں معاون رہی اور ملک و بیرون ملک نے ان کی آواز کا خیر مقدم کیا لیکن المیہ یہ رہا کہ ان کی غزلیں رسائل و اخبارات کی دنیا سے دور رہیں جس کے باعث نقادوں کی نظر ان پر نہیں پڑی۔ 'ناموس' کی اشاعت کے بعد وہ اپنے قارئین کے ردعمل کا انتظار کرتے رہے۔ آخر موت کے فرشتے نے وقت سے قبل انھیں ہم سے چھین لیا۔ مجھے اس بات کا دکھ ہے کہ ان کی زندگی میں ان کی شاعری پر کچھ نہیں لکھا جاسکا۔

■

Sharafat Husain
Qazipura, P.O: Tanda
Ambedkar Nagar - 224190
Mob.: 9415910605

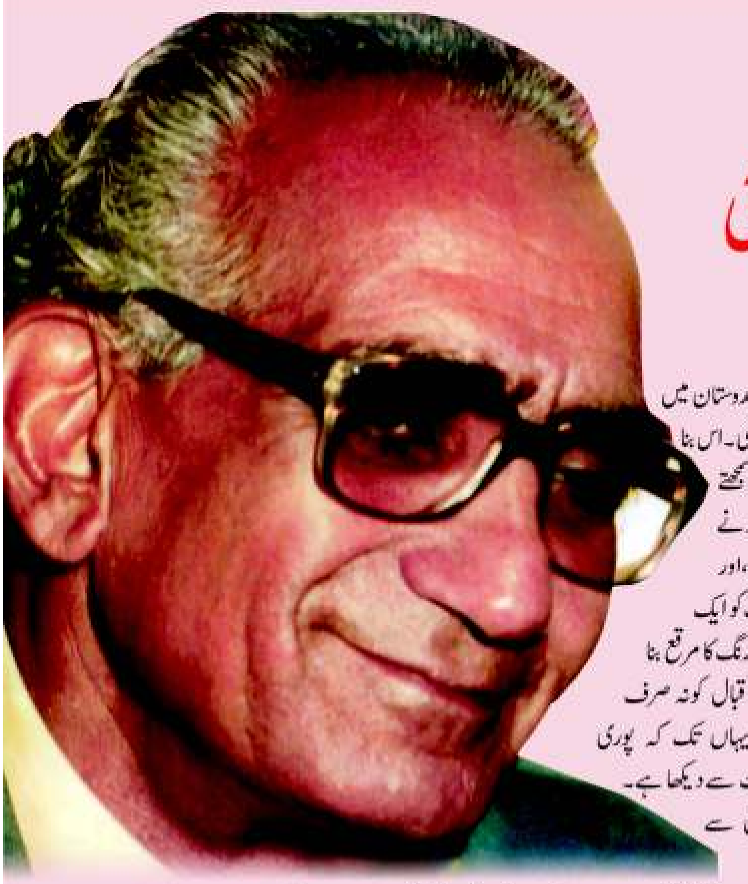

جگن ناتھ آزاد کی تنقید نگاری

رئیس احمد گنائی

شاعری کے ساتھ تنقید جگن ناتھ آزاد (5 دسمبر 1918، 24 جولائی 2004) کی ترجیحات میں شروع سے ہی شامل رہی ہے۔ ادب کے تنقیدی شعبے میں آزاد نے جہاں اہم اور قابل مطالعہ نگارشات ترتیب دی ہیں اقبال شناسی کے قابل قدر نمونوں کے ذریعے ادب کے سنجیدہ حلقے کو متاثر کیا۔ انھوں نے کسی خاص موضوع پر باقاعدہ کوئی کتاب نہیں لکھی اور نہ ہی کسی خاص تنقیدی رویے اور رجحان کی پاسداری کی۔ انھوں نے مختلف النوع قسم کے ادبی و علمی مضامین لکھے۔ ان کے یہی مضامین کتابی صورت میں شائع ہوئے ہیں۔ آزاد کے ان تنقیدی مجموعوں کی تعداد چار ہے۔ (1) اقبال اور اس کا عہد (2) نشانِ منزل (3) تعمیر فکر (4) فکر و فن۔ پہلی دو کتابیں بہت پہلے ہی شائع ہوئی تھیں جبکہ اخیر کے دو مجموعے ان کی وفات کے ایک سال پہلے یعنی 2003 میں شائع ہوئے۔ یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ آزاد کی اقبال شناسی ان کی تنقید سے الگ نہیں۔ اقبال شناسی کے ذریعے ہی انھوں نے اپنے تنقیدی افکار کو معروضی انداز میں پیش کیا ہے۔ مذکورہ چار تنقیدی تصانیف کے مطالعے سے آزاد کی ناقدانہ بصیرت وصلاحیت کے ساتھ وسعت مطالعہ اور تحقیقی تجسس کا اندازہ ہوتا ہے۔ نیاز فتح پوری نے 'اقبال اور اس کا عہد' کے تعلق سے جو بات کہی ہے وہ آج بھی آزاد پر صادق آتی ہے، کہ جگن ناتھ آزاد نہ صرف شاعر بلکہ نقاد کی حیثیت سے بھی اپنا خاص مقام رکھتے ہیں۔

'اقبال اور اس کا عہد' آزاد کے تنقیدی مقالات کا پہلا مجموعہ ہے جو 1960 میں پہلی بار شائع ہوا۔ یہ کتاب ان توسیعی لکچروں کا مجموعہ ہے جو آزاد نے 1955 میں اقبال کی شاعری کے متعلق جموں و کشمیر یونیورسٹی (موجودہ کشمیر یونیورسٹی) کی دعوت پر پیش کیے۔ اس کتاب میں تین مقالے ہیں۔ (1) شعر اقبال کا ہندوستانی پس منظر (2) اقبال کے کلام کا صوفیانہ لب ولہجہ (3) اقبال اور اس کا عہد۔ مذکورہ بالا تینوں مقالے اقبالیات کے تعلق سے کافی اہم ہیں۔ پہلے مقالے یعنی 'اقبال کی شاعری کا ہندوستانی پس منظر' کا مقصد اقبال کی عالمگیریت و آفاقیت ثابت کرنا ہے۔ جس دور میں یہ مضمون لکھا گیا ہے، اُس دور میں اقبال کی ہمہ گیر شخصیت پر پردہ ڈال دیا گیا تھا اور اقبال کو ایک خاص خطے، خاص فرقے کا شاعر قرار دیا جاتا تھا، خاص کر تقسیم ہند کے بعد ہندوستان میں اقبال کی قدر و قیمت کم ہوگئی تھی۔ اس بنا پر آزاد نے وقت کی ضرورت کو سمجھتے ہوئے اس غلط فہمی کو دور کرنے کی بامعنی کوشش کی، اور انھوں نے اقبال کی شخصیت کو ایک جلوۂ صد رنگ بلکہ جلوۂ ہزار رنگ کا مرقع بنا کر پیش کیا۔ آزاد نے اقبال کو نہ صرف پاکستان بلکہ ہندوستان، یہاں تک کہ پوری انسانیت کے شاعر کی حیثیت سے دیکھا ہے۔ اقبال کی شخصیت کے تعلق سے آزاد یوں لکھتے ہیں:

''اقبال کے ملکی نظریات کے متعلق سب سے بڑی غلط فہمی کی بنیاد صرف یہ ہے، کہ اقبال کی شخصیت کا جائزہ لیتے وقت ہمیشہ ہم اپنے خود ساختہ پیمانوں سے کام لیتے ہیں۔'' (ص 15)

آزاد مزید لکھتے ہیں کہ:

''حالانکہ اگر معترضین اقبال کا ذکر اوروں کی زبانی سننے کے عوض خود اقبال کے کلام کی جانب رجوع کرتے تو یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اس عنصر کی تجلیاں جسے ہم قومی پس منظر کے نام سے منسوب کرتے ہیں۔ کلام اقبال کے صفحات پر قدم قدم پر بکھری ہوئی ہیں۔'' (ص 15)

اس مقالے میں آزاد نے طرح طرح کی دلیلوں اور مثالوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ اقبال کی شاعری میں ہندوستان کی روح اور تہذیب نظر آتی ہے۔ کتاب میں شامل دوسرا مقالہ 'اقبال کے کلام کا صوفیانہ لب ولہجہ' ہے۔ اس مقالے میں آزاد نے خطوط سے طویل اقتباسات اور اشعار نقل کیے ہیں، جو اقبال کے نظریہ تصوف سے متعلق کافی کارآمد ہیں۔ ان اقتباسات اور اشعار سے آزاد نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اقبال تصوف کے خلاف نہیں تھے بلکہ اُس تصوف کے خلاف تھے، جسے انھوں نے غیر اسلامی تصوف سے تعبیر کیا ہے اور غیر اسلامی تصوف سے اقبال کی مراد ترک عمل کا فلسفہ ہے۔ آزاد نے ایک اہم پہلو کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ 1910 سے 1922 تک کے عرصے میں اقبال نے تصوف کے سلسلے میں خاموشی اختیار کی اور 1922 کے بعد جب دوبارہ اس موضوع کی جانب واپس لوٹے تو فلسفہ وحدت الوجود کے زیر اثر کافی کچھ لکھا۔ آزاد نے اقبال کے تصوف کے تعلق سے بہت سی باتیں پیش کی ہیں۔ جن سے اقبال کی شاعری میں تصوف کی حقیقت و کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں آزاد نے یوں نشاندہی کی ہے۔

''اقبال نے تصوف میں زندہ و پائندہ عناصر چن چن کر اسلام کو واپس لوٹائے۔ اسلامی اور غیر اسلامی تصوف میں واضح لکیر کھینچی اور اسلام اور بنی نوع انسان کی ایک بہت بڑی خدمت انجام دی۔ ورنہ اگر اقبال تصوف کے مخالف ہوتے تو رومی کو اپنا مرشد مانتے؟ شمس تبریزی کے اشعار 'اسرار خودی' کے پہلے ورق کی زینت بناتے اور مثنوی کی ابتدا نظیری کے شعر سے کرتے۔'' (ص 72)

'اقبال اور اس کا عہد' ایک اہم مقالہ ہے جو کتاب کا عنوان بھی ہے اور جس میں آزاد نے مختلف مثالوں کے ذریعے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ اقبال اپنے عہد، اپنے ماحول سے متاثر بھی ہوئے ہیں۔ ساتھ ہی اپنے عہد اور ماحول کو بھی بڑی حد تک متاثر کیا ہے۔ انھوں نے اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اقبال نے اپنے عہد اور اپنے پیش رووں کی اندھی تقلید نہیں کی بلکہ اپنے لیے ایک نیا جہانِ معنی پیدا کیا۔ 'اقبال اور اس کا عہد' آزاد کی اقبال شناسی کے ضمن میں ایک اہم کتاب کا درجہ رکھتی ہے، جس میں آزاد نے مختلف پہلوؤں پر تشفی بخش گفتگو کی ہے۔ یہ مقالے تحقیق و تجسس سے پُر ہیں۔

'نشان منزل' آزاد کے تنقیدی مقالات کا دوسرا مجموعہ ہے، جو 1982 میں پہلی بار شائع ہوا۔ اس مجموعے میں چودہ مقالات اور نو ریڈیائی نشریات شامل ہیں۔ مجموعے کے اہم مقالات میں حسرت موہانی اور اقبال، ہندوستان کے تہذیبی عناصر اور اردو، جوش ملیح آبادی کی دو نظمیں، جوہر لعل نہرو کا ادبی مرتبہ، ترقی پسند شاعری، فرحت کی رامائن، جدید اردو شاعری، ہندوستان میں اردو کا مسئلہ آزادی کے بعد، عالمی معیار اور اردو، وغیرہ کے علاوہ ادب اور ادبی تخلیق، انشا پردازی، فکر و جذبہ وغیرہ ریڈیائی نشریات قابل ذکر ہیں۔

'نشان منزل' میں شامل مضامین کے تنوع سے آزاد کے وسعت مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس مجموعے میں اقبال کا ذکر کسی حد تک کم ہے۔ مگر کتاب کے نام میں اقبال کی پسند کا ہی دخل ہے اور وہ اس طرح کہ اقبال نے اپنی کتاب 'ضرب کلیم' کا نام پہلے 'نشان منزل' ہی تجویز کیا تھا۔ مجموعے کا پہلا مضمون 'حسرت موہانی اور اقبال' ہے، جس میں آزاد نے ان دونوں کے متضاد نظریات اور تصورات مثلاً تصوف، فلسفہ عشق، اور نظریہ اشتراکیت کے متعلق تقابلی جائزہ پیش کیا ہے۔ آزاد نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اقبال کے یہاں تصوف کا ایک مکمل اور مثبت اظہار ملتا ہے، جبکہ حسرت کے یہاں فلسفہ تصوف یا نظریہ تصوف مربوط شکل میں موجود نہیں ہے۔ آزاد نے مختلف مثالوں کے ذریعے اس بات کو نمایاں کیا ہے کہ حسرت کے یہاں تصوف روایتی انداز سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ آزاد نے اقبال اور حسرت کے مابین چند مشترک پہلوؤں کی بھی وضاحت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اقبال کے یہاں اشتراکیت کی لے خاصی مدھم رہی، جبکہ حسرت کے یہاں یہ لے بہت بلند تھی۔ عشق اقبال اور حسرت دونوں کے یہاں متحرک اور فعال کیفیت کے طور پر نظر آتا ہے۔ دونوں کے یہاں عشق جذبات میں عمل تطہیر کے لیے ضروری ہے۔ اس مجموعے میں شامل اقبال سے متعلق ایک اور مضمون 'اقبال صرف مسلمانوں کے شاعر؟' ہے۔ اس استفہامیہ عنوان کے تحت آزاد نے دو سوالات قائم کیے ہیں۔ ایک یہ کہ اقبال کا بنیادی سرچشمہ افکار کیا ہے، اور دوسرا 'اقبال کے مخاطب کون ہیں۔ آزاد نے ان سوالوں کے جواب میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اقبال کے سرچشمۂ افکار میں قران و حدیث کے علاوہ قدیم ہندوستانی فلسفہ، مغربی فلسفہ، مارکس، اینگلز کا جدلیاتی نظام فکر بھی شامل ہیں۔ اسی طرح آزاد نے تحقیقی انداز میں اقبال کے اشعار سے یہ ثابت کیا، کہ اقبال کی شاعری کسی ایک خطے یا کسی ایک قوم کے لیے نہیں ہے۔ اقبال کی شاعری مسلمانوں کے لیے ہی نہیں بلکہ پوری عالم انسانیت کے لیے بھی ہے۔ 'غالب اور اقبال' کے عنوان سے دوسرے مضمون میں آزاد لکھتے ہیں کہ ہندوستان میں کوئی دو اردو اور فارسی شاعروں میں شاید اتنی مماثلت ہو جتنی غالب اور اقبال میں ہے۔ آزاد مزید لکھتے ہیں کہ غالب جس ادبی، سماجی سلسلے کی پہلی کڑی ہیں، اقبال اس کی دوسری کڑی ہے۔ ان دونوں میں قرب زیادہ اور بُعد کم۔

'نشان منزل' میں کچھ مقالات اردو زبان سے متعلق بھی ہیں۔ آزاد کو زبان اردو سے بہت عقیدت تھی۔ انھوں نے ہر قدم پر اردو کی ششش جہات فروغ اور ترویج و اشاعت کی کوشش کی۔ اردو زبان کے تعلق سے اس کتاب میں تین مزید مضامین: ہندوستانی عناصر اور اردو، ہندوستان میں اردو کا مسئلہ آزادی کے بعد، عالمی معیار اردو شامل ہیں۔ ان مقالات کے توسط سے آزاد نے مختلف مثالوں کے ذریعے اس حقیقت کو اجاگر کیا ہے کہ اردو ہندوستانی تہذیب وتمدن کی زبان ہے، اور اردو کو ہندوستان کی ریت و روایت میں ہر وقت اپنا جائز مقام ملنا چاہیے۔ آزاد کا یہ عقیدہ تھا کہ اردو ہندوستان کی زبان ہے، ہندوستان کی تہذیبی و ثقافتی رنگارنگی کی آئینہ دار ہے۔ جس میں ہندو، مسلمان، سکھ سبھی شامل ہیں۔ آزاد نے غیر مسلم شعرا و ادبا کے حوالے سے یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی کہ کس طرح ان ادبا و شعرا نے بلا کسی تفریق کے اردو زبان و ادب کو اپنا وسیلہ اظہار وابلاغ بنا کر اردو کی بنیادوں کو مستحکم کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ آزاد اس بات سے انکار کرتے ہیں کہ اردو صرف اور صرف مسلمانوں کی زبان ہے۔ اردو کو ہندوستان کی مشترکہ وراثت قرار دینے کے سلسلے میں آزاد لکھتے ہیں:

''اس میں (اردو) ہر مکتب فکر اور ہر عقیدہ سما سکتا ہے۔ یہ ہندوستانی معاشرے کی ایک جامع اور مکمل تصویر ہے۔ یہ سرزمین وطن کا ایک ایسا نگارخانہ ہے۔ جس میں تہذیب کے لاتعداد پہلو جگمگا رہے ہیں۔ یہ ہمارے ملک کی تاریخ کا ایک تسلسل ہے اور اس تسلسل میں ایک روح جاری و ساری ہے۔ اور وہ ہے، وحدت ہند کی روح۔'' (ص 29)

آزاد اردو کے تسلسل اور روشن مستقبل کے لیے پُرامید ہیں، اور اردو کے عالمی معیار پر فخر کرتے ہوئے غالب، پریم چند، اقبال، انیس اور دبیر جیسے ادیبوں اور ان کی نگارشات کو عالمی معیار کے ادبی نمونوں کے ہم پلہ قرار دیتے ہیں۔

'ترقی پسند شاعری' اور 'جدید اردو شاعری' کے عنوان سے دو مضامین ان کے تنقیدی مجموعے 'نشان منزل' میں شامل ہیں۔ جن کے مطالعے سے آزاد کی علمی و ادبی استعداد کا اندازہ ہوتا ہے۔ آزاد کے نزدیک ترقی پسند ادب یا ترقی پسند شاعری وہ شاعری نہیں، جو 1936 کی ترقی پسند تحریک کے زیر اثر لکھی گئی۔ بلکہ ترقی پسند شاعری سے مراد وہ شاعری ہے جس کی داغ بیل ملک کے ایسے انقلاب سے پڑی جس نے نہ صرف پرانے سیاسی اور معاشی نظام کی بنیادیں ہلا ڈالیں بلکہ ایک نئے انداز فکر کا پتہ بھی دیا، اور وہ انقلاب 1857 کی جنگ آزادی ہے۔

یقینی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ 1857 کے بعد اردو شعر وادب روایتی اور سطحی معاملات سے ہٹ کر نئی عصری حقیقتوں اور وقتی مسائل و تجربوں سے آشنا ہوا۔ آزاد کے نزدیک یہی ترقی پسندی، سرسید، اکبرالٰہ آبادی اور اقبال کے یہاں بھی نمایاں طور پر نظر آرہی ہے۔ مذکورہ مضمون سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ جگن ناتھ آزاد کا ترقی پسند تحریک سے رشتہ کس حد تک تھا۔ آزاد کو ترقی پسند تحریک کا فعال رکن نہیں کہا جا سکتا۔ آزاد کی نثر کے علاوہ شاعری میں بھی ترقی پسند تحریک سے علیحدگی کے جواز نظر آتے ہیں۔ اسی نوعیت کے دوسرے مضمون 'جدید اردو شاعری' میں آزاد کم و بیش ایسے ہی تاثرات پیش کرتے ہیں۔ جدید اردو شاعری کے تعلق سے یوں لکھتے ہیں:

''بنیادی طور پر نئی شاعری ہر اُس موزوں کلام کو کہا جا سکتا ہے، جس میں وقتی ہنگامی اور عارضی اثر سے ہٹ کر کسی بات کو محسوس کرنے، سوچنے اور بیان کرنے کا نیا انداز موجود ہو۔ یعنی کوئی شاعر فرسودہ قسم کے روایتی بندھنوں سے الگ رہ کر کسی احساس، جذبے یا خیال کے اظہار میں اپنی انفرادیت کو نمایاں کرتا ہے، تو وہ نیا شاعر ہے اور اس کی شاعری نئی شاعری ہے اور جس دور میں یہ خوبی بدرجہ اتم موجود ہو وہ یقیناً شاعری کا نیا دور کہلایا جا سکتا ہے۔'' (ص 161)

'نشان منزل' کے دوسرے مضامین میں بھی آزاد نے اچھی بحث کی ہے۔ ان مضامین میں 'رام لعل کا فن'، 'فرحت کی رامائن'، 'خورشید احمد جامی'، 'امر سنگھ منصور' وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔ آزاد نے رام لعل کے افسانوں پر بحث کرتے ہوئے انھیں پریم چند اسکول کی افسانہ نگاری اور جدید افسانہ نگاری کے درمیاں رابطے کی کڑی قرار دیا ہے۔ 'جواہر لعل نہرو کا ادبی مرتبہ' میں آزاد نے نہرو کی ادبی حیثیت ان کے وصیت نامہ اور دیگر کتابوں کے حوالے سے گفتگو کی ہے۔ 'نشان منزل' کے مضامین میں آزاد نے مختلف النوع پہلوؤں پر بحث کی ہے۔ کتاب کے دوسرے حصے میں نشریات شامل ہیں۔ یہ تمام نشریات ریڈیو کشمیر سرینگر اور جموں ریڈیو سے وقتاً فوقتاً نشر ہوئے ہیں، جو ادبی وعلمی اہمیت و افادیت کے حامل ہیں۔ مجموعی طور پر 'نشان منزل' آزاد کی تنقیدی صلاحیت وادب شناسی کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔

’نشانِ منزل‘ کے بعد بہت عرصے تک تنقیدی شعبے میں آزاد کی کوئی کتاب نہیں آئی۔ حالانکہ اقبالیات پر ان کی کتابیں برابر شائع ہوتی رہیں۔ تنقیدی مقالات پر مبنی آزاد کی دو کتابیں 2003 میں شائع ہوئیں۔ ایک ’تعبیرِ فکر‘ اور دوسری ’فکر و فن‘۔ ’تعبیرِ فکر‘ میں شامل مضامین چار حصوں پر مشتمل ہیں، پہلا حصہ اقبالیات، دوسرا حصہ تنقید و تحقیق، تیسرا حصہ کچھ شاعری کچھ نثر، چوتھا حصہ اردو کے تعلق سے ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے اقبال سے متعلق اپنی تنقیدی مہارت کے نمونے پیش کیے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ دوسرے ادبی و علمی امور پر بھی اپنی آرا و محسوسات سے ہمیں نوازا ہے۔ خاص کر ابھرتے قلم کاروں کے تئیں مثبت اور پُر امید رائے ظاہر کی ہے۔

’تعبیرِ فکر‘ میں اقبال پر لکھے چند مضامین کے علاوہ اقبال سے متعلق دوسری کتابوں پر تبصرے بھی شامل ہیں۔ اس حصے کا پہلا مقالہ ’اقبال کی غزل کا ابتدائی دور‘ ہے۔ یہ مقالہ کافی حد تک تحقیقی نوعیت کا ہے۔ اس مضمون میں اقبال کی اردو غزل زیرِ بحث آئی ہے۔ اور اس تعلق سے بات ’بانگِ درا‘ سے شروع ہوتی ہے۔ اقبال کے اردو کے پہلے مجموعۂ کلام ’بانگِ درا‘ کو زمانی اعتبار سے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے، لیکن آزاد اس تقسیم سے مطمئن نظر نہیں آتے۔ آزاد لکھتے ہیں:

”حالانکہ اقبال نے اپنے کلام کی جو تقسیم کی تھی، وہ محض تاریخ وار تقسیم تھی، اور پھر اسے تین حصوں میں تقسیم کرتے وقت اقبال نے اپنے سارے کلام کو پیشِ نظر نہیں رکھا تھا۔ جس پر ایک نظر ڈالے بغیر ان کے شاعرانہ ارتقا کا مطالعہ ممکن نہیں۔ مثلاً 1901 سے پہلے کا کلام خواہ وہ نظم ہے خواہ غزل، اقبال نے بڑی حد تک نظر انداز کر دیا۔“ (ص 15)

اس مضمون میں آزاد نے نہایت ہی باریک بینی اور محققانہ انداز میں اقبال کے ابتدائی دور کی غزلوں کا ارتقائی محاکمہ کر کے اقبال کی غزلوں کو تین حصوں کے برعکس چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ آزاد لکھتے ہیں کہ جس طرح غزل کے پہلے دور کے خاتمے سے قبل اقبال کے دوسرے دور کی غزل شروع ہوتی ہے، اسی طرح دوسرے دور کے خاتمے سے پہلے تیسرے دور کی غزل شروع ہو گئی۔ آزاد کے نزدیک اقبال کی غزل کا تیسرا دور 8-1907 تک جاری رہتا ہے۔ اس تیسرے دور کے آتے آتے اقبال داغ کے اثرات سے آزاد ہو چکے تھے۔ بقول آزاد اقبال کی غزل کا چوتھا دور اس غزل سے شروع ہوتا ہے۔

نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

اقبال کے تعلق سے اس حصے کے دوسرے مضامین اور تبصرے بھی خاصی اہمیت کے حامل ہیں، جن سے آزاد کی اقبال شناسی اور مطالعاتِ اقبال کا اندازہ ہوتا ہے۔

زیرِ نظر کتاب کے دوسرے حصے یعنی ’تنقید و تحقیق‘ کے تحت آزاد نے حالی، مولانا آزاد، مجروح، جمیل مظہری، خلیق انجم، کشمیری لال ذاکر وغیرہ کی شخصیت اور فن کے مختلف پہلوؤں پر بڑے سلیقے سے اظہارِ خیال کیا ہے۔ مجروح کی غزل سے متعلق مقالہ بے حد اہم ہے، جس میں آزاد نے مجروح سلطانپوری کی غزل گوئی کا محاسبہ پیش کر کے مجروح کو ایک نمایاں اور ہمہ گیر شاعر قرار دیا ہے۔ بقول آزاد مجروح کی غزل میں تاثیر کی ہمہ گیریت ہے۔ ان کی غزل میں ہیئت اور موضوع آپس میں ہم آہنگ ہو گئے ہیں۔ اور ان کی غزل، غزل کے آداب سے عبارت ہے۔ زیرِ نظر کتاب کے تیسرے حصے ’کچھ شاعری کچھ نثر‘ میں شامل مضامین، تبصروں پر مبنی ہیں۔ آزاد نے دوستوں و احباب سے موصول شدہ کتابوں پر تبصرہ کر کے ان کے معائب و محاسن کی نشاندہی کرا کے انھیں ادبی حلقوں سے روشناس کیا ہے۔ بہر حال ان تبصروں میں آزاد کا جذبۂ خلوص شامل ہے۔

’فکر و فن‘ آزاد کی تنقید و تحقیق کے زمرے میں آنے والی ایک اور قابلِ قدر اور لائقِ مطالعہ کتاب ہے۔ دلچسپ ادبی مقالات اور تبصروں پر مبنی یہ کتاب 2003 میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں آزاد کا خاص محور اقبال ہی رہا ہے اور شروع کے سات مقالات اقبال سے متعلق ہیں۔ پہلے مقالے کا عنوان ’اقبال اور عطیہ فیضی‘ ہے، جس میں آزاد نے جگہ جگہ پر مختلف خطوط کے اقتباسات نقل کیے ہیں۔ اپنے موضوع کے حوالے سے یہ مقالہ بڑا اہم ہے۔ جس میں اقبال اور عطیہ فیضی کے درمیان وابستگی اور قربت اور ملاقات و رسم و راہ سے متعلق کافی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ اقبالیات کے تعلق سے دوسرا مقالہ ’1905 تک اقبال کی بعض نظمیں اور متروک اشعار‘ ہے۔ جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں آزاد نے اقبال کے ایسے کلام کا ذکر کیا ہے، جو اقبال نے اپنے کلام سے نکال دیا ہے۔ اس نوعیت کے مضامین کی بدولت اقبال کے تنقیدی ذہن کا اندازہ ہوتا ہے۔

غالب کے تعلق سے مضمون ’غالب نظرے خوش گزرے‘ میں آزاد نے غالب کی شاعری کے محاسن گنائے ہیں، اور غالب کو اعلیٰ فکر اور موثر جذبے کا شاعر قرار دیا ہے۔ فراق گورکھپوری کے تعلق سے مضمون ’کچھ فراق کے بارے میں‘ میں آزاد نے فراق اور ان کی شاعری پر بھرپور گفتگو کی ہے۔ آزاد نے فراق کے تعلق سے دو متضاد گروہوں کا محاسبہ کیا ہے۔ ایک طرف وہ قاری ہیں جو فراق کو اچھا تو کیا معمولی شاعر ماننے کو بھی تیار نہیں، اور دوسری طرف ان کے وہ مداح ہیں، جو انھیں غالب اور میر کے پائے کا شاعر قرار دیتے ہیں۔ آزاد نے پہلے گروہ کے لوگوں کو یہ کہہ کر نظر انداز کیا ہے، کہ دنیا میں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں، جو اقبال اور غالب کو بھی شاعر تسلیم نہیں کرتے۔ دوسرے طبقے نے فراق کی اہمیت تسلیم کی تو اس کے پیچھے صحیح معنوں میں فراق کی دانشورانہ فہم تھی جس کی بنا پر ان کا قد دوسرے شعرا سے ممتاز دکھائی دیتا ہے۔ آزاد نے فراق سے اپنے گہرے مراسم کا ذکر کرتے ہوئے کئی یادگار واقعات نقل کیے ہیں، جن سے فراق کی شخصی انفرادیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ آزاد نے بیباکی کا اظہار کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا ہے کہ فراق اپنی تشہیر کے سلسلے میں دوسروں سے کہیں زیادہ فعال اور سرگرم تھے۔ آزاد کو فراق کی فنکاری اور پختہ شاعر ہونے کا اعتراف تھا لیکن وہ تنقید کا حق ادا کرنے میں بھی ہمیشہ محتاط رہا کرتے تھے۔ فراق کے ساتھ آزاد نے اپنے دیگر ہمعصروں مثلاً سردار جعفری اور کیفی اعظمی کی شاعری پر بھی قلم اٹھایا اور بہت حد تک تنقید کا حق ادا کر دیا۔ اپنے ہمعصروں پر اظہارِ خیال کی گنجائش لوگ کم ہی نکال پاتے ہیں، لیکن آزاد نے چھ سات دہائیوں قبل ہی اس روایت کو مسترد کرنے کی کامیاب کوشش کی تھی اور کئی ہمعصروں پر اہم مضامین قلمبند کیے تھے۔ آزاد نے مختلف کتابوں پر اپنے تبصراتی مضامین کے ذریعے بھی اپنے تنقیدی موقف کو بڑے سلیقے سے واضح کر دیا ہے، جن میں ایک طرف کتابوں کی خوبیاں ظاہر ہوتی ہیں تو دوسری طرف ان کی خامیوں کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔ تبصراتی نوعیت کے مضامین میں آزاد نے معمر ادیبوں کے ساتھ نئے قلم کاروں کی بھی حوصلہ افزائی کی ہے۔ مجموعی طور پر اس کے ذریعے آزاد کی ادب فہمی کا ایک بہتر تاثر سامنے آتا ہے۔

جگن ناتھ آزاد کے مختلف تنقیدی مضامین ایک دانشور شاعر کے متحرک ذہن کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ادب کے تئیں ان کا ایک سنجیدہ اور واضح نظریہ ہے جس کی پاسداری وہ اپنے مضامین میں کامیابی سے کرتے ہیں۔ وہ ایک سلجھے ہوئے نقاد کے طور پر ہمارے سامنے آتے ہیں جن کے تنقیدی افکار میں کوئی بُعد اور پیچیدگی نہیں ہے۔ بلاشبہ ان کی بنیادی شناخت ایک تخلیق کار کی ہے، لیکن تنقید اور تحقیق سے والہانہ وابستگی انھیں ایک بالغ نظر فن کار کی صف میں شامل کر دیتی ہے۔

■

Rayies Ahmad Ginai
Research Scholar, Dept of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligar - 202001 (UP)

مظہر حسنین

انفارمیشن ٹکنالوجی وسائنس کی حیرت انگیزیاں

دور حاضر میں انفارمیشن ٹکنالوجی کی بے بہا ترقی نے انسانی زندگی میں بہت سی آسانیاں فراہم کردی ہیں اور اس کی بدولت معلومات کو قابو کرنا بہت آسان ہوگیا ہے۔ کمپیوٹر کا استعمال کرنے والا براہ راست کمپیوٹر کی مدد سے اپنی من پسند معلومات بہت کم وقت میں تلاش کرلیتا ہے۔ آج زندگی کے تمام شعبوں میں ٹکنالوجی کا استعمال کیا جارہا ہے۔ یا یوں کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ انسان کا پورا انحصار اب ٹکنالوجی پر ہوگیا ہے۔ اس کے استعمال نے چیزوں کی ہیئت بدل کر رکھ دی ہے۔ وہ معلومات جو کاغذ پر تحریری شکل میں ہوتی تھی اب وہی معلومات برقی میڈیا پر آنے لگی ہے۔ انفارمیشن ٹکنالوجی حقیقت میں دو جملوں کے یکجا ہونے کا مجموعہ ہے۔ انفارمیشن اور ٹکنالوجی جس کا مطلب یہ ہے کہ تمام معلومات کو حاصل کرنے، اس کو ترتیب دینے اور محفوظ کرنے سے لے کر فراہم کرنے تک ٹکنالوجی کا استعمال کیا جائے۔ انفارمیشن ٹکنالوجی کی ایجاد دراصل کمپیوٹر کے عہد کی اصطلاح ہے۔

اطلاعاتی ومواصلاتی تکنیک روز افزوں انسانی زندگی پر اثر انداز ہورہی ہے۔ یا یوں کہا جائے تو بے جانہ ہوگا کہ اس کی حد درجہ دخل اندازی انسانی قدروں کو متاثر کررہی ہے۔ کمپیوٹر وموبائل انٹرنیٹ ٹکنالوجی نے انسانی زندگی میں تلاطم مچا رکھا ہے۔ برقی لہروں کے ہچکولے انسان کو اطلاعات کے جھولے جھلا رہے ہیں۔ بہت سارے لوگ اس کی دلفریبی کے باعث اس کی قربت حاصل کررہے ہیں۔ جبکہ بہت سارے لوگ اس جادوئی دنیا سے خوفزدہ ہیں اور اپنی لاعلمی کی بنیاد پر اس کے قریب آنے سے کترا رہے ہیں۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کی اسراریت کو فاش کرنے کے لیے اس کے قریب جانا ہوگا۔ اس سے رشتے استوار کرنے ہوں گے۔ جیسا کہ معین احسن جذبی نے کہا تھا

اے موج بلا ان کو بھی ذرا دو چار تھپیڑے ہلکے سے
کچھ لوگ ابھی تک ساحل سے طوفان کا نظارہ کرتے ہیں

جذبی کا یہ شعر بہت موزوں ہے اطلاعاتی ومواصلاتی انقلاب کے حوالے سے کیونکہ آئندہ پانچ برس میں دنیا بھر میں انٹرنیٹ سے منسلک آلات کی تعداد 50 ارب تک پہنچ جائے گی۔ کیا گھریلو برتن، دروازے اور یہاں تک کہ گملے میں نصب پودے بات کرسکتے ہیں۔ اگر نہیں تو ذرا مستقبل قریب کا یہ منظر نامہ ملاحظہ فرمائیے:

ایک صبح دروازے پر دستک ہوتی ہے آپ دروازے تک جاتے ہیں تو وہاں موجود بیکری والا کہتا ہے کہ مجھے آپ کے فریج نے بلایا ہے اور انڈے ختم ہونے پر اس نے ہمیں ایک میسج دیا ہے۔ تھوڑی دیر بعد آپ کے فون پر ایک ٹیکسٹ نمودار ہوتا ہے جس میں گلاب کا پودا پیاس کے مارے چیخ رہا ہے۔ کمرے میں آکر آپ جیسے ہی کافی ختم کرتے ہیں تو کپ پر ایک پیغام نمودار ہوتا ہے کہ آپ تھوڑی اور کافی پینا پسند کریں گے؟

یہ کسی سائنس فکشن فلم کا منظر نہیں بلکہ ان میں سے تقریباً تمام اشیاء اب حقیقت کا روپ اختیار کرچکی ہیں۔ انھیں 'انٹرنیٹ آف تھنگس' یا اشیائے انٹرنیٹ کا نام دیا گیا ہے۔

تعلیم کا حصول اور انسانی قدروں کا فروغ معاشرے کی بنیادی ضرورت ہے اور علم کے فروغ کی بدولت ہی ایک بہتر اور مہذب معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔ آج کا دور بڑا عجیب سا دور ہے جہاں ہر طرف نفسا نفسی کا عالم ہے۔ لوگ فطرتاً علم پرور نہیں رہے اور عام طور پر اپنے علم اور تجربات کو بھی عوام کے ساتھ بغیر کسی مالی مفاد کے شیئر نہیں کرتے۔ بلکہ علم کی فروخت ایک باقاعدہ نفع بخش کاروبار کی شکل اختیار کرچکی ہے۔ لیکن اس دور میں بھی کچھ افراد اور ادارے اپنے علم کو افراد عالم کے ساتھ بغیر کسی مالی مفاد کے بانٹ رہے ہیں۔ ان کا مقصد زمانہ کے افراد کی تعلیمی استعداد اور قابلیت میں اضافہ کرکے اسے معاشرے کا کارآمد شہری بنانا ہے۔ اوپن کورس ویئر سے کسی بھی وقت اس تعلیمی مواد کو پڑھ اور دیکھ کر اپنی تعلیمی قابلیت میں اضافہ کرسکتا ہے۔

سائنس کے عجوبے اور ٹکنالوجی کے کرشمے دیکھ کر انسان یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ وہ خدا کس قدر عظیم ہوگا جس نے مٹی بھر انسانی ذہن کو اس قدر خصائل سے نوازا ہے۔ یہ سب کمال میرے رب کا ہے۔ ورنہ انسان کیا اور اس کی بساط کیا۔ مٹی اور راکھ کا ساٹھ سالہ ڈھیر جو بالآخر خود بھی مٹی میں مل جاتا ہے۔ اس کے بنائے ہوئے کارنامے کئی سو سال تک زندہ و تابندہ رہتے ہیں۔ تاج محل کو دیکھیں جسے بنے ساڑھے تین سو سال ہوگئے۔ مگر اس کی چمک دمک آج تک ماند نہیں پڑی ہے۔ تاج محل کو سالانہ ایک ارب لوگ دیکھنے آتے ہیں۔ موجودہ وقت میں امریکہ، یورپ حتیٰ کہ مشرق قریب میں بھی سائنس وٹکنالوجی اس قدر ترقی کرچکی ہے اور ایسے کارنامے سرانجام دیے جارہے ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ سمندروں کو سمندروں سے اور ملکوں کو ملکوں سے ملایا جارہا ہے۔ ہالینڈ اور برطانیہ دو الگ ممالک ہیں جن کے بیچ میں ایک زور آور سمندر حائل ہے، لیکن ان دونوں ممالک کو اندر ہی اندر اس طرح ملا دیا گیا ہے کہ ہالینڈ سے داخل ہونے والا کوئی بھی شخص راستے میں پانی کا ایک قطرہ تک نہیں دیکھتا اور برطانیہ پہنچ جاتا ہے۔

امریکہ کے مشہور ماہر مستقبلیات ریمنڈ کرزویل کا دعویٰ ہے کہ 2045 تک انسان حیاتیاتی مشین بن جائے گا۔ گویا ہمیشہ کی زندگی پالے گا۔ اگر سائنسی وٹکنالوجی ترقی کی رفتار دیکھی جائے، تو یہ عجوبہ حقیقت میں بدلتا محسوس ہوتا ہے۔ آپ چاروں طرف نظر دوڑائیے، آپ کو چھوٹی بڑی کئی مشینیں نظر آئیں گی۔ اسمارٹ فون، انٹرنیٹ، قابل پہناوا آلات اور ننھے منے حساس سینسروں کی بدولت، خصوصاً ترقی یافتہ ممالک میں یہ مشینیں روزمرہ زندگی کا حصہ بن چکی ہیں۔ ماہرین کی رو سے وہ دن دور نہیں جب جسم کے اندر فٹ ہونے والی مشینیں بھی ایجاد ہوجائیں گی۔ انسانی جسم کا محور ومرکز دماغ ہے۔ ایسا قدرتی سپر کمپیوٹر جو فی سیکنڈ 100 ارب حسابات انجام دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ لیکن سائنس داں انسانی دماغ سے طاقتور سپر کمپیوٹر ایجاد کرچکے ہیں۔ مثلاً دنیا کا سب سے تیز رفتار چینی سپر کمپیوٹر، تیان ہی فی سیکنڈ تقریباً

34 کھرب حسابات کرتا ہے۔ لیکن انسان ساختہ سپر کمپیوٹر ابھی حجم میں انسانی دماغ کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ سپر کمپیوٹر کئی سو مربع گز جگہ گھیرتے ہیں۔ جبکہ انسانی دماغ ہتھیلی میں سما جاتا ہے۔ چنانچہ جس دن ماہرین انسانی دماغ سے چھوٹا مگر اس سے زیادہ طاقت ور سپر کمپیوٹر بنانے میں کامیاب ہو گئے، مشینی حکمرانی کا دور شروع ہو جائے گا۔ فی الوقت ہزارہا اقسام کی مشینیں زندگی آسان بنانے میں ہماری مدد کر رہی ہیں۔ ان میں قابل پہناوا اور گھریلو سینسری آلات عمل باخبری ذات سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔ چونکہ اب زیادہ سے زیادہ لوگ ان سے استفادہ کر رہے ہیں لہٰذا آلات بنانے والی کمپنیاں سالانہ کروڑوں روپے تحقیق و تجربات پہ صرف کرتی ہیں تاکہ انھیں بہتر بنایا جا سکے۔

سائنسداں اب ایسے آلات ایجاد کرنا چاہتے ہیں جو ہماری سوچ اور جذبات کو سمجھ سکیں۔ جان لیں کہ ہم کیا چاہتے ہیں؟ صبح ہمیں کیا چاہیے اور شام کو کیا شئے درکار ہوگی؟ مثلاً باورچی خانے میں نصب آلات یہ جان لیں کہ ہمارے جسم میں وٹامن سی کی کمی ہے۔ لہٰذا وہ ایسا کھانا تیار کریں جس میں وٹامن سی کی مقدار زیادہ ہو۔ یا ہمارے نیند میں جاتے ہی ٹیلی ویژن اور لائٹیں بند کر دے۔ اس قسم کے آلات جب بھی ایجاد ہوئے، ''ڈیجیٹل گھر'' وجود میں آئے گا۔ ایسا گھر جہاں نصب سیکڑوں چھوٹے بڑے آلات روزمرہ کے کام کاج میں انسانوں کی بھرپور مدد کریں گے۔ یہ تمام آلات اسمارٹ فون، کمپیوٹر اور دیگر نیٹ ورک نظاموں کی بدولت ایک دوسرے سے منسلک ہوں گے۔ ماہرین نے اس قسم کی نیٹ ورکنگ کو ''انٹرنیٹ آف تھنگس'' کا نام دیا ہے۔ آج قابل پہناوا آلات انسانی صحت کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ لیکن اگلے دس سے بیس سال میں ایسے آلات وجود میں آئیں گے جو ہمارے جذبات پہچان سکیں گے۔ وہ ہم سے احکامات لے کر مختلف کام کریں گے۔ اس طرح کی سائنسی ترقی سے انسانی زندگی میں نیا انقلاب رونما ہوگا۔ فی الوقت انسانی صحت و سرگرمیوں پر نظر رکھنے والے کئی آلات وجود میں آچکے ہیں۔ ٹکنالوجی کی تیز رفتاری اور اخراجات کم ہونے کے باعث مغرب میں اس قسم کے آلات تیزی سے ایجاد ہو رہے ہیں۔

آئی بی ایم کی پانچ ٹکنالوجیز اس وقت ایک سائنس فکشن فلم کا حصہ معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن وہ وقت دور نہیں جب ان ٹکنالوجیز کے بغیر زندگی گزارنے کا تصور بھی محال ہوگا۔ لاس ویگاس میں ہونے والے سالانہ 'انٹرنیشنل کنزیومر الیکٹرانک شو' کے دوران ٹکنالوجی فرم آئی بی ایم نے مستقبل کی پانچ ایسی نئی ٹکنالوجیز کا اعلان کیا ہے جو اس کے مطابق آنے والے کل کا نقشہ بدل کے رکھ دیں گی۔

آئی بی ایم گزشتہ چار برسوں سے ہر سال ایسی نئی ٹکنالوجیز اور ایجادات کی نشاندہی کرتی آ رہی ہے جو اس کے مطابق انسانی مستقبل کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرنے کی صلاحیت کی حامل ہوتی ہیں۔

اس حوالے سے آئی بی ایم کے چیف سائنٹسٹ جان کوہن کا کہنا ہے کہ اس سال منتخب کی گئی ٹکنالوجیز جلد ہی انسانی زندگیوں کا لازمی جزو بن چکی ہوں گی اور ان کے بغیر زندگی کا تصور بھی محال ہوگا۔ کوہن کے مطابق کمپنی کی منتخب کردہ ان پانچ ٹکنالوجیز میں سب سے پہلی 'تھری ڈائمینشنل یا سہ جہتی' ٹکنالوجی ہے جس کا استعمال اس وقت فلموں اور ٹیلی ویژن میں عام ہے۔ تاہم کوہن کے بقول ہم مستقبل میں اس ٹکنالوجی کی بدولت ویب براؤزنگ اور دوستوں سے چیٹنگ کی ایک بالکل نئی دنیا کا تجربہ کریں گے۔ ان کے بقول جب ہم اپنے دوستوں سے اپنے فونز کے ذریعے تھری ڈائمینشنل رابطے میں ہوں گے تو ہمیں اپنے دستی فونوں کی بیٹری ری چارج کرنے کی کوئی فکر بھی نہیں ہوگی کیونکہ ان کے بقول مستقبل کی بیٹریز موجودہ بیٹریز سے کہیں زیادہ دیرپا اور پائیدار ہوں گی۔ سائنسدان بیٹریز کی نت نئی اقسام پہ کام کر رہے ہیں جن میں سرفہرست لیتھیم ایئر بیٹریز ہیں۔ جو خود کو ہوا کے ذریعے بالکل ویسے ہی ری چارج کریں گی جیسے ہم ہوا میں سانس لے کر اپنی زندگی کی ڈور برقرار رکھتے ہیں۔ لہٰذا جب آپ رات کو سوتے وقت اپنا سیل فون اپنے سرہانے رکھیں گے تو اس کی بیٹری ری چارج ہونا شروع ہو جائے گی۔

کلاؤڈ کمپیوٹنگ جدید دور کی ٹکنالوجی ہے جو انٹرنیٹ کا استعمال کرتے ہوئے لامحدود ڈیٹا اور ایپلی کیشنز کو محفوظ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ہم ای میل کرتے ہیں اور میل کو محفوظ کرتے ہیں۔ میل کہاں محفوظ ہوتی ہے؟ ویب سائٹس کا ڈیٹا کہاں محفوظ ہوتا ہے؟ یہ سب کلاؤڈ پر ہو رہا ہے۔ کلاؤڈ کمپیوٹنگ کی وجہ سے لوکل نیٹ ورک سسٹم کا رواج ختم ہو رہا ہے۔ پہلے ویب سائٹ کے ڈیٹا کو لوکل نیٹ ورک پر محفوظ کیا جاتا تھا جو کہ محدود پیمانے پر تھا مگر اب ڈیٹا کلاؤڈ پر اسٹور کیا جاتا ہے اور اس طرح جگہ کی بھی کوئی قید نہیں۔

آج کل بنائے جانے والے گوگل اور ورڈ پریس کے بلاگز اسی ٹکنالوجی سے بنائے جاتے ہیں۔ کلاؤڈ کمپیوٹنگ موجودہ دور میں انفوکمیونیکیشن کی دنیا میں آنے والا انقلاب ہے۔ کلاؤڈ کمپیوٹنگ کے اطلاق سے محدود صارفین کو لامحدود پیمانے پر ایپلی کیشنز اور ڈیٹا محفوظ کرنے کی صلاحیت میسر ہو رہی ہے۔ آئندہ چند سالوں میں کلاؤڈ کمپیوٹنگ کی بدولت انفارمیشن ٹکنالوجی کے شعبے کو فائدہ ہونے والا ہے۔ ہاٹ میل، جی میل، فیس بک، ڈیبکس، اسکائپ، یاہو، یوٹیوب اور ایم ایس این کلاؤڈ کمپیوٹنگ کی مثالیں ہیں۔ ان تمام پروگراموں کا ڈیٹا اور ایپلی کیشنز کلاؤڈ پر محفوظ ہے۔ یونیورسٹی کے تمام لیکچرز یوٹیوب پر شائع کر دیے جاتے ہیں۔ طالب علم جی میل اور گوگل ٹاک کو رابطوں کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ کلاؤڈ کمپیوٹنگ پر ڈیٹا منتقل کرنے کی وجہ سے کاروباری اداروں کے اخراجات میں کمی واقع ہوئی ہے۔

سوشل میڈیا تجارتی، پیشہ ورانہ اور ذاتی برینڈ سازی کے لیے زبردست امکانات رکھتا ہے۔ اگر مواد کے معیار کو بہتر بنایا جائے اور سوشل میڈیا کی بہتر سمجھ کے ذریعے ربط، ضبط بڑھایا جائے تو انٹرنیٹ عوام کے لیے زیادہ حوصلہ بخش ماحولیاتی نظام بن سکتا ہے۔ ماضی میں تجار طبقہ اپنی اشیا کی تشہیر کے لیے ٹی وی اور اخبارات و رسالوں میں اشتہارات دیا کرتا تھا۔ مگر اب اس میں کچھ حد تک کمی آئی ہے۔ کیونکہ سوشل نیٹ ورکنگ سائٹ پر یہ کام سستا ہے۔ جبکہ صارف تک اشیا کی معلومات بھی جلد پہنچ جاتی ہیں۔ ایک سروے کی رپورٹ کے مطابق سوشل میڈیا سے براہ راست آن لائن کاروبار کی نمائش سے آمدنی میں 70 سے 80 فیصد تک اضافہ ممکن ہے۔ کیونکہ بذریعہ الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا ایک محدود پیمانے پر اشیا کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ مگر سوشل میڈیا کے ذریعے پوری دنیا میں پروڈکٹ متعارف ہو جاتا ہے۔ گوگل کی پیش کردہ اشتہاری مہم نے آن لائن کمائی اور اشتہارات کا کافی فروغ دیا ہے۔

سوشل میڈیا تجارتی، پیشہ ورانہ اور ذاتی برینڈ سازی کے لیے زبردست امکانات رکھتا ہے۔ اگر مواد کے معیار کو بہتر بنایا جائے اور سوشل میڈیا کی بہتر سمجھ کے ذریعے ربط، ضبط بڑھایا جائے تو انٹرنیٹ عوام کے لیے زیادہ حوصلہ بخش ماحولیاتی نظام بن سکتا ہے۔ ماضی میں تجار طبقہ اپنی اشیا کی تشہیر کے لیے ٹی وی اور اخبارات و رسالوں میں اشتہارات دیا کرتا تھا۔ مگر اب اس میں کچھ حد تک کمی آئی ہے۔ کیونکہ سوشل نیٹ ورکنگ سائٹ پر یہ کام سستہ ہے۔ جبکہ صارف تک اشیا کی معلومات بھی جلد پہنچ جاتی ہیں۔

سوشل میڈیا کے ٹولز کسی کے لیے بھی کھلے ہیں۔ یعنی آپ ان کو با آسانی استعمال کر سکتے ہیں۔ جبکہ روایتی ذرائع ابلاغ تک پہنچنے کے لیے کافی پیسے درکار ہوتے ہیں اوراس کے علاوہ میڈیا صنعت کے رابطوں کے ایک اچھے نیٹ ورک کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ گوگل اور ورڈ پریس نے سوشل میڈیا کے فروغ میں نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔ روایتی ذرائع ابلاغ میں ہنر، مہارت، تربیت اور خاص آلات درکار ہوتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں سوشل میڈیا نہایت آسان ہے۔

پہلے لوگ کتاب اور پڑھنے کی اہمیت پر بہت یقین رکھتے تھے۔ ان پڑھ عورت کو بھی ناخواندہ کہلانا پسند نہیں تھا۔ ہر شخص کے گھر میں کتابوں کی لائبریری بھی موجود ہوتی اور پبلک لائبریریاں بھی تھیں۔ پڑھنے والے اپنی علمی پیاس وہیں بجھایا کرتے تھے۔ اپنے دن رات کے کچھ گھنٹے بخوشی اس کی نذر کر دیا کرتے تھے۔ لیکن اب کتب بینی کا شوق ختم ہوتا جا رہا ہے۔ دور جدید سے انسان کو بہت ساری سہولیات میسر آئی ہیں۔ الیکٹرانک میڈیا دیکھتے ہی دیکھتے چھا چکا۔ وقت نے ایسی کروٹ لی کہ کتابیں گھروں سے کم اور پھر غائب سی ہونے لگیں۔ ان کی جگہ کمپیوٹر، موبائل، میوزک نے لے لی۔ کتاب ہاتھ سے منتقل ہو کر کمپیوٹر میں سما گئی۔ پوری دنیا میں اس تبدیلی کو قبول کر لیا گیا۔ وہاں کتابوں کے شائقین کی تعداد کم نہیں ہوئی۔ وہاں کتابیں آج بھی ہزاروں، لاکھوں کی تعداد میں شائع ہوتی ہیں۔ اور انٹرنیشنل سطح پر بیسٹ سیلرز بکس بن جاتی ہیں۔

امریکہ سے شائع ہونے والے 'چلڈرن ٹکنالوجی ریویو' نامی جریدے کے مدیر وارن بکلائٹر کا کہنا ہے کہ یہ ایک ایسا موضوع ہے جو گزشتہ کچھ برسوں کے دوران تیزی سے ابھر کر سامنے آیا ہے۔ بکلائٹر نیویارک میں 'لی بریز اینڈ ویڈیو گیمز'، یعنی چھوٹے بچوں کے اذہان اور ویڈیو گیمز کے عنوان سے منعقد ہونے والی ایک پینل ڈسکشن میں اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔ ان کے مطابق والدین کو چاہیے کہ وہ الیکٹرانک ڈیوائسیز کے استعمال کے حوالے سے بچوں کے لیے کچھ حدود طے کریں۔

برطانیہ اور امریکہ کے 2200 والدین اور بچوں سے کیے جانے والے ایک سروے کے مطابق 3 سے 8 سال تک کی عمر کے تقریباً 51 فیصد بچے آئی پیڈ استعمال کر چکے تھے۔ 9 فیصد کے پاس ذاتی آئی پیڈ موجود تھا جبکہ 20 فیصد افراد کے پاس اپنا آئی پوڈ تھا۔ 'کڈز انڈسٹریز' یعنی بچوں سے متعلق صنعت نامی مارکیٹنگ کمپنی کی جانب سے کرائے جانے والے اسی سروے سے یہ بات بھی سامنے آئی کہ 77 فیصد والدین کے خیال میں ٹیبلٹ کمپیوٹر کا استعمال ان کے بچوں کے لیے فائدہ مند ہے۔ کیونکہ ان والدین کا موقف ہے کہ یہ آلات ان کے بچوں کی تخلیقی صلاحیتوں کو ابھارنے میں انتہائی معاون ہیں۔ بعض محققین کی جانب سے ٹیبلٹ کمپیوٹرز کے ضرورت سے زیادہ استعمال کے باعث بچوں میں ذہنی عوارض ہونے کے خدشات کا اظہار کیا گیا ہے۔ لیکن ماہرین کے خیال میں اس حوالے سے فیصلہ صادر کرنے میں جلد بازی سے کام نہیں لیا جانا چاہیے۔ بچوں کے لیے ٹیلی ویژن پروگرام سیسمی اسٹریٹ ورکشاپ سے وابستہ پروڈیوسر روز میری ٹرگلیو کے بقول "ٹکنالوجی جہاں بعض چیزوں کی نشوونما کا باعث بنتی ہے تو وہیں بعض عادات کے لیے خطرہ بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ اس کے استعمال میں اعتدال بلا شبہ اہم ہے۔ نیو امیریکن فاؤنڈیشن سے منسلک ابتدائی تعلیم سے متعلق پیش بندی کی ڈائریکٹر لیزا گوئنسی نے اس ضرورت پر زور دیا کہ والدین کو چاہیے کہ وہ الیکٹرونک آلات استعمال کرنے کے حوالے سے اپنے بچوں پر ایک حد مقرر کریں۔ ان کے خیال میں والدین کو دیکھنا چاہیے کہ کیا بچے 30 منٹ تک اسکرین پر نظریں جمائے بغیر دوسروں کے ساتھ گفتگو پر اپنی توجہ برقرار رکھ سکتے ہیں۔

برقی کتاب کا تصور اس وقت منظر عام پر آیا جب 1971 میں مائیکل ہارٹ نے گٹنبرگ منصوبہ شروع کیا جس میں پبلک ڈومین کی تمام کتابوں کو برقی شکل میں انٹرنیٹ پر شائع کیا گیا تاکہ لوگ مختلف زمانوں کی کتابیں انٹرنیٹ کے ذریعے مفت حاصل کر سکیں، سب سے پہلا مصنف جس نے برقی کتاب شائع کی وہ اسٹیفن کنگ تھا۔ جس نے سال 2000 میں اپنی کتاب رائیڈنگ دی بولیٹ (Riding the Bullet) برقی شکل میں شائع کی اور کتاب کی اشاعت کے صرف چوبیس گھنٹوں میں چار سو لوگوں نے ڈھائی ڈالر میں کتاب خرید کر برقی شکل میں حاصل کی۔

دوسرے کسی سیکٹر کے مقابلے میں کتابوں کی تصنیف، نشر و اشاعت میں انٹرنیٹ نے قطعی مختلف اور اہم کردار ادا کیا جو فائدے اور نقصان میں مقابلہ بازی سے کہیں آگے بڑھ کر بقا کی جنگ کی صورت اختیار کر گیا۔ جس میں اسمارٹ فونز، لیپ ٹاپس، ای بک ریڈرز جیسے کینڈل، سونی اور ریڈر وغیرہ نے کتابوں کی فروخت کی شرح کو تاریخ میں پہلی بار چھپی ہوئی کتابوں سے کہیں زیادہ بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا اور برقی کتاب اور انٹرنیٹ کے ایک نئے دور کا آغاز کیا۔

آپ نے اخبارات، ٹی وی یا انٹرنیٹ پر ورچوئل ریئلیٹی کا لفظ سنا ہو؟ آسان الفاظ میں اسے کچھ یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ کمپیوٹر اور دیگر الیکٹرانک آلات کی مدد سے ایک ایسا ماحول پیدا کیا جائے۔ جو دیکھنے اور محسوس کرنے میں بالکل اصل معلوم ہو تاہم حقیقت میں اس کا وجود ہی نہ ہو۔ یہ تصور کچھ نیا نہیں اور کم و بیش گذشتہ 100 سالوں سے ایسی ٹکنالوجی پر کام کیا جا رہا ہے جس کی مدد سے انسانی دماغ کو دھوکہ دیا جا سکے اور نقل کو اصل کے طور پر پیش کیا جائے۔ دو سال قبل متعارف کیا جانے والا ورچوئل ریئلیٹی ہیڈ سیٹ Rift بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہ ڈیوائس جسے سر پر پہنا جاتا ہے اور یہ آپ کی آنکھوں کے سامنے ایک پردہ ڈال دیتی ہے۔ مگر جب اس پر گیم یا کوئی ورچوئل سین چلتا ہے تو آپ اپنے آپ کو اسی دنیا کا حصہ محسوس کرنے لگتے ہیں۔ اس میں لگے سنسرز آپ کے سر کی حرکت کو مانیٹر کرتے رہتے ہیں۔ جس کی مدد سے آپ کو شائبہ تک نہیں ہوتا کہ آپ کی آنکھوں کے سامنے نظر آنے والا منظر دراصل ایک دھوکہ ہے۔ اسے پہننا اور پھر پہنے رکھنا بہت ہی آسان ہے۔ یہ کم وزن کی بدولت آپ اس پر گھنٹوں کوئی گیم کھیل سکتے ہیں۔

سائنس، کمپیوٹر، انٹرنیٹ، اطلاعاتی ٹکنالوجی، ای میل، ای بک، ای تعلیم، سوشل میڈیا اور ورچوئل ریئلیٹی یہ ساری اصطلاحیں عہد حاضر پر نہ صرف اثر انداز ہو رہی ہیں بلکہ زبان، فرد اور سماج و معاشرے پر اپنی گرفت بھی مضبوط کرتی جا رہی ہیں۔ سماج کا ہر فرد اس کی اہمیت و افادیت کو نہ صرف سمجھتا ہے بلکہ روز و شب کی کہانی میں کسی نہ کسی شکل میں ان سے رشتے استوار کرتا ہے۔

■

Mazhar Hasnain
33T, Sector 7
Jasola Vihar
New Delhi - 110025
Mob.:9313621153

ریویو اور ویو
(Review and View)

پچھلے کچھ ابواب میں آپ نے ایم ایس-ورڈ کی مختلف خصوصیات کے بارے میں پڑھا، لیکن ایم ایس- ورڈ کی خصوصیات صرف یہیں ختم نہیں ہوتیں۔ بتائے گئے کاموں کے علاوہ آپ ورڈ میں اسپیلنگ کی جانچ کر سکتے ہیں، الفاظ کے ہم معنی ڈھونڈ سکتے ہیں، ٹیکسٹ کا ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کر سکتے ہیں، دستاویز کا فونٹ سائز چھوٹا یا بڑا کیے بغیر اسے چھوٹا یا بڑا کر کے دیکھ سکتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ اس باب میں ہم ورڈ کی انھیں بعض خصوصیات پر بات کریں گے۔

دستاویز کا جائزہ (Reviewing the Document)

ایم ایس-ورڈ میں دستاویز کا جائزہ لینے کے لیے ربن میں دیے گئے ریویو (Review) ٹیب کا استعمال کیا جاتا ہے، جو تصویر WD-9.1 کی طرح نظر آتا ہے۔

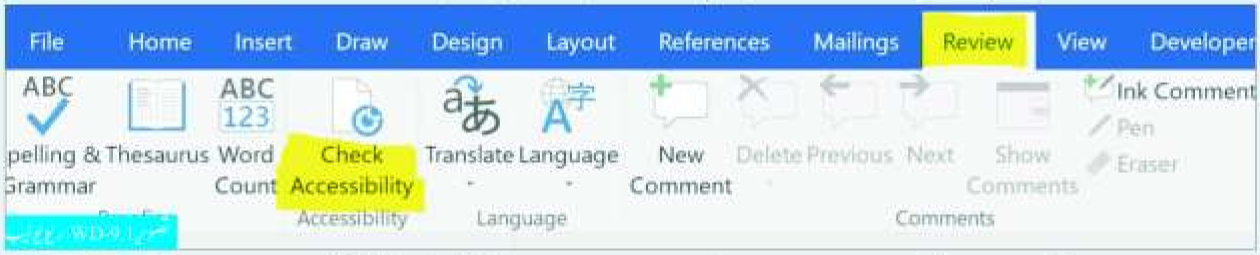

تصویر WD-9.1: ریویو ٹیب

اس ٹیب میں دیے گئے حصوں اور آپشنز کی مدد سے آپ دستاویزوں کے جائزہ سے متعلق متعدد کام کر سکتے ہیں، جیسے اسپیلنگ جانچنا، ترجمہ کرنا، ٹیکسٹ پر تبصرہ کرنا، دوسرے قلم کار کے ذریعے آپ کی دستاویز میں کی گئی تبدیلی دیکھنا، تبدیلی کو قبول کرنا یا رد کرنا، دو دستاویزوں کا موازنہ کرنا وغیرہ لیکن ان سبھی کاموں میں سے بنیادی اور سب سے زیادہ استعمال میں لائے جانے والے آپشنز اسپیلنگ جانچنا، ہم معنی الفاظ ڈھونڈنا، ترجمہ کرنا وغیرہ ہیں، جنھیں پروفنگ (Proofing) حصہ میں دکھایا گیا ہے۔ یہاں ہم صرف Proofing حصہ کی خصوصیات اور اس سے جڑے کاموں پر بات کریں گے، کیونکہ بقیہ حصوں کے آپشنز کا استعمال بہت کم کیا جاتا ہے۔

Proofing حصہ میں کل سات بٹن ہیں۔ اسپیلنگ اور گرامر (Spelling and Grammar)، جانچ (Research)، لغت (Thesaurus)، ترجمہ (Translate)، ترجمہ اسکرین ترکیب (Translation Screen Tip)، زبان (Set Language) اور الفاظ کا شمار (Word Count)۔ ان سبھی بٹنوں کی خصوصیات درج ذیل ہیں:

(i) اسپیلنگ جانچ کرنا (Cheking Spelling): ایم ایس- ورڈ میں ٹیکسٹ ٹائپ کرتے وقت اگر آپ کوایسا لفظ ٹائپ کرتے ہیں، جو ایم ایس-ورڈ کی چنی ہوئی ڈکشنری میں نہیں ہوتا، تو لفظ پورا ہوتے ہی ایم ایس-ورڈ اس کے نیچے لال رنگ سے ایک سانپ جیسی لائن (   ) کھینچ دیتا ہے، تاکہ آپ کو پتہ چل جائے کہ وہ لفظ غلط ہے۔ اگر وہ لفظ حقیقت میں غلط ٹائپ ہوا ہے، تو اس غلطی کو آپ وہیں ٹھیک کر سکتے ہیں۔ اگر صحیح اسپیلنگ آپ کو معلوم نہیں ہے یا آپ اسے ٹھیک مانتے ہیں، تو اسے ایسے ہی چھوڑ کر سارا ٹیکسٹ ٹائپ کرنے کے بعد ایم ایس-ورڈ کا اسپیلنگ چیک کرنے والا پروگرام چلائیے۔

اسپیلنگ چیکر (Spelling checker) چلانے کے لیے پہلے کرسر کو دستاویز کے شروع لے جائیے۔ اب Review ٹیب میں Proofing حصہ کے 'Spelling and Grammar' بٹن کو کلک کیجیے یا فنکشن کنجی 7 (F7) دبائیے۔ ایسا کرتے ہی وہ پروگرام شروع ہو جائے گا اور ٹیکسٹ میں کوئی غلط لفظ ہونے پر تصویر WD-9.2 کی طرح اسپیلنگ اور گرامر کا ڈائیلاگ باکس دکھائی دے گا۔

تصویر WD-9.2: اسپیلنگ کی جانچ کرنا

اس ڈائیلاگ باکس میں اوپر کے 'Not in Dictionary' حصہ میں غلط لفظ دکھایا جاتا ہے اور نیچے کے 'Suggestions' حصہ میں اس سے ملتے جلتے صحیح لفظوں کو دکھایا جاتا ہے۔ اگر آپ ان لفظوں میں سے کسی کو صحیح مانتے ہیں، تو اسے کلک کرکے چن لیجیے۔ اب دائیں طرف کے 'Change' بٹن کو کلک کرکے آپ غلط لفظ کی جگہ اپنا چنا ہوا صحیح لفظ بھر سکتے ہیں۔ اگر آپ یہ تبدیلی پوری دستاویز میں کرنا چاہتے ہیں، تو 'Change' بٹن کی بجائے 'Change All' بٹن کو کلک کیجیے۔

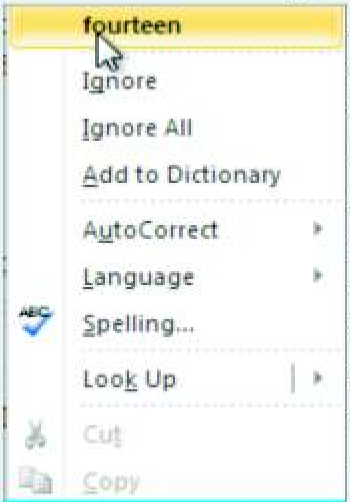

تصویر WD-9.3: صحیح اسپیلنگ کا کانٹیکسٹ مینو

اگر آپ اپنے ٹائپ کیے ہوئے لفظ کو صحیح مانتے ہیں اور اسے ایسے ہی رکھنا چاہتے ہیں، تو 'Igonre' بٹن کو کلک کیجیے۔ پوری دستاویز میں یہ لفظ ایسے ہی چھوڑ دینے کے لیے 'Ignore All' کو کلک کرنا چاہیے۔ اگر آپ اس لفظ کو اپنی لغت (ڈکشنری) میں جوڑنا چاہتے ہیں، تاکہ ایم ایس-ورڈ آگے بھی اس لفظ کو غلط نہ مانے، تو 'Add to Dictionay' بٹن کو کلک کیجیے۔ ایسا عموماً آدمیوں اور جگہوں کے ناموں کے لیے کیا جاتا ہے۔

اس طرح ایک غلط لفظ کو ٹھیک کرنے کے بعد یا چھوڑ دینے کے بعد اگلے غلط لفظ پر بھی یہی عمل دوہرایا جاتا ہے۔ اخیر میں، یعنی سبھی لفظوں کی اسپیلنگ ٹھیک کر لینے پر ایم ایس-ورڈ آپ کو 'The Spelling and grammar check is complete' پیغام دیتا ہے۔ اسپیلنگ چیکر چلانے پر، لیکن کوئی غلطی نہ ملنے پر بھی یہی پیغام دیا جاتا ہے۔

ٹائپ کرتے وقت اسپیلنگ ٹھیک کرنے کا ایک طریقہ اور ہے۔ اگر کسی لفظ کو ایم ایس-ورڈ نے غلط مان کر اس کے نیچے لال سانپ جیسی لائن کھینچ دی ہے اور آپ کو اس لفظ کی صحیح اسپیلنگ معلوم نہیں ہے، تو ماؤس پوائنٹر کو اس غلط لفظ پر لے جاکر ماؤس کا دایاں بٹن کلک کیجیے۔ ایسا کرنے پر اسکرین پر وہیں تصویر WD-9.3 کی طرح ایک کانٹیکسٹ مینو کھل جائے گا۔ اس مینو میں سب سے اوپر اس غلط لفظ سے ملتے جلتے صحیح لفظ دکھائے جاتے ہیں (اگر کوئی ہو) اور نیچے مختلف کاموں کی ہدایت دیتے ہیں۔ اگر آپ اس لفظ کی جگہ پر کسی صحیح لفظ کو لانا چاہتے ہیں، تو اسے کلک کر دیجیے۔ اس سے غلط لفظ کی جگہ وہ صحیح لفظ آجائے گا۔ اس کے بجائے آپ نیچے دی گئی ہدایات میں سے کسی کو چن کر ویسی کارروائی کر سکتے ہیں۔

کئی بار ایم ایس-ورڈ کچھ لفظوں یا کسی جملہ کے نیچے ہرے رنگ کی سانپ جیسی لائن کھینچ دیتا ہے۔ ایسی لائن کا مطلب ہے کہ ان لفظوں کی اسپیلنگ تو صحیح ہے لیکن ان کے گرامر یا ٹھہرنے کے نشانات میں کوئی غلطی ہے۔ ایسا عموماً ایک ساتھ دو اسپیس ٹائپ ہوجانے، قوسین سے پہلے یا بعد میں خالی جگہ نہ دینے، جملہ زیادہ لمبا ہونے وغیرہ اسباب سے ہوتا ہے۔ ایسے میں ٹیکسٹ کی جانچ کرکے ٹھیک کرنا چاہیے اور اگر سمجھ میں نہ آئے، تو اسے ویسا ہی چھوڑ دیجیے۔

(ii) آٹو کریکٹ (Auto Correct): ایم ایس-ورڈ میں اسپیلنگ کی غلطیوں کو ٹھیک کرنے کی سہولت کے بارے میں آپ اوپر پڑھ چکے ہیں۔ اس سہولت کے ذریعے اسپیلنگ کی سبھی غلطیوں کو آسانی سے ٹھیک کیا جاسکتا ہے۔ اسپیلنگ کی بہت سی غلطیاں عموماً ٹائپنگ کی رفتار سے پیدا ہوتی ہیں، جیسے 'the' ٹائپ کرتے کرتے ہم 'teh' ٹائپ کر جاتے ہیں اور 'is' ٹائپ کرتے کرتے 'si' ٹائپ کر جاتے ہیں۔ ایم ایس-ورڈ میں ٹائپنگ کی ایسی غلطیوں کو اپنے آپ ہی فوراً ہی ٹھیک کر دینے کی سہولت موجود ہے۔ اس سہولت کا نام آٹو کریکٹ (Auto Correct) ہے۔

اس سہولت میں پہلے سے ہی ہزاروں مندرجات (Entries) بھری ہوئی ہیں۔ ہر ایک مندرجہ میں ممکنہ غلط لفظ اور اس کے بدلے آنے والا صحیح لفظ دیا ہوا ہے۔ ٹائپ کرتے وقت جیسے ہی آپ کسی لفظ یا حرف کے بعد اسپیس بار، ٹیب یا انٹر کنجی دباتے

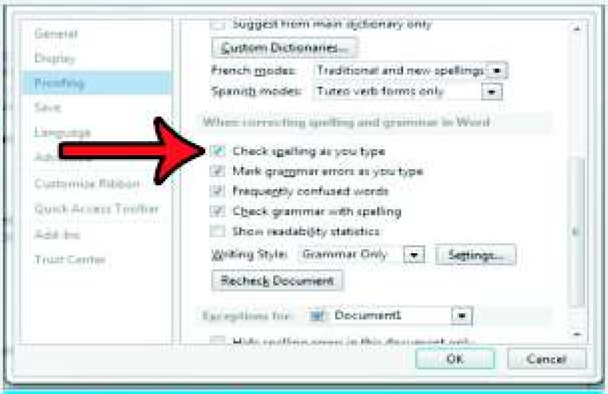

تصویر WD-9.4: آپشنز ڈائیلاگ باکس

ہیں، آٹو کریکٹ ایکشن میں آجاتا ہے۔ اگر آپ کے ذریعے ٹائپ کیے گئے پچھلے لفظ کی مندرجہ آٹو کریکٹ میں پہلے سے بھری ہوئی ہے، تو آٹو کریکٹ اسی وقت اس کی جگہ پر مندرجہ کے مطابق صحیح لفظ رکھ دیتا ہے۔ اگر اس لفظ کا کوئی مندرجہ نہیں ہے، تو کچھ بھی نہیں کیا جاتا، بلکہ آگے کا کام اسپیلنگ چیکر کے اوپر چھوڑ دیا جاتا ہے۔

آٹو کریکٹ کے مندرجات کو دیکھنے کے لیے سب سے پہلے Office بٹن پر کلک کیجیے۔ کھلنے والے مینو میں Word Options بٹن پر کلک کیجیے۔ ایسا کرنے پر Word Options ونڈو تصویر 9.4 کی طرح کھلے گی۔ اس ونڈو کی بائیں پٹی میں دیے گئے آپشنز میں سے Proofing آپشن چنیں۔ اس سے ایک دوسری ونڈو تصویر WD-9.5 کی طرح کھلے گی۔ اب اس ونڈو میں 'Autocorrect Options...' ہدایت دیجیے۔ اس سے اسکرین پر تصویر WD-9.6 کی طرح آٹو کریکٹ کا ڈائیلاگ باکس کھل جائے گا۔

تصویر WD-9.5: پروفنگ حصہ

اس ڈائیلاگ باکس کی 'Auto Correct' ٹیب شیٹ کے اوپری حصہ میں کچھ چاک باکس ہیں، جنھیں آپ سیٹ کرکے مختلف آپشنز کو لاگو کر سکتے ہیں۔ نیچے کے حصہ میں آٹو کریکٹ کے مندرجات دکھائے جاتے ہیں۔ ان مندرجات کی تعداد سیکڑوں

میں ہوتی ہے۔ ساتھ کے اسکرول بار کی مدد سے آپ اوپر نیچے کے مندرجات تک پہنچ سکتے ہیں۔

یہ دھیان میں رکھنے کی بات ہے کہ آٹو کریکٹ اپنے مندرجات کی فہرست کے مطابق 'غلط' ٹائپ کیے گئے سبھی لفظوں کو بغیر کچھ سوچے 'صحیح' لفظوں سے بدل دیتا ہے۔ اس سے کئی بار بڑا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے، کیونکہ آپ کوئی ٹیکسٹ صحیح صحیح ٹائپ کرتے ہیں اور آٹو کریکٹ اسے غلط مان کر دوسرا لفظ بھر دیتا ہے، جس سے آپ پریشان ہو جاتے ہیں۔ جب ہم ہندی کے فونٹس کا استعمال کرتے ہیں، تب عموماً ایسا مسئلہ پیدا ہوتا ہے اس کا فوری حل 'Undo' ہدایت دینا ہے۔ یہ ہدایت آپ Ctrl+Z دبا کر دے سکتے ہیں۔ اگر آپ مستقل حل چاہتے ہیں، تو گڑبڑ کرنے والے مندرجات کو آٹو کریکٹ سے نکال دینا چاہیے۔ اگر آپ کسی مندرجہ کو اس فہرست سے ہٹانا چاہتے ہیں، تو اس مندرجہ کو کلک کر کے چن لیجیے اور 'Delete' بٹن کلک کیجیے۔ اس سے وہ مندرجہ غائب ہو جائے گا۔

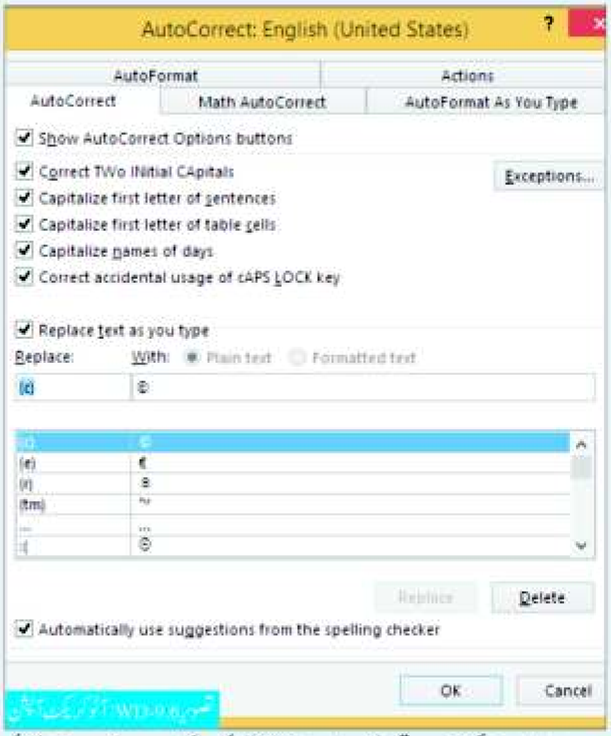

تصویر WD-9.8: آٹو کریکٹ آپشن

اسی طرح اگر آپ یہ تجربہ کرتے ہیں کہ آٹو کریکٹ کی مندرجہ فہرست میں کوئی مندرجہ نہیں ہے اور وہ ہونا چاہیے تھا، تو آپ ایسا مندرجہ خود جوڑ سکتے ہیں۔ اس کے لیے ڈائیلاگ باکس کے درمیانی حصہ میں 'Replace' ٹیکس باکس میں وہ مندرجہ ٹائپ کیجیے۔ اس کے سامنے 'With' ٹکسٹ باکس میں اس کو بدل کر رکھا جانے والا صحیح ٹیکسٹ (لفظ یا جملہ) ٹائپ کر کے 'Add' بٹن کو کلک کر دیجیے۔ اس سے وہ مندرجہ آٹو کریکٹ کی فہرست میں شامل ہو جائے گا۔

اگر کبھی آپ کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ نے لفظ صحیح ٹائپ کیا تھا اور آٹو کریکٹ نے اس کو بدل کر غلط لفظ بھر دیا ہے، تو اس کے اس کام کو الٹنے کے لیے فوراً ان ڈو (Undo) ہدایت دینا چاہیے۔ اس کے لیے آپ آلٹ (Alt) کے ساتھ بیکس اسپیس (Backspace) کنجی دبایئے یا کنٹرول (Ctrl) کے ساتھ Z دبایئے، جو 'Undo' کا شارٹ کٹ ہے۔ ایسا کرتے ہی آپ دیکھیں گے کہ آپ کی دستاویز میں پہلے والا لفظ واپس آ گیا ہے۔

آٹو کریکٹ سہولت کے ذریعے آپ شارٹ ہینڈ (Shorthand) کا فائدہ بھی اٹھا سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر، مان لیجیے کہ آپ کو ایک نام 'Vinod Kumar Agarwal' کئی بار ٹائپ کرنا ہے۔ اس پورے نام کو ہر بار ٹائپ کرنے سے بچنے کے لیے آپ ایک مختصر مندرجہ بنا سکتے ہیں جیسے vka یا vk یا v۔ اس مندرجہ کو اگر آپ آٹو کریکٹ میں جوڑ دیں، تو صرف ہی حرف ٹائپ کر کے آپ پورا نام بھر سکتے ہیں۔ اس طرح آپ آٹو کریکٹ سہولت کا زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

تصویر WD-9.7: ورڈ میں ہم معنی لفظ ڈھونڈنا

(iii) ہم معنی لفظ ڈھونڈنا (Looking for Synonyms): آپ ایم ایس۔ ورڈ میں کسی بھی لفظ کا ہم معنی آسانی سے ڈھونڈ سکتے ہیں۔ اس کے لیے سب سے پہلے لفظ کا انتخاب کریں۔ اب Spelling & Grammar بٹن کے بغل میں دیے گئے Research اور Thesaurus بٹنوں میں سے کسی پر بھی کلک کریں۔ دونوں میں سے کسی پر بھی کلک کرنے سے ایک جیسی Research ونڈو آپ کی دستاویز کی دائیں طرف تصویر WD-9.7 کی طرح کھلتی ہے، جس میں چنے ہوئے لفظ کے ہم معنی الفاظ لکھے ہوتے ہیں۔

(iv) ترجمہ کرنا (Translating): آپ ایم-ایس ورڈ میں ٹیکسٹ کا ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ بھی کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے سب سے پہلے مطلوبہ لفظ چنیے۔ اب Thesaurus بٹن کے نیچے دیے گئے Translate بٹن پر کلک کیجیے۔ اس سے Research ونڈو تصویر WD-9.8 کی طرح کھلے گی۔

تصویر WD-9.9: ورڈ میں ترجمہ کرنا

اس ونڈو کے To لسٹ باکس میں مطلوبہ زبان چنیے اور ایک لمحہ کے لیے رکیے۔ چنے ہوئے لفظ کا ترجمہ Research ونڈو کے نچلے حصہ میں دکھا دیا جائے گا۔

(جاری)

بہ شکریہ: ریپڈیکس کمپیوٹر کورس (ونڈوز 7 اور 8 / آفس 2007) سنہ اشاعت: 2015، ناشر: یونی کورن بکس F-2/16، انصاری روڈ، دریا گنج، نئی دہلی 2
فون نمبر: 011-23275434,23262683

تبصرہ و تعارف

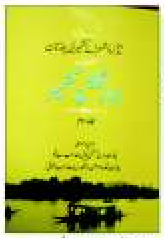

بہار گلشن کشمیر (جلد سوم)

مرتبہ و مولفہ: پنڈت برج کشن کول و پنڈت جگ موہن ناتھ رینا
ترتیب نو: ڈاکٹر حسین ماجد
ضخامت: 602 صفحات، قیمت: 350 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، نئی دہلی
مبصر: ڈاکٹر شفیع ایوب، ہندوستانی زبانوں کا مرکز، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

تذکرہ شعرائے کشمیری پنڈتان المعروف بہ 'بہار گلشن کشمیر' دراصل اپنے موضوع پر ایک انسائیکلوپیڈیا ہے۔ یہ کتاب اردو فارسی کے کشمیری پنڈت شعرا پر مشتمل ایک اہم تذکرہ ہے۔ اس تذکرے کے مؤلفین پنڈت برج کشن کول بے خبر اور پنڈت جگ موہن ناتھ رینا شوق خود کشمیری پنڈت ہیں۔ یہ تذکرہ پہلی بار انڈین پریس، الہ آباد سے دو جلدوں میں 32-1931 میں شائع ہوا تھا۔ اشاعت اول کو ملک بھر میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ مختلف رسائل و جرائد میں اس کتاب پر تبصرے شائع ہوئے۔ بڑے بڑے علمائے ادب نے پنڈت برج کشن کول اور پنڈت جگ موہن ناتھ رینہ کو تہنیت پیش کی۔ اٹھارہ سو سے زائد صفحات پر مشتمل ان دو جلدوں کی خاطر خواہ پذیرائی ہوئی۔ لیکن رفتہ رفتہ زمانے کی گرد جمتی رہی اور یہ اہم تحقیقی کتاب نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ ترتیب نو کی سخت ضرورت تھی جسے ڈاکٹر حسین ماجد نے بحسن وخوبی انجام دیا اور اب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اسے شائع کیا ہے۔ ترتیب نو چار جلدوں پر محیط ہے۔ زیر تبصرہ کتاب جلد سوم ہے۔ اس جلد سوم میں کل 128 کشمیری پنڈت شعرا کا ذکر اور ان کا نمونہ کلام موجود ہے۔ تقریباً 600 صفحات پر محیط اس جلد سوم میں ڈاکٹر حسین ماجد کا تفصیلی مقدمہ بھی شامل ہے۔

یہ نایاب کتاب اب کہیں بازار میں دستیاب نہیں تھی۔ قومی اردو کونسل نے اس ضخیم کتاب کو شائع کر کے یقیناً ایک اہم خدمت انجام دی ہے۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار، پنڈت دیا شنکر نسیم، پنڈت برج نرائن چکبست، پنڈت تربھون ناتھ ہجر اور پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی نے اردو زبان و ادب کی جو عظیم خدمت کی ہے اس سے بھلا کون واقف نہیں ہے۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ یہ بھی کشمیری پنڈت تھے۔ کشمیر کو ایران صغیر کے نام سے بھی جانتے ہیں۔ ایران کی طرح کشمیر میں بھی ایک زمانے تک فارسی زبان کا خوب چلن رہا ہے۔ کشمیری پنڈتوں نے زبان فارسی و اردو کی بے پناہ خدمات انجام دی ہیں لیکن افسوس کی بات یہ رہی کہ ان میں سے چند کو چھوڑ کر زیادہ تر گمنامی کے اندھیروں میں کھوئے رہے۔ سب سے پہلے پنڈت برج کشن کول صاحب کو یہ خیال گزرا کہ جہاں تک ممکن ہو شعرائے کشمیری پنڈتان کا ایک تذکرہ لکھا جائے۔ پنڈت برج کشن کول خود بھی کشمیری پنڈت اور شاعر تھے۔ شوق تخلص فرماتے تھے۔ اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز رہتے ہوئے انھوں نے اس کام کے لیے وقت نکالا، جس سے ان کے جذبے اور جنون کا پتہ چلتا ہے۔ کشمیر سے باہر رہ کر انھوں نے بڑی محنت اور ریاضت سے کشمیری پنڈت شاعروں کے احوال جمع کیے۔ دنیائے شعر و ادب کو یہ اندازہ تو تھا کہ کشمیری پنڈتوں نے فارسی اور اردو زبان و ادب کی خدمت کی ہے لیکن اس تحقیقی کتاب کی اشاعت سے پہلے دنیا کو یہ نہیں معلوم تھا کہ اتنی بڑی تعداد میں کشمیری پنڈتوں کا کلام موجود ہے۔ پہلے فارسی اور پھر اردو زبان میں اتنا بڑا شعری سرمایہ دنیائے شعر و ادب کی نظروں سے کافی حد تک اوجھل تھا۔ پنڈت برج کشن کول قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے طویل عرصہ پہلے تن تنہا یہ بھاری پتھر اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ بعد ازاں پنڈت جگ موہن ناتھ رینا نے کشن کول صاحب کے اس کام کو مکمل کیا۔ پہلی جلد کے شائع ہوتے ہی ملک بھر میں اس کتاب کی پذیرائی ہوئی۔ پھر دوسری جلد بھی چھپ کر آئی۔ پنڈت برج کشن کول اور ان کے آبا و اجداد فارسی زبان پر دسترس رکھتے تھے۔ اس کتاب کی تالیف کے وقت ان کے پیش نظر فارسی اور اردو کے تذکرے تھے۔ تذکرہ گلشن بے خار اور تذکرہ نکات الشعرا کی طرز پر ہی اس کتاب کا نام 'تذکرہ شعرائے کشمیری پنڈتان' رکھا۔ جسے 'بہار گلشن کشمیر' کے نام سے بھی شہرت ملی۔

زمانے بعد ڈاکٹر حسین ماجد صاحب نے اس اہم کتاب کی طرف توجہ فرمائی اور بڑی محنت و جانفشانی سے اسے از سر نو ترتیب دیا۔ کشن کول بے خبر اور جگ موہن ناتھ رینا کی وہ تحریریں بھی شامل کتاب ہیں جو بطور دیباچہ اشاعت اوّل میں شامل تھیں۔ اس سے کتاب کی اہمیت و افادیت کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ یہ کتاب افراد سے زیادہ اداروں کے لیے کارآمد ہے۔ ہندوستان کی ہر لائبریری اور اہم اداروں میں اس کتاب کی سبھی جلدوں کا ہونا اس لیے ضروری ہے کہ یہ اپنے موضوع پر واحد مستند اور مفصل کتاب ہے۔ اس میں نہ صرف شاعروں کے حالات درج ہیں بلکہ اچھا خاصا نمونہ کلام بھی دیا گیا ہے۔ حالانکہ کہیں کہیں نمونہ کلام کی طوالت گراں بھی گزرتی ہے۔ اس کتاب میں شامل تمام شعرا کو اعلیٰ درجے کا شاعر تو نہیں قرار دیا جا سکتا ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ اس فہرست کی مدد سے مستقبل میں کشمیری پنڈت شعرائے اردو و فارسی کی ادبی قدر و قیمت کا تعین آسان ہوگا۔ محققین کے لیے یہ کتاب نہایت مفید اور کارآمد ہے۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ قومی اردو کونسل کی اشاعت کا اپنا ایک معیار ہے۔ کاغذ، کتابت، طباعت اور اشاعت میں اس معیار کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ کتابوں کی اشاعت سے مالی منفعت مقصود نہیں ہے لہٰذا قیمت لاگت سے کم رکھی جاتی ہے۔ زیر تبصرہ کتاب بھی خوبصورت چھپی ہے، دیدہ زیب ہے اور قیمت نہایت مناسب ہے۔

تحقیق و تنقید

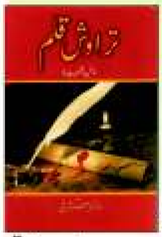

تراوش قلم

مصنف: ڈاکٹر معصوم شرقی

صفحات: 208، قیمت: 300/روپے

ناشر: ایم۔آر۔ پبلی کیشنز، دہلی

مبصر: ڈاکٹر محمد مقیم، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

ڈاکٹر معصوم شرقی اردو کے مصنفین میں ایک مشہور و معروف نام ہے۔ معصوم شرقی پیشۂ درس و تدریس سے وابستہ رہے اور 2008 میں شعبۂ اردو و فارسی حمایت الغربا ہائر سکنڈری اسکول کانکی نارہ سے سبکدوش ہوئے۔ اب تک ان کی پانچ تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں۔ ان کی تصنیفی زندگی کا آغاز تخلیق سے ہوتا ہے۔ معصوم شرقی کی پہلی کتاب 'عکس تاب' کے عنوان سے 2009 میں منظر عام پر آئی جو کہ ان کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ اس کے بعد نظیر ثانی اشک امرتسری۔ تعارف، تنقید اور تدوین کلام، 2012 میں، ادب جہاں (تنقید، تجزیہ اور تفہیم)، 2015، ادب و احتساب (تحقیقی، علمی، ادبی مضامین)، 2016 اور کلکتے کا ادبی ماحول: بیسویں صدی میں (تذکرہ)، 2016 میں زیور طباعت سے آراستہ ہوکر قبول عام کو پہنچ چکی ہیں۔ ان کتابوں میں نظیر ثانی اشک امرتسری موصوف کا تحقیقی مقالہ تھا۔ اس کتاب میں ایک طرح سے انھوں نے اشک امرتسری کی بازیافت کی ہے۔ بازیافت ان معنوں میں کہ کوئی نظیر ثانی بھی اردو ادب میں ہے، اس سے کم ہی لوگ واقف رہے ہوں گے، بالخصوص اردو کی دور دراز بستیوں میں۔ زیر تبصرہ کتاب 2017 میں منصۂ شہود پر آئی۔ ان معلومات کے ذکر سے اس بات پر توجہ دلانا مقصود ہے کہ معصوم شرقی جب تک درس و تدریس سے وابستہ رہے پوری تندہی سے اسی میں مگن رہے، 2008 میں وظیفہ یابی کے بعد، میدان تصنیف و تالیف میں قدم رکھنے کے بعد 2009 میں پہلی کتاب آئی، جس کا تعلق تخلیق سے ہے۔ اس کے بعد ہر دوسرے تیسرے سال ان کی کوئی نہ کوئی ادبی کاوش میدان علم و ادب کے کارزار کو گرماتی رہی ہے۔ اس سے ان کی فعالیت اور متحرک وجود کا پتہ ملتا ہے۔ وظیفہ یابی کے بعد اس طرح کی سرگرمی عموماً کم ہی دیکھنے میں آتی ہے۔ ان کتابوں کے ناموں اور ان کے مشمولات سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ معصوم شرقی کی نظر عام طور پر اردو کے تشنہ گوشوں یا گمنام یا کم معروف شخصیات ہوتی ہیں۔ کم معروف ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ جن کی شہرت نہ ہو وہ علم و ادب اور اپنے تحقیقی و تخلیقی کارناموں میں کچھ کم ہوتے ہیں۔ معصوم شرقی نے جس پر بھی کام کیا یا کچھ تحریر کیا وہ ایسی ہی شخصیات ہیں کہ جن سے علم و فن اور شعر و ادب کے قاری کی واقفیت ضروری ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ معصوم شرقی نے اس بات کو اپنا ادبی مشن بنالیا ہے کہ، وہ قاری کو ادب کے گمشدہ یا بے توجہی کے شکار سرمایے سے ضرور واقف کرائیں گے۔ ان کی یہ روش قابل تحسین ہے۔ زیر تبصرہ کتاب بھی ان کی ایسی ہی کاوش ہے۔

اس کتاب کے مشمولات پر نظر ڈالیں تو اس میں کل 23 مضامین شامل ہیں۔ اس کتاب کو انھوں نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ ان مشاہیر کے ذکر خیر پر مبنی ہے جو منتخب روزگار اور ممتاز تھے لیکن اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ دوسرے حصے میں ایسے ارباب علم و فضل شامل ہیں جو باحیات ہیں اور فکر و فن کے حوالے سے اعلیٰ و افضل مقام کے حامل ہیں۔ 'نذر الاسلام کی حیات معاشقہ' ایک دلچسپ اور معلوماتی مضمون ہے۔ بالخصوص ہم اردو والوں کے لیے، جو غیر بنگالی بھی ہیں نیز بنگالی زبان سے ناواقف بھی ہیں۔ ہم نے نذرل کو باغی کی حیثیت سے جانا ہے، لیکن اس معصوم شرقی نے ایک ایسے نذرل سے متعارف کرایا ہے جو ایک پرعزم باغی ہی نہیں بلکہ اپنے پیکر میں ایک نرم اور گداز دل بھی رکھتا ہے۔ نذرل کی اس شخصیت کا پہلو نرگس کے نام لکھے گئے خط میں اور بھی شدت کے ساتھ ابھرتا ہے۔ نذرل نے نرگس بیگم سے عشق کیا، عقد کیا لیکن رخصتی نہیں ہوسکی۔ یہ مضمون پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

کتاب کا پہلا مضمون ابراہیم ہوش کی شعری جہات پر نقد و نظر سے تعلق رکھتا ہے۔ ابراہیم ہوش شعر گوئی میں ترقی پسند نظریات سے سروکار رکھتے تھے۔ معصوم شرقی نے ابراہیم ہوش کی غزلیہ شاعری سے جو اشعار موقعے موقعے سے پیش کیے ہیں ان کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ معصوم شرقی نے غلط نہیں کہا:

''بنگال میں اردو شاعری کی تاریخ مرتب کرتے وقت ہوش کی خدمات سے صرف نظر کرنا ناممکن ہے۔ اردو کے ناقدین نے ان کی انفرادیت اور امتیازی خصوصیات پر توجہ نہیں دی، ان کو وہ مرتبہ نہیں مل سکا جس کے وہ مستحق تھے۔''

یہاں زیادہ گنجائش بھی نہیں اور اس کا محل بھی نہیں کہ ابراہیم ہوش کی انفرادیت اور امتیازی خصوصیات کے دعوے کو تقویت پہنچانے کے لیے خاطر خواہ اشعار پیش کیے جائیں۔ البتہ ایک دو اشعار کی گنجائش تو نکالی ہی جاسکتی ہے۔

یوں آئے ہیں اندھیرے اجالے کے بھیس میں
جیسے میں چہرہ صبح کا پہچانتا نہیں

یادوں نے لے لیا مجھے اپنے حصار میں
میرا وجود حافظہ بن کر سکڑ گیا

جیسا کہ گذشتہ سطور میں کہا گیا ہے، معصوم شرقی کی نگاہ کم معروف اور تشنہ گوشوں پر رہتی ہے، اس کتاب کے مشمولات سے بھی میرے عندیے کو تقویت ملتی ہے۔ چند قابل ذکر مضامین حسب ذیل ہیں۔

جرم محمد آبادی: شخصیت اور شاعری، ناقدوں کے مقتول: اشک امرتسری، غزل کا مزاج داں: اعزاز افضل، نئی حسیت کا تخلیق کار: نصر غزالی، کیا جنوں کر گیا شعور سے وہ، علقمہ شبلی: ایک عہد شناس شخصیت، قیصر شمیم کی شاعری 'سانس کی دھار' کے تناظر میں، نذیر احمد یوسفی: ایک حساس فنکار وغیرہ۔ کتاب کا آخری مضمون 'ایک یادگار مشاعرہ (1968)' ہے۔ یہ مضمون، 5/اکتوبر 1968 کو آفتاب اسپورٹنگ کلب، جگتدل شمالی 24 پرگنہ میں منعقد ہونے والے ایک طرحی مشاعرے کا آنکھوں دیکھا حال ہے۔ معصوم شرقی اس مشاعرے کے کنوینر بھی تھے اور مجلس استقبالیہ کے رکن بھی تھے۔ دیکھا جائے تو معصوم شرقی نے اس کتاب میں بلکہ اپنی ہر تصنیف میں عموماً کلکتہ کی ادبی و تہذیبی تاریخ کو سمیٹنے یا رقم کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے شعرا پر جو مضامین لکھے اور اشعار کے انتخاب کی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ معصوم شرقی خود بھی غزل کے مزاج داں اور شعر و ادب کے سچے پارکھ ہیں۔ معصوم شرقی ایماندارانہ و غیر جانبدارانہ نقد و نظر کے لیے مبارک باد کے مستحق ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ان کی یہ تازہ کتاب اب تک ارباب سخن کے درمیان قبول عام کی منزلت کو پہنچ چکی ہوگی۔

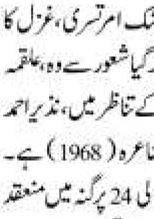

صلائے عام ہے

مصنف و ناشر: قاضی مشتاق احمد

صفحات: 160، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2019

مبصر: طارق سہراب غازی پوری، B-2، مجیب باغ، جامعہ ملیہ اسلامیہ جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی 110025

آج ادبی دنیا میں بے شمار کتابیں ہیں مگر یہ کہنا کہ تمام کتابیں ادب کی کسوٹی پر

کھری اترتی ہیں، کہیں نہ کہیں ان میں کچھ کمیاں رہ جاتی ہیں۔ تاہم کچھ کتابیں ایسی ہوتی ہیں جن میں کسی بھی طرح کی کوئی کمی نظر نہیں آتی اور جو اپنے لکھنے والوں کی حقیقتوں سے قارئین کو روشناس کراتی ہیں۔ زیرِنظر کتاب 'صلائے عام ہے' انہی چند کتابوں میں سے ایک ہے جس کے مصنف ادبی حلقے میں اپنا ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ قاضی مشتاق احمد کے ادبی سفر کا دائرہ انتہائی وسیع ہے۔ آپ نے اردو اصناف کے ہر گوشے کو قریب سے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی بلکہ اپنے قارئین کو ان سے روشناس بھی کرایا ہے۔

کتاب 'صلائے عام ہے' کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصنف قاضی مشتاق احمد نے اس کتاب میں تمام مضامین کو جس خوبصورتی کے ساتھ ترتیب دیا ہے بے حد معلوماتی ہیں۔

اس کتاب میں کل 12 مضامین ہیں اور ہر مضمون معنویت ومفہوم کے لحاظ سے ایک دوسرے سے جدا اور منور ہیں۔ مصنف قاضی مشتاق احمد نے معاصرین سمیت اردو داں طبقے کو اصناف اردو واردو کی ادبیات سے روشناس کرانے میں کافی آسانی پیدا کردی ہو۔

'اردو نعت گوئی، مثنوی سے جدید نظم تک' اس میں نعت گوئی کی حقیقت ظاہر کی گئی ہے۔ نعت کسے کہتے ہیں؟ مثنوی کیا ہے؟ نعتیہ رباعی، نعتیہ ترجیع بند وغیرہ میں آپسی فرق کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ ایسی صنفیں ہیں جن سے اردو کے بہت سے طلبا نابلد ہیں۔ نعتیہ مسدس، نعتیہ قصیدہ، نعتیہ جدید نظم وغیرہ عام طور پر انٹرویو میں پوچھے جانے والے سوالات ہیں لیکن ہم میں بہتیرے ایسے ہیں جنھیں ان اصناف سے واقفیت نہیں۔ لیکن اس باب میں وہ تمام تر جوابات ہیں جو طلبا کے لیے موثر ہیں۔

اسی طرح اس کتاب میں موجود دوسرا مضمون زیرِعنوان 'اردو: خوشبوؤں کی میر کارواں' انتہائی معلوماتی، موثر اور حقیقتوں پر مبنی مضمون ہے اس میں یہ بتانے کی سعی کی گئی ہے کہ گلشن اردو کی آبیاری کس نے کی اور کس طرح ہوئی؟

کتاب کے تیسرے مضمون کا عنوان ہے 'علامہ اقبال کی آفاقی شاعری' جس میں یہ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ شاعرِ مشرق ڈاکٹر علامہ اقبال کے تفکرات کا دائرہ کتنا وسیع تھا۔ اقبال کے آفاقی اشعار، ان کے افکار وخیالات، تفکرات ودوراندیشی کی جیتی جاگتی تصویر ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال کے آفاقی اشعار آج بھی قارئین کو جلا بخشتے ہیں۔

'علامہ اقبال کی آفاقی شاعری' کے بعد اردو کے معروف شاعر اسداللہ خاں غالب پر خامہ فرسائیاں ہیں۔ بعنوان غالب اسداللہ خاں قیامت ہیں جس میں غالب کی عظمت کا اظہار کیا گیا ہے۔ علاوہ اس کے دیگر مضامین کے عنوانات اس طرح ہیں:

اردو زبان میں خواتین کی شاعری، یہ تختیاں، یہ کتبے اردو منظوم ترجمے: سرسری جائزہ، اردو ماہیا نگاری، دلاور فگار: ہمہ جہت شخصیت، علامہ اقبال کے کلام پر پیروڈی، شوخیاں: رنگ ظرافت، مہاراشٹر میں معاصر اردو افسانہ۔

لیکن ان عنوانات کے تحت لکھے مضامین کی جو نمایاں خصوصیات ہیں وہ ان کی پرکشش ترتیب ہے جسے پڑھتے ہوئے قاری کے اندر ایک تجسس پیدا ہوتا ہے اور اس کی چاہت ہوتی ہے کہ مضامین کے اگلے حصے کو پڑھا جائے اس طرح اس کی چاشنی بڑھتی جاتی ہے اور وہ کتاب کے آخری حصے تک پہنچ جاتا ہے۔

اس کتاب کے صفحہ 121 پر مضمون بعنوان 'علامہ اقبال کے کلام پر پیروڈی' بہت ہی پرکشش ہے۔ ویسے تو سبھی پیروڈی ادبی دائرہ میں ذائقہ دار ہیں لیکن عنایت اللہ خان کی تحریر کردہ پیروڈی بھی اپنی مثال آپ ہے۔

مختصر یہ کہا جائے کہ کتاب ہر لحاظ سے اپنے قارئین کے لیے موثر اور سودمند ہے اور اس طرح سے اس میں جو بھی خامہ فرسائیاں ہیں یا ترتیب کے ساتھ مواد یکجا کیا جائے وہ کم ہے۔ کتاب کے مصنف کی ان کاوشوں کو بآسانی سمجھنے کے لیے آپ صفحہ 145 تا 154 اور پھر 159 تا 160 پر ضرور نگاہ ڈالیں۔ اس سے مصنف کی عظمت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

کتاب 'صلائے عام ہے' کی نمایاں خوبیوں کا راز صحیح معنوں میں اس کے مصنف قاضی مشتاق احمد کی اپنی ادبی نگارشات کی خوبیوں میں مضمر ہے جسے ادبی دنیا عرصۂ دراز تک اپنے ہمراہ رکھنے میں فخر محسوس کرتی رہے گی۔

فکر تونسوی: حیات و خدمات

مصنف: ڈاکٹر محمد ممتاز فرخ
صفحات: 160، قیمت: 250 روپے
ناشر: بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ 4
مبصر: ڈاکٹر ریحان احمد قادری، 'کاشانۂ فیض' محلہ سرائے ستار خان
پوسٹ: لہریا سرائے، دربھنگہ 846001 (بہار)

اردو طنز ومزاح نگاری میں فکر تونسوی کی خدمات قدر وتحسین کی مستحق ہیں۔ انھوں نے اردو طنز ومزاح نگاری کے ذریعے حقیقت نگاری کے آئینے میں زندگی کے مختلف عکس کو اجاگر کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا نام اردو طنز ومزاح نگاری میں قدر ومنزلت کا حامل ہے۔ البتہ افسوس کا مقام ہے کہ فکر تونسوی پر ان کے شایانِ شان کام نہیں ہوسکا۔ ڈاکٹر محمد ممتاز فرخ مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے فکر تونسوی کی جانب توجہ کی اور اس توجہ کے نتیجے میں زیرِنظر کتاب 'فکر تونسوی: حیات وخدمات' منظرِ عام پر آسکی۔

زیرِنظر کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے۔ ان ابواب کے علاوہ مصنف کا پیش لفظ بھی ہے جس میں انھوں نے فکر تونسوی کی خدمات کا تعارف پیش کرتے ہوئے کتاب کی غرض وغایت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ پیش لفظ کے علاوہ پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کی تحریر 'گفتنی' پروفیسر علی احمد فاطمی کا اظہارِ خیال 'طنز ومزاح پر ایک وقیع مقالہ' اور ڈاکٹر ظفر کمالی کی کسی قدر تفصیلی تحریر 'ممتاز فرخ نجمی اور ان کی یہ کتاب' شامل ہے۔ ان تمام مضامین سے فکر تونسوی کا ادبی اعتراف سامنے آتا ہے اور کتاب کی افادیت مزید اجاگر ہوتی ہے۔ دونوں فلیپ پر عطا عابدی کی رائے بھی مصنف اور کتاب کے حوالے سے مفید پہلو پیش کرتی ہے۔

کتاب کا پہلا باب فکر تونسوی کی حیات وفن کا احاطہ کرتا ہے۔ قریب 40 صفحات پر مشتمل اس باب کا عنوان ہے 'فکر تونسوی۔ شخصی فنی تعارف' جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے، مصنف نے اس باب کے ذریعے نہ صرف فکر تونسوی کی حیات وشخصیت کا تعارف تفصیل سے پیش کیا ہے اور کئی حوالوں سے اپنی بات واضح کرنے کی کوشش کی ہے بلکہ ان کے فن کا تعارف بھی سلیقے سے پیش کرنے کے پہلوؤں کو برتا گیا ہے۔ فکر تونسوی کے اندازِ فکر اور ان کی وسیع المشربی اور روشن خیالی کو سمجھنے کے لیے مصنف نے فکر تونسوی کے خاندانی ماحول اور اس کے پس منظر کا احاطہ کرنا ضروری سمجھا ہے۔ فکر تونسوی کے فن کے ضمن میں مصنف نے فکر تونسوی کی شاعری کا بھی تعارف وذکر کیا ہے جو ضروری بھی تھا۔ فکر تونسوی کے مزاج ورویے کو اجاگر کرتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں: ''فکر تونسوی روایت پرستی اور اندھی تقلید کو کہیں بھی اور کسی بھی صورت میں گوارا نہیں کرتے بلکہ وہ اپنے طور پر مذہبی باتوں کی بھی ترجمانی کرتے ہیں اور اسے نیا رنگ روپ دیتے ہیں۔'' (ص 59)

صاحبِ کتاب نے جہاں فکر تونسوی کو صاحبِ اسلوب شاعر قرار دیا ہے، اور اس کا دفاع کیا ہے وہیں ان کے ڈرامے، طنزیہ ناول، روزنامچہ، تنقیدی مضامین، تصانیف کا ذکر بھی موثر انداز میں کیا ہے۔

دوسرا باب 'اردو طنز و مزاح نگاری کا مختصر جائزہ' ہے۔ اس باب کے ذریعے مصنف نے طنز و مزاح کی مختصر تعریف پر نظر ڈالتے ہوئے اس کے ارتقائی احوال پر بھی روشنی ڈالی ہے اور اس نتیجے تک پہنچے ہیں کہ ''اردو طنز و مزاح نگاروں کا قافلہ آگے بڑھتا رہا ہے اور یہ فن ترقی پذیر ہے۔''

تیسرے باب کا عنوان ہے 'فکر تونسوی کی خدمات (طنز و مزاح نگاری کے حوالے سے)' اس باب کو کلیدی باب بھی کہا جا سکتا ہے کیونکہ فکر تونسوی کی بڑی پہچان طنز و مزاح نگاری کے حوالے سے ہوتی ہے۔ اس باب میں فکر تونسوی کی شاعری بھی زیر بحث آئی ہے۔ شاعری کا حصہ الگ باب میں پیش کیا جاتا تو زیادہ بہتر تھا کیونکہ اس کا تعلق طنز و مزاح سے براہ راست نہیں ہے۔ بہر کیف یہ حصہ معلومات ہے اور فکر کی شاعری کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے۔ طنزیہ و مزاحیہ تحریروں کو بطور نمونہ پیش کرتے ہوئے مصنف کتاب کا خیال ہے کہ توازن اور صبر و ضبط کا یہ انداز فکر تونسوی کا حصہ ہے۔ مصنف کا مطالعہ ہے کہ فکر کے طنز و مزاح کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ کسی بھی واقعہ کی روح سے متاثر ہو کر اسے صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دیتے ہیں۔ امر واقعہ یہی ہے کہ فکر تونسوی کسی واقعہ کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ یہ بیان شروع سے آخر تک طنز و مزاح کا نمونہ بن کر اجاگر ہوتا ہے۔ فکر تونسوی کے طنز و مزاح کی کئی خصوصیات ہیں۔ مصنف نے بڑی حد تک ان خصوصیات کا احاطہ کیا ہے۔ دوسرے طنز و مزاح نگاروں کے درمیان فکر تونسوی کے فن کی معنویت کے تعلق سے مصنف کے مطالعے کا حاصل یوں سامنے آتا ہے:

''وہ صرف اپنی ذات اور اپنی بیوی کی ذات کے دائرہ میں محسوس نہیں رہتے بلکہ ان سے باہر نکل کر ارد گرد پھیلے ماحول، معاشرتی تضادات اور ان تضادات سے جنم لینے والی ان تلخیوں کو اپنا موضوع بناتے ہیں جو فرد کی زندگی میں زہر گھول دیتی ہیں۔'' (ص 152)

آخری باب کے ذریعے مصنف نے اردو طنز و مزاح نگاری میں فکر تونسوی کے مقام کے تعین کی اپنی سی کوشش کی ہے۔ صرف سات صفحات پر مشتمل یہ باب اختصار اور جامعیت کا نمونہ ہے۔ زیر نظر باب کا آخری جملہ دیکھیں جس کے بعد فکر تونسوی کے مقام کا تعین آسان ہو جاتا ہے: ''ان کے فن میں چنگاریاں ہی چنگاریاں ہیں جس پر آتے جاتے موسموں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔'' (ص 160)

اس طرح یہ کتاب فکر تونسوی کے حوالے سے دستاویزی اہمیت رکھتی ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے تاکہ ہمیں خصوصاً نئی نسل کو یہ معلوم ہو کہ اردو طنز و مزاح نگاری کے میدان میں کیسے کیسے لعل و گہر ہمارے درمیان رہے ہیں اور انھوں نے ادبی و فنی خدمات کے ذریعے سماج و زندگی کے کن کن مراحل سے واقفیت کرائی۔

خودنوشت

کچھ یادیں کچھ باتیں

(خودنوشت سوانح اختر حسن)

مرتب: ڈاکٹر محمد شجاعت علی راشد

صفحات: 195، قیمت: 400 روپے، سنہ اشاعت: 2019

ناشر: تنویر پبلشرز، حیدرآباد، تلنگانہ

مبصر: ڈاکٹر ناظم علی، مکان نمبر 17-7-335، برہمن واڑی، یاقوت پورہ، حیدرآباد، تلنگانہ

اس کتاب کا انتساب اختر حسن کے نام ہے جو آج بھی ان کی یادوں کو اپنی زندگی کا ایک اٹوٹ حصہ سمجھتے ہیں۔ پدم شری مجتبیٰ حسین اختر حسن، اختر حسن بہ یک نظر پروفیسر فاطمہ بیگم پروین، عرض مرتب ڈاکٹر محمد شجاعت علی راشد۔ اختر حسن کے مضامین اس طرح سے ہیں:

موہان، پیدائش، ابتدائی زندگی، تعلیم اور بچپن، لڑکپن کو پیش کیا ہے۔ بچپن اور تعلیم میں تمام بچپن کی تفصیلات پیش کی گئی ہیں۔ رضا کار تحریک میں اس کے اسباب و محرکات اور رول پر روشنی پڑتی ہے۔ تلنگانہ تحریک میں 1969 اور اس سے پہلے علاحدہ تلنگانہ کے تصورات سے بحث کی گئی ہے اور تحریک کے کردار کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ مختلف کام اور نئے تجربے کو اجاگر کیا ہے۔ بلٹز اور پیام کی ادارت و مضامین کا جائزہ لیا ہے۔ شخصیتیں جن سے متاثر ہیں اور جنھوں نے متاثر کیا ہے ان کا تعارف و کارنامے بیان کیے ہیں۔ کچھ یادگار ملاقاتیں ہیں جن میں بااثر بڑی شخصیتوں سے ملاقات ہوئی ان کی تصاویر اور تفصیلات پیش کی ہیں۔ کتاب اختر حسن شناسی اختر حسن فہمی میں مدد و معاون ثابت ہوتی ہیں۔ پدم شری مجتبیٰ حسین نے اختر حسن سے وابستہ یادوں کو پیش کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ خواتین میں پتی ورتا تو ہمارے سماج میں عام سی بات ہے لیکن مردوں میں پتنی ورتا کی جھلک میں نے اختر بھائی میں ہی دیکھی۔ سچ تو یہ ہے کہ اختر بھائی کی طرح سگھڑ اور سلیقہ مند شوہر میں نے بہت کم دیکھے ہیں۔ اختر حسن نے مختلف سرکاری محکموں میں خدمات انجام دی ہیں۔ پیام کے مدیر رہے ادارت کے فرائض انجام دیے ہیں۔ لیجسلیٹو کونسل کے رکن، سالار جنگ میوزیم کے ریسرچ اسکالر، لکچرار، ہفتہ وار اور بلٹز کے ایڈیٹر، محکمۂ اطلاعات کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر اور اردو اکادمی کے اسسٹنٹ سکریٹری کے روپ میں دیکھا ہے۔

پروفیسر فاطمہ بیگم پروین کہتی ہیں کہ اختر حسن کی ولادت 24 جون 1912 کو ہوئی اور یہیں ان کی تعلیم و تربیت کا آغاز ہوا۔ جامعہ عثمانیہ سے 1937 میں فارسی ادب سے ایم اے کیا۔ اختر حسن کا شمار ترقی پسند تحریک کے ابتدائی کارگزاروں میں ہوتا ہے۔ اس کی داغ بیل کے ساتھ ہی آپ اس تحریک سے وابستہ ہوئے اسے پروان چڑھانے میں اپنی تمام صلاحیتوں کا استعمال کیا۔ قید و بند کی مصیبتوں کو برداشت کیا۔ وہ فیض احمد فیض، مخدوم محی الدین، سردار جعفری، کیفی اعظمی اور کرشن چندر کے ساتھ اور ہم عصر تھے۔ مرزا غالب کی فارسی مثنوی چراغ دیر کا منظوم ترجمہ کیا جو تخلیقیت کا انداز رکھتا ہے۔

میں وہ موتی ہوں جو اپنے سمندر سے بچھڑ جائے
وہ جوہر ہوں جو مثل گرد آئینہ سے جھڑ جائے

اختر حسن نے 1939 سے 1946 تک ورنگل کالج عثمانیہ یونیورسٹی میں بطور لکچرار کام کیا ہے۔ 1946 سے 1957 تک مالک و ایڈیٹر روزنامہ پیام رہے۔ حیدرآباد لیجسلیٹو اسمبلی کے رکن کی حیثیت سے 1953 سے 1956 تک خدمات انجام دیں۔ 1953 سے 1957 تک عثمانیہ یونیورسٹی کے سینٹ ممبر رہے، رکن بورڈ آف جرنلزم عثمانیہ یونیورسٹی کے طور پر 55-1954 میں شعبہ صحافت عثمانیہ یونیورسٹی سے منسلک رہے، اردو صحافت کی تاریخ پر بارہ توسیعی لکچر دیے۔ ریسرچ اسسٹنٹ سالار جنگ لائبریری کے طور پر 60-1957 تک ایک ہزار فارسی مخطوطات کی توضیح مرتب کی ہے۔ 1961 سے 1966 تک لکچرار اردو انوار العلوم کالج حیدرآباد میں خدمات انجام دی ہیں۔ 1967 سے 1970 تک ایڈیٹر اور پھر بمبئی کے طور پر اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ 1970 اسسٹنٹ ڈائرکٹر اردو محکمہ اطلاعات تعلقات عامہ آندھرا پردیش فرائض انجام دیے۔ اردو اکادمی آندھرا پردیش کے ڈپٹی ڈائرکٹر ہیں۔ آپ کی شعری و نثری نگارشات ہندوستان کے مشہور ادبی رسائل و جرائد اور اخبارات میں شائع ہوئیں جدید فکر و عصری، ادبی رجحانات 1982 خطبہ شائع ہوا۔

نقد و نظر، دسمبر 1984

حسرت موہانی حیات اور کارنامے

عرض مرتب میں شجاعت علی راشد لکھتے ہیں، موہان اتر پردیش میں کانپور اور لکھنؤ کے درمیان قائم بستی جو سون ندی کے کنارے آباد ہے اس سرزمین سے تعلق رکھنے

والے سید سلطان حسن کے خاندان کے چشم و چراغ سید اکبر حسن کے فرزند اختر حسن 24 جون 1912 کو نظام آباد کے ایک سرکاری دواخانے میں پیدا ہوئے۔ بڑی ہمشیرہ جمال النسا کے علاوہ ان کی دو اور بہنیں رضیہ اور رابعہ ہیں۔ اس کتاب سے حیدرآباد کی سیاسی، سماجی، ثقافتی، ادبی، صحافتی تاریخ اور حالات و کوائف کا صحیح اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ پولس ایکشن کے بعد ہنداور حیدرآباد کے حالات پر روشنی پڑتی ہے اور ایک شخص کے اتنے کارنامے نئی نسل کے لیے مشعل راہ قابل تقلید ہیں۔ اختر حسن نے تحریک اور تنظموں سے وابستہ رہ کر بڑے بڑے کام انجام دیے ہیں۔ اختر حسن اور پیام پر Ph.D کی جاسکتی ہے۔ انھوں نے صحافت کو ایک مقصد اور Vison کے طور پر استعمال کیا ہے۔

خاکے

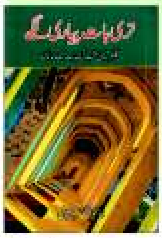

تری بات پیاری لگے

(گلبرگہ کی منتخب شخصیات کے خاکے)

مرتب و ناشر: ڈاکٹر غضنفر اقبال

صفحات: 168، قیمت: 150 روپے، سنہ اشاعت: 2019

مبصر: ظہیر احسان، 3370/6A ذاکر نگر اوکھلائی دہلی 25

ڈاکٹر غضنفر اقبال گلبرگہ کے ایک علمی خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اردو دنیا میں خود کو ایک نقاد اور ادیب کی حیثیت سے متعارف کرا چکے ہیں۔ درجن بھر کتابوں کے مصنف و مؤلف ہیں۔ 2012 میں ساہتیہ اکادمی کی طرف سے اپنے انشائیوں کے مجموعے 'معنی مضمون' پر 'یووا پرسکار' سے بھی نوازے جاچکے ہیں۔ ان کا اصل فن فکشن اور اس کی تحقیق و تنقید ہے لیکن وہ شاعری سے بھی شغف رکھتے ہیں اور اردو میڈیا پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔ ان کے تنقیدی، تحقیقی اور تجزیاتی مضامین ملک بھر کے معتبر رسالوں میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

حال ہی میں ان کی ایک کتاب 'تری بات پیاری لگے' منظر عام پر آئی ہے۔ جو ان نامورانِ گلبرگہ کے خاکوں کا مجموعہ ہے جنھوں نے اپنی تخلیقات اور کارناموں کے ذریعے ادب، تعلیم، صحافت اور فن مصوری کے افق کو روشن کیا ہے اور وہ خود اس افق کے آفتاب و ماہتاب ہیں۔ ڈاکٹر غضنفر اقبال نے اپنی اس تصنیف میں گلبرگہ کی پچیس منتخب ہستیوں کو شامل کیا ہے۔ تسوید و تدوین کے لیے انہوں نے جو شرائط مقرر کیے ہیں وہ یہ ہیں کہ جس شخصیت پر خاکہ لکھا گیا ہے وہ اس شہر یعنی گلبرگہ سے مادری نسبت رکھتا ہو اور خاکہ نگار کے لیے اردو کا قلم کار ہونا ضروری ہے۔

اس کتاب میں جن لوگوں کے خاکے شامل ہیں ان کے نام کچھ اس طرح ہیں۔ حمید الماس، ڈاکٹر طیب انصاری، خمار قریشی، تنہا تماپوری، ڈاکٹر صغریٰ عالم، نصیر احمد نصیر، مسعود عبدالخالق، ڈاکٹر مجتبیٰ حسین، ڈاکٹر وہاب عندلیب، پروفیسر حمید سہروردی، حامد اکمل، پروفیسر خالد سعید، منظور وقار، ڈاکٹر رزاق اثر، پروفیسر محمد عبدالحمید اکبر، ڈاکٹر انیس صدیقی، عزیز اللہ سرمست، ڈاکٹر کوثر پروین، ڈاکٹر حشمت فاتحہ خانی، پروفیسر عبدالرب استاد، ولی احمد، اعجاز مصور، محمد ایاز الدین پٹیل، واجد اختر صدیقی، ڈاکٹر غضنفر اقبال۔ اور خاکہ نگاروں میں زبیر رضوی، قدیر زماں، رؤف صادق، ڈاکٹر فرزانہ فرح محتشم، ریحانہ بیگم ریحانہ، یوسف ناظم، ڈاکٹر فوزیہ چودھری وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اس کتاب میں ایک خاکہ 'کہانی مزاج کہانی زادہ' کے عنوان سے ہے، خاکہ نگار سردار سلیم صاحب خاکہ کے ڈاکٹریٹ کے مقالے کا ذکر کرتے ہوئے ان کی شخصیت پر ہلکی سی روشنی ڈالتے ہیں۔ کہتے ہیں ''اس مقالہ کی صحت سے اندازہ ہوتا ہے غضنفر کہانی مزاج ہے، ظاہر ہے اصل میں وہ کہانی زادہ ہی تو ہے پروفیسر حمید سہروردی کے پالنے میں اس نے کہانیاں جھولی ہیں کہانیاں فسی ہیں اور کہانیاں ہی جی ہیں، اس لیے اس کا ذوق فطری ذوق ہے، شاعری غضنفر کی معشوق ثانی ہے، قلم ان کی انگلیوں کی گرفت میں ایسے سما گیا ہے جیسے قلم نہ ہو ان کے جسم کا ایک انگ ہو اور کیوں نہ ہو غضنفر اقبال کا بچپن کھلونوں سے زیادہ قرطاس و قلم سے کھیل کر جوانی کی دہلیز تک پہنچا ہے" یہ خاکہ اس کتاب کے مرتب ڈاکٹر غضنفر اقبال کا ہے، اس اقتباس سے ان کی شخصیت کا ایک اہم پہلو ہمارے سامنے مکمل طور پر منکشف ہو جاتا ہے اور ان کی ادب سے دلچسپی و رغبت کے ساتھ ساتھ ان کے مقام و مرتبے کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

خاکہ نگاری ایک مستحکم فن ہے، اور کسی بھی فنکار کے لیے اس فن کے عیوب و محاسن سے واقفیت ضروری ہے، وہ اس فن کی باریکیوں سے جس قدر آگاہ ہوگا اس کی تخلیق اتنی ہی جاندار اور رنگارنگ نظر آئے گی۔

اس کتاب میں شامل تمام خاکے خاکہ نما، تعارفی، سرسری، تاثراتی، توصیفی اور معلوماتی ہیں۔ تمام خاکے مختلف و متنوع ہیں، اور فن کے بیشتر محاسن کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔ خاکہ نگاران نے صاحب خاکہ کی اچھا و برا، خوبی اور خامی کو دل کھول کر بڑی سلیقہ مندی سے اپنے لفظوں میں ڈھالا ہے۔ جب آپ اس کتاب کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو خاکہ نگاروں کی پختہ کاری کا اندازہ ہوگا۔

رؤف صادق ڈاکٹر غضنفر اقبال کے والد گرامی کی قلمی تصویر کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں ''شام کی اترتی ہوئی نرم دھوپ دروازے کے ہلتے ہوئے پٹوں سے کھیل رہی تھی اور کھڑکی کے پردے سے چھن چھن کر میز پر رکھی ہوئی کتابوں کے چہرے روشن کر رہی تھی، معروف قانون داں ایڈووکیٹ خواجہ منظور الدین کسی قانونی کتاب میں نقطہ تلاش کر رہے تھے، میں ان کے وکالت خانے 'الفاروق' میں خاموش بیٹھا میگزین کے اوراق الٹ پلٹ کر رہا تھا۔ اتنے میں ایک خوش لباس ہشاش بشاش شخص جس کا گندمی رنگ، متین چہرہ، کشادہ پیشانی، بڑی بڑی آنکھوں میں عقابی چمک، گھنے سیاہ لمبے بال، سلام کرتے ہوئے کمرے میں داخل ہوا۔ عطر کی فرحت بخش خوشبو چاروں طرف پھیل گئی۔'' مذکورہ بالا سطور میں تصویر کشی کے ساتھ ساتھ منظر نگاری بھی خوب ہے۔ آپ کو یہی انداز بیان اور تسلسل تمام خاکوں میں نہیں تو اکثر میں ضرور ملے گا اور صاحب خاکہ کو ہر زاویے سے متعارف کرائے گا۔

ڈاکٹر غضنفر اقبال قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے ایک علاقے کی نامی گرامی ہستیوں کو ایک ساتھ مختصراً ہی سہی یکجا کر کے ایک اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ یہ اپنی نوعیت کی ایک مختلف اور کافی اہمیت کی حامل کتاب ہے اور اردو لائبریریوں کے لیے ایک بیش قیمت تحفہ ہے۔ امید ہے کہ اس کی اہمیت کے ہی شایان شان اس کی پذیرائی بھی ہوگی اور قبولیت عام حاصل ہوگی۔

تراجم

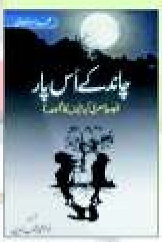

چاند کے اس پار (جدید مصری کہانیوں کا مجموعہ)

مترجم: ڈاکٹر محمد قطب الدین

صفحات: 134، قیمت: 350 روپے، سنہ اشاعت: 2019

ناشر: عذرا بک ٹریڈرس، دریا گنج دہلی

مبصر: سلمان عبدالصمد، N-106 فرسٹ فلور، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی

قانونی اور صحافتی چیزوں کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنے کے تقاضے الگ ہیں اور تخلیقات کے تراجم کا معاملہ اس سے برعکس۔ تخلیقات کے تراجم میں ابہام و ترسیل کو پیش نظر رکھنا لازمی ہے۔ ان کے علاوہ تہذیبی فضا کی منتقلی کا مسئلہ بھی درپیش

ہوتا ہے۔ گویا ادبیات کے مترجم کے لیے نہ صرف دو زبانوں کا علم رکھنا ضروری ہے، بلکہ تہذیبی سیاق کو اجاگر کرنے کی ہنرمندی سے مالا مال ہونا بھی لازمی ہے۔ 'چاند کے اُس پار' میں شامل کہانیوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر قطب الدین جہاں زبان کی باریکیوں سے آگاہ ہیں، وہیں تراجم کے تقاضوں سے بھی بہرہ ور ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے عربی کے مشہور تخلیق کار محمد سلماوی کے افسانوی مجموعے 'ماوراء القمر' کو سلیس اردو میں منتقل کیا۔

ڈاکٹر قطب الدین بنیادی طور پر مترجم نہیں۔ جواہر لال نہرو یونی ورسٹی دہلی کے مرکز برائے عربی و افریقی مطالعات میں بطور اسی ایٹ پروفیسر درس و تدریس کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ وہ تدریسی معاملات میں سرگرم رہنے کے ساتھ ساتھ انتظامی امور میں بھی فعال رہتے ہیں۔ ان کے علاوہ عربی زبان و ادب اور اسلامی علوم و فنون پر سنجیدگی سے لکھتے پڑھتے ہیں۔ دو کتابوں کے علاوہ مختلف رسائل و جرائد میں ان کے درجنوں مضامین شائع ہوئے۔ حکومت ہند کے تحت نکلنے والے رسالے 'ثقافة الهند' کے وہ نائب مدیر رہ چکے ہیں۔ پیش نظر کتاب ''چاند کے اس پار'' سے پہلے انھوں نے محمد سلماوی کے ناول ''اجنحة الفراشة'' کا بھی اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ اس ناول کی اشاعت کے بعد ڈاکٹر قطب الدین کی کاوش کی ستائش کی گئی۔

اس مجموعے 'چاند کے اس پار' میں شامل 9 افسانوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ محمد سلماوی کی تخلیقات میں سوانحی تناظرات اور صحافتی تاثرات کا احساس زیادہ بسا ہوا ہے۔ وہ تخیلاتی پرواز کے سہارے بہت پیچھے نہیں جاتے اور نہ ہی ماضی پرستی کا ثبوت دیتے ہیں۔ موجودہ حالات کا جائزہ لیتے ہوئے انھیں ماضی میں بس جھانکنا گوارا ہے اور مستقبل کی طرف لطیف اشارے کرنا پسند ہے۔ ان کے افسانوں کا مرکزی نقطہ حال ہے۔ گویا وہ حال کے معاملات کو تخلیقی دستاویز بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان افسانوں میں عالم اسلام کے سلگتے مسائل اور عالمی سیاست کی دھماچوکڑی کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے ایسے مسائل کو ابھارنے کے لیے تخلیق کار کو کئی سطح پر محتاط رہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ محمد سلماوی نے اپنے افسانوں میں یہ بھرپور کوشش کی کہ صحافتی بیانیے سے ان کا تخلیقی بیانیہ ممتاز رہے۔ امید ایسی ہے کہ گزرتے دنوں کے ساتھ ان کے افسانوں کی حیثیت مزید دستاویزی ہوتی چلی جائے گی۔

گلابلائزیشن کے اس عہد میں موضوعاتی سطح پر مختلف زبانوں کی تخلیقات تقریباً ایک جیسی ہیں۔ محمد سلماوی کے ان افسانوں کا اگر اردو کے دیگر افسانوں سے موازنہ کریں تو بہت سی مماثلتیں نظر آئیں گی۔ کیونکہ اردو کے افسانوں میں بھی ماضی پرستی کا اب کوئی گہرا رنگ نظر نہیں آتا۔ بیسویں صدی کے اختتام تک تقسیم ہند کا اثر دکھتا تھا، مگر اس کے بعد اردو کے افسانہ نگاروں کے یہاں بھی تنظیمی طور پر عالمی مسائل جگہ پانے لگے، یعنی عالمی سیاست کی دھماچوکڑی۔ تہذیبی اظہار اور اس کے پیش کرنے کا نیا انداز۔ عصر حاضر کا نوحہ۔ محمد سلماوی کے یہاں بھی مذکورہ باتوں کی عکاسی صاف انداز میں ہوتی ہے۔ حال کی کربناکی، حالات کی خستہ حالی اور مصری سیاست کی اتھل پتھل واضح ہوتی ہے۔ ساتھ ہی بے روزگاری اور دہشت گردانہ تناظر بھی ابھرتا ہے۔ بالکل اسی طرح اردو کے تخلیق کاروں کے یہاں رنگارنگی نظر آتی ہے۔

اس تبصرے میں نہ تمام افسانوں کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی سب کو حوالے کے طور پر پیش کیا جانا ممکن ہے۔ البتہ یہاں دو تین کہانیوں کا خصوصی ذکر کیا جا رہا ہے۔ مجموعے کا آخری افسانہ ''آپ کی خیرت مطلوب ہے'' ہے، جس میں افسانہ نگار نے اخوانیوں کے بڑھتے اقدامات کو تخلیقی انداز میں پیش کیا ہے۔ ساتھ ہی مصر کی وہ خوفناک صورت حال بھی ہے جس میں ممتا اور بچہ سہما سہما نظر آتا ہے۔ زندگی کی گتھیاں پر پیچ نظر آتی ہیں اور معاشی بدحالی کے خوفناک سایے مزید خوفناک ہو جاتے ہیں۔ 'سمندر کا لہو' میں سفرنامے کا احساس ہوتا ہے اور بے روزگاری کے معاملات بھی۔ اس کے علاوہ 'سیاہ گھوڑے' میں ایک رائٹر کی خودکشی کی داستان ہے۔ ان تمام افسانوں میں تخیلات کے اثرات بہت کم نظر آتے ہیں بلکہ رپورتاژ اور سفرنامے کا احساس زیادہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ان افسانوں میں مکالمے بھی بہت کم ہیں۔

الغرض ڈاکٹر قطب الدین نے عربی کے ایک ایسے افسانوی مجموعے کو اردو کا جامہ پہنایا جس میں عالم اسلام کی دھندلی دھندلی تمام تر تصاویر موجود ہیں۔ ساتھ ہی ان ترجمہ شدہ کہانیوں سے عربی تخلیقات کی سمت و رفتار اور منہاج و معیار سے بھی کسی حد تک آگاہی ہو جاتی ہے۔ اس ترجمے کی کئی خوبیاں ہیں۔ اول، زبان میں بسا ہوا تخلیقی احساس۔ دوم، پوری کہانی میں تہذیبی سیاق۔ سوم، چست درست ترسیلی نظام۔ چہارم، سلیس اردو میں جملوں کی مضبوط ساخت۔ اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر قطب الدین عربی اور اردو زبان کے تقاضوں سے واقف ہیں۔ ساتھ ہی تخلیقی معاملات ان کے مزاج کا حصہ ہے اور تہذیب کی منتقلی کے تناظر میں بھی وہ قابل اعتماد ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ترجمے کی زبان میں تخلیقی اُبال کا احساس ہر جگہ موجود ہے۔ خدا کرے ان کی یہ کاوش اردو کے قارئین کے لیے بیش قیمت سوغات ثابت ہو۔

باہم دگری (ہندی کہانیوں کے تراجم)

مترجم: عبدالباری ایم۔ کے

صفحات: 184، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: اگست 2019

ناشر: نیوز ٹاؤن پبلشرز، ممبئی

مبصر: راکیش کمار بھارتی، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

زیر نظر عبدالباری ایم۔ کے صاحب کی کتاب 'باہم دگری' ہندی کی تیرہ ایسی کہانیوں کا انتخاب کر کے اردو کے قالب میں ڈھالنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ جس موضوع پر اردو افسانہ نگاروں نے قلم اٹھایا ہی نہیں یا بہت کم لکھا ہے۔ 184 صفحات کی اس کتاب میں شامل کہانیاں آج کے حالات اور واقعات کا بخوبی احاطہ کرتی ہوئی نظر آتی ہیں اور تیز رفتار زندگی کی حقیقی تصویر قاری کے سامنے پیش کرتی ہیں۔

اس کتاب میں شامل پہلی کہانی 'سانپ' کے عنوان سے درج ہے جسے مشہور کہانی کار جتیندر نے لکھا ہے۔ اس کہانی کے ذریعے کہانی کار یہ کہنا چاہتا ہے کہ اس زمین پر خدا (قدرت) نے جو بھی مخلوق پیدا کی ہے وہ مصلحت سے خالی نہیں ہے۔ اس بات کو انھوں نے کہانی میں سانپ کو علامت بنا کر کہنے کی کوشش کی ہے۔ قدرت نے اس کو زہر عطا کر کے اسے انفرادیت بخشا ہے اور یہی اس کی طاقت بھی ہے۔ لیکن جب اس کے دانت سے زہر نکال دیا جاتا ہے تو اس کی انفرادیت ختم ہو جاتی ہے۔ اور ایسے میں جو لوگ اس سے خوف زدہ ہوا کرتے تھے اب اس کا تماشا بنانے لگتے ہیں۔ اس کہانی کے ذریعے اس بات کا علم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ بھی ہمیں عطا کیا ہے یہی اس کی شناخت ہے کیونکہ کائنات کی ہر شے اپنی خصوصیات سے ہی جانی پہچانی جاتی ہے۔

دوسری کہانی رام دھاری سنگھ دیواکر کی 'رنڈیاں' ہے۔ عنوان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرکزی خیال بدکردار اور فاحشہ عورتیں ہیں لیکن ایسا نہیں ہے بلکہ وہ عورتیں ہیں جو پنچایت اور رودھان سبھا چناؤ کی امیدوار ہیں۔ جب یہ چناؤ پرچار کے لیے ایک ٹولہ سے دوسرے ٹولہ، ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں کو جاتی ہیں تو انہیں بے شرم، بے حیا اور رنڈی جیسی بھدی گالیاں دی جاتی ہیں۔

'بھولا رام کی روح' تیسری کہانی ہے جسے ہندی کے معروف کہانی کار ہری شنکر پرسائی نے لکھا ہے۔ اس کہانی میں انھوں نے سرکاری دفتروں کے ملازمین کے رُخ سے جھوٹ، فریب اور مکاری کا نقاب ہٹا کر اصل چہرہ دکھانے کی کوشش کی ہے۔ ایک شخص جو چالیس برس تک سرکاری دفتر میں کام کرنے کے بعد بھی اپنی پینشن حاصل کرنے میں ناکام ہے جس کے بچے دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانے کو مجبور ہیں۔ بدعنوانی کی اس سے اچھی مثال اور کہاں ہوسکتی ہے جہاں ہر شعبے میں آزادانہ طور پر چوری چکاری اور رشوت کا لین دین سرِ عام چل رہا ہو۔

چوتھی کہانی 'اپنا راستہ لو بابا' ہندی کے مایہ ناز و معتبر کہانی کار کاشی ناتھ سنگھ کی ہے۔ اس کہانی کے ذریعے اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ کس طرح سے گاؤں کے لوگ شہر میں آنے کے بعد اپنے پرانے خون کے رشتوں کو بھول جاتے ہیں اور شہر والوں کے فریب کو حقیقت سمجھتے ہوئے ان کی عزت اور احترام کرتے ہیں۔ ان کی باتوں پر اعتماد کرتے ہیں۔ یہ کہانی گاؤں اور شہر کی طرزِ زندگی پر گہری تنقید کرتی ہے۔

پانچویں کہانی 'چک بندی' ہے جس کو موہن لال یادو نے تحریر کیا ہے۔ اس کہانی کے توسط سے یہ بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ کس طرح سے چک بندی کے نام پر لیکھ پال اور گاؤں کے پردھان رشوت لیتے ہیں اور گاؤں کے معصوم لوگوں کے ساتھ دھوکہ کرتے ہیں۔ یہ کہانی شعبۂ چک بندی کی بے ایمانی اور دغا بازی کی حقیقت کو بیان کرتی ہے۔ اسی طرح کی ایک کہانی 'اگھوری' ہے جس کے تخلیق کار کملیش ہیں۔ یہ ایک پاکھنڈی بابا کی کہانی ہے۔ ساتویں کہانی 'بیڑی' ہے جو مشہور کہانی کار منوہر کاجل کی ہے۔ اس کہانی میں چھوٹے بڑے، اونچ نیچ، ذات پات، کالے گورے کے بھید بھاؤ کو بہت ہی خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ کہانی کار کا ماننا ہے کہ یہ فرق اور بھید بھاؤ صرف دن کے اجالے میں ہوتا ہے اور جیسے ہی رات کا اندھیرا ہوا یہ فرق ختم ہوجاتا ہے۔ اس کہانی کے ذریعے سماج کے فرسودہ ریت رواج پر زبردست چوٹ کی گئی ہے۔

'چیخ' اس کتاب میں آٹھویں نمبر کی کہانی ہے جس کے خالق رمیش اپادھیائے ہیں۔ ایک ایسے گھر کی کہانی ہے جس میں گھر کے مالک شیکھر کا دیرا اور قابلِ اعتماد دوست کمار صاحب کے ذریعے شیکھر کی نوکرانی کاویری کی عصمت دری کی کوشش کی جاتی ہے۔ موجودہ سماج میں اس طرح کے معاملے اکثر دیکھنے کو ملتے رہتے ہیں۔ اس کی وجہ سے اس کہانی کی معنویت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

ہیمنت کمار کی تحریر کردہ کہانی 'گلچی' اس مجموعے کی نویں کہانی ہے۔ یہ کہانی گاؤں میں ہونے والے پردھانی کے چناؤ کو مدِ نظر رکھ کر لکھی گئی ہے۔ موجودہ زمانے میں پردھانی کے چناؤ میں جیت حاصل کرنے کے لیے کس کس طرح کے ہتھکنڈے اپنائے جاتے ہیں اور کس طرح سے پوری انسانیت کو شرم سار کیا جاتا ہے۔ اس پر بخوبی روشنی پڑتی ہے جس کو ہیمنت کمار نے بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔

کتاب میں شامل دسویں اور گیارہویں کہانی 'ایک بلا ہوا آدمی' اور 'انڈین قافکا' ہندی کی جانی مانی کہانی کار ششانت سپریہ کی مشہور کہانیاں ہیں۔ یہ دونوں کہانیاں علامتی ہیں۔ کہانی کار نے اپنے تجربے کے ذریعے سے ہندوستانی سماج میں پیش آنے والے روز مرہ کے سماجی اور سیاسی واقعات کو خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ دوسری کہانی ایک نئے طرز کی کہانی ہے جو کسی جرمنی کہانی کار سے متاثر ہوکر لکھی گئی ہے۔ بارہویں کہانی 'ٹھور ٹھکانہ' ہندی کہانی کار دوّیا شکلا کی معروف اور مشہور کہانی ہے۔ یہ ایک نصیحت آمیز کہانی ہے۔ جو ہمیں اپنے بزرگوں کی عزت کرنا سکھاتی ہے۔ نہ صرف ہندوستان میں بلکہ دوسرے ممالک میں ضعیف اور بزرگوں کے ساتھ ان کی نالائق اولادیں جو سلوک کرتی ہیں ان کی بڑی خوبصورتی کے ساتھ تصویر کھینچی گئی ہے۔ تیرہویں اور آخری کہانی 'بڑی آنکھوں والی لڑکی' سبطین شہیدی کی انوکھی کہانی ہے۔ اس میں ایک جوان خوبصورت، بے سہارا اور لاچار لڑکی 'نورا' اور اس کی زندگی کو بہتر بنانے والے ٹیکسی ڈرائیور 'منا' کی کہانی پیش کی ہے۔ اس کے علاوہ بمبئی کے پولیس اسٹیشن میں ہونے والی معصوم اور بے کس لڑکیوں کے ساتھ بدسلوکی، گلی گلی میں چلنے والے طوائفوں کے کوٹھے اور ساتھ ہی ساتھ 26 نومبر 2011 کی شام ممبئی ریلوے اسٹیشن پر دہشت گردانہ حملے پر ہلکی سی روشنی پڑتی ہے۔

غرض یہ کہ عبدالباری ایم۔ کے صاحب نے اردو قارئین کی خدمت میں جو ہندی کہانیوں کا ترجمہ پیش کیا ہے وہ خوبصورت اور دیرپا اثرات مرتب کرنے والی کہانیاں کتاب 'باہم دگر' میں موجود ہیں۔ اس کتاب کی کہانیاں اپنے اندر ایک جہان آباد کیے ہوئے ہیں۔ جو نہ صرف قاری کی دلچسپی کا سامان فراہم کرتی ہیں بلکہ اسے دنیا کے مختلف مسائل سے روبرو کراتی ہے۔ میں موصوف کو اس کام کے لیے دل کی عمیق گہرائیوں سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

شاعری

بند دریچے

شاعرہ: سائرہ عظیم

صفحات: 168، قیمت: 111 روپے، سنہ اشاعت: 2019

ناشر: حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: عمران عظیم، چیمبر 694، پٹیالہ ہاؤس کورٹ، نئی دہلی

سائرہ عظیم کا مجموعۂ کلام 'بند دریچے' زیر نگاہ ہے۔ ان کی شاعری کا مطالعہ کرنے پر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی کائنات ذہنی میں کس قدر تنوع ہے۔ ان کی شاعری کی وسعت نظری ان کے قاری کو چونکا دیتی ہے۔ زندگی کو انھوں نے قریب سے دیکھا اور برتا ہے۔ وہ اپنی شاعری میں زندگی کو اس طور سے پیش کرتی ہیں جو صدیوں سے چلی آرہی ہے۔ اس بات سے قطعی انکار نہیں کہ وہ مابعد جدید غزل کی بہترین شاعرہ ہے۔ اردو شاعری میں نئے مذاق کے علمبرداروں میں ان کا اہم مقام ہے۔ 'بند دریچے' ان کا اولین شعری مجموعہ ہے جو منفرد و ممتاز حیثیت کا حامل ہے۔ انھوں نے اپنی علمی و ادبی سوجھ بوجھ، فکر وفن اور دانشورانہ علم وعمل سے نئی غزل میں اہم اضافہ کیا ہے۔ ان کی شاعری میں ماضی کی مثبت قدریں، سنجیدگی، اخلاص، سادگی اور دردمندی کے ساتھ جذبات، احساسات، تجربات اور مشاہدات کا عکس بھی نظر آتا ہے۔ ان کے احساسات و جذبات ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں غم جاناں اور غم دوراں کو بھی جگہ دی ہے۔ وہ گھسے پٹے انداز کے اشعار نہیں کہتیں بلکہ اپنے گلہائے سخن کو شگفتہ انداز میں پیش کرتی ہیں جن میں رنگ فصاحت بھی ہے اور حسن بلاغت بھی۔ ان کے چند اشعار اچھی شاعری کی گواہی میں پیش خدمت ہیں:

اس کو احساس کاش ہوجائے — پرورش کررہی ہے ماں کیسے
کچھ تو آسیب کا ہے سایہ بھی — اپنے اجڑے ہوئے مکانوں میں
جو گرم دودھ کرو تو ابال آتا ہے — اسی طرح سے مجھے اشتعال آتا ہے
تمام عمر یہ سوتی ہے اپنے خوابوں میں — ہماری قوم پہ ہر دن زوال آتا ہے
سب سے ہم بول چال کرتے ہیں — دشمنوں کو بھی اب سلام کریں

سائرہ عظیم کی شاعری کے حوالے سے فلمی دنیا کی مشہور شخصیت اور دانشور یوسف خان (دلیپ کمار) اپنی رائے کا اظہار یوں کرتے ہیں:

"مجھے سائرہ عظیم کی غزلیں پسند آئیں۔ وہ عصری زندگی اور روزمرہ کے مسائل کی ترجمانی فنکاری کے ساتھ کرتی ہیں۔ سائرہ عظیم کی شاعری روشن امکانات کی حامل ہے۔ یہ اپنے شعروں کی تازگی اور خوشبو کی وجہ سے بالخصوص نئے ذہنوں کو خاصا متاثر کرتی ہیں۔"

اپنے عہد کے تقاضوں سے سائرہ عظیم کی گہری واقفیت ہے۔ وہ اپنے اشعار کے ذریعے اپنا تخلیقی رکھ رکھاؤ خوب رکھتی ہیں۔ ان کے اس تخلیقی اظہار کے بارے میں اردو کے ممتاز ناقد و شاعر عشرت ظفر فرماتے ہیں: "سائرہ عظیم کو اردو کے شعری ورثہ کا احساس زیادہ ہے۔ وہ خاصے ضبط اور احتیاط کے ساتھ اپنے شعری سفر میں رواں دواں ہیں۔ ان کی غزلوں میں انفرادیت ہے۔ ان کے یہاں تازہ اور چونکا دینے والے شعر کافی تعداد میں موجود ہیں۔"

سائرہ عظیم کا اردو شاعری کا موجودہ سفر نئی راہوں پر گامزن ہے۔

بلاشبہ سائرہ عظیم نے اپنے آس پاس کے ماحول سے موضوعات اخذ کیے ہیں۔ غزل کے میدان میں اپنی شناخت قائم کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ یہ مرحلہ سخت ہے اور مدت کی ریاضت چاہتا ہے۔ شاعرہ موصوف نے بے باکی کے ساتھ سیاست اور سماج پر گہری چوٹ ماری ہے۔ مکروہ چہرے، اخلاقی گراوٹ، انسانی اقدار کی پامال اور انسانی خودغرضی جیسے موضوعات پر بھی قلم اٹھایا ہے۔ ان کی کسی شعری تخلیق میں کہیں کوئی ہلکان محسوس نہیں ہوتا۔ مذکورہ شعری مجموعہ 'بند دریچے' ایک رنگارنگ پھولوں سے سجا گلدستہ ہے۔ اس میں ذات وکائنات کے تمام موضوعات کو سنجیدگی کے ساتھ سائرہ عظیم نے پرونے کی کوشش کی ہے۔ امید ہے کہ ان کا شعری مجموعہ اردو کے ادبی حلقوں میں ذوق وشوق سے پڑھا جائے گا اور سراہا جائے گا۔

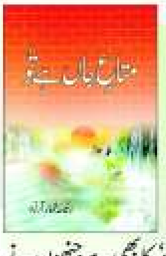

متاع جاں ہے تو

مصنف/ناشر: رئیسہ خمار آرزو

صفحات: 132، قیمت: 85 روپے، سنہ اشاعت: 2019

مبصر: نثار حسن، علامہ اقبال اسکول سنبھل- 244302 (یوپی)

اردو کے گیسوئے تابدار کو سجانے میں ایک نام 'رئیسہ خمار آرزو' کا بھی ہے جنھوں نے زیرنظر کتاب 'متاع جاں ہے تو' اردو دنیا کو دیا ہے۔ یہ کتاب فنی وادبی خوبیوں سے مالا مال ہے۔

کتاب کے آغاز میں ایک خوبصورت انتساب ہے۔ امجد مرزا امجد (لندن)، ڈاکٹر محمد ہارون رشید لکھنو، اور سہیل ضرار خلش (لندن) کے پرمغز تاثرات دیے گئے ہیں۔ جن کے ذریعے خمار صاحبہ اور ان کے فن کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی شعری تخلیقات پیش کی ہیں۔ جن کو پڑھنے کے بعد اچھی طرح اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ایک کہنہ مشق اور پختہ کار شاعر ہیں۔ خوبصورت الفاظ، دیدہ زیب تشبیہات و استعارات سے سجے ہوئے ہیں۔ ان کے اشعار قاری کے دل میں اتر جانے کی مکمل صلاحیت رکھتے ہیں۔ ایک عورت ہونے کی وجہ سے اگر چہ ان کے کلام میں نسوانیت کا غلبہ اور لطیف ونازک جذبات کی عکاسی ہے۔ اور محبت وحسن ان کے تخیل پر غالب رہا ہے۔ اس سے ان کے کلام میں بلا کی ندرت ونزاکت در آئی ہے۔ کچھ غزلوں میں اس کا ردیف وقافیہ کی شکل میں بھی استعمال کیا۔ ایک شعر نذر قارئین ہے۔

پھول دل کے کھلا رہی ہے غزل　　　پیار کے گیت گا رہی ہے غزل

مجموعے میں ایسی غزلیں ہیں جن میں محبت و وارفتگی اور ایثار و شیفتگی کا اظہار ہے۔ خیال کی نزاکت کے ساتھ ہی الفاظ کی بہترین بندش نے کلام میں حسن وجاذبیت پیدا کردی ہے۔ اس طرح کے چند اشعار ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔

کسی کے حسن کی تعریف کر کے شعروں میں　　　لگے ہے جیسے کسی کو منا رہی ہے غزل

مگر دلوں میں تو چاہت کے پھول کھلتے ہیں　　　یہ اور بات کہ اظہار آرزو نہ کریں

اس شعر میں آپ نے اپنا تخلص 'آرزو' بہت ہی خوبصورت انداز اور بامعنی طریقے سے شعر میں باندھا ہے۔ جس سے شعر معنوی حسن اور تخلص کا برمحل استعمال دونوں نے مل کر فنی کمال پیدا کر دیا ہے۔ اسی طرح ایک اور شعر میں جذبات کی انتہا اور پیار کے اظہار کی بیتابی ملاحظہ کیجیے۔

پیار میں تیرے ہر اک حد سے گزر جاؤں گی　　　ایک دن دیکھنا یہ کام بھی کر جاؤں گی

رئیسہ صاحبہ نے دو تخلص استعمال کیے ہیں۔ آرزو اور خمار۔ کمال کی بات ہے کہ دونوں کو حسب ضرورت بڑی خوبصورتی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ آپ کا دوسرا تخلص 'خمار' کا بامعنی استعمال اس شعر میں دیکھا جا سکتا ہے۔

ہمارے ہونٹوں پہ رہتی ہے اک غزل اب بھی　　　خمار آنکھوں میں شعر وسخن کا ہے اب بھی

وہ محبت کی شاعرہ ہیں اور محبت میں ہجر یا فراق کا مرحلہ بھی ہوتا ہے۔ جو عاشق کے لیے بڑا ہی صبر آزما اور تکلیف دہ ہوا کرتا ہے۔ اس کی عکاسی بھی آپ نے بڑے مؤثر انداز میں کی ہے۔ جس کا اندازہ آپ کے اس خوبصورت شعر سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

وہ ایک درد ابھی تک جگر میں رہتا ہے　　　بچھڑتے وقت جو بخشا تھا تو نے ہم کو بھی

رئیسہ خمار صاحبہ ایک خاتون خانہ ہیں اور انھوں نے زندگی کو زمینی سطح پر اتر کر دیکھا ہے۔ اس لیے وہ اس کے پیچ وخم سے پوری طرح واقف ہیں اور اس کا اظہار بھی اپنی شاعری میں کرتی ہیں۔ حقیقت دنیا اور زندگی کی بے مائیگی کا اعتراف کرتے ہوئے کہتی ہیں۔

اتنی محنت عمر بھر ہم نے جو کی بے کار کی　　　رہ گیا سب کچھ یہیں پر اور جا رہے ہیں خالی ہاتھ

عمر بھر کون جواں، کون حسیں رہتا ہے　　　صبح سے شام ہے وابستہ بہاروں سے خزاں

علم کا یہ خاصہ ہے کہ وہ انسانی دل کو نرمی وگداز عطا کرتا ہے۔ اس لیے اہل علم کو عفو ودرگذر کی تعلیم دیتا ہے اور یہ سب انسانیت کا حصہ ہیں اردو کے اندر بالخصوص اس کی شاعری میں تو یہ کچھ زیادہ ہی ہے۔ جس کا اظہار اس کتاب میں بھی جگہ جگہ نظر آتا ہے۔

جیسے کہ پھول رکھتے ہیں کچھ خار زیر لب　　　دشمن کہ دوست سب سے ملو مسکرا کے یوں

ہم تو دشمن کو بھی ہر لمحہ دعا دیتے ہیں　　　دل دکھانا نہیں فطرت میں ہماری اے دوست

خمار صاحبہ کو شعری بیانیہ کے ساتھ ہی لفظوں کے حسیں انتخاب کا بہترین سلیقہ ہے۔ اسی لیے تو وہ نہایت لطیف اور پاکیزہ ونازک الفاظ کا انتخاب کر کے اپنی شاعری میں پروتی ہیں کہ لفظ ومعانی کے خوبصورت امتزاج کی وجہ سے شاعری دوآتشہ بن جاتی ہے۔ لفظ 'وفا' کا بے مثال استعمال اس میں دیکھنے کو ملتا ہے۔

بے وفا میں ذرا سی وفا کیوں نہیں　　　بے وفا لفظ میں بھی لفظ وفا ہے تو پھر

یوں تو یہ کتاب غزلیات کا مجموعہ ہے۔ مگر ایک دعا، کچھ نظمیں، چند قطعات اس میں شامل کیے گئے ہیں۔ نظموں کی عنوانات چاند، اے خدا تم کیا ہو، ماں اور اردو ہیں۔ دعا کو کتاب کے شروع میں ہونا چاہیے تھا مگر یہ غزلوں کے بعد میں دی گئی ہے۔ جو ہماری تہذیب وروایت کے خلاف ہے۔ اسی طرح کتاب کی پروف ریڈنگ زیادہ ذمے داری کے ساتھ نہیں کی گئی، جس کی وجہ سے کچھ غلطیاں رہ گئی ہیں۔ تاثراتی مضامین کو فہرست میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔ اور فہرست میں صفحہ نمبر بھی نہیں دیے گئے ہیں۔ ان معمولی فروگذاشتوں کے باوجود کتاب ہر اعتبار سے اہم وقیمتی ہے۔ جو مطالعے کا تقاضا کرتی ہے۔ کونسل کے مالی تعاون سے اشاعت پذیر ہونے کی وجہ سے اس کی قیمت نہایت مناسب ہے۔ امید ہے اردو شاعری کے قدرداں اس کتاب کو خرید کر اردو دوستی کا ثبوت دیں گے اور خمار صاحبہ کی محنت کو قدر ومنزلت سے نوازیں گے۔

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

خبرنامہ

اردو کا رشتہ عالمی سطح پر قائم ہو چکا ہے: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

دھلی : آج دنیا ایک عالمی گاؤں کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ اس انقلاب کے پیچھے جدید ٹکنالوجی کا اہم کردار ہے، جس میں سرفہرست زبان کی رسائی ہے۔ روزمرہ ضروریات کی تکمیل کے لیے زبان ایک اہم ذریعہ ہے۔ اردو زبان کے لفظوں میں حویلیوں، محلوں، جھگیوں، جھونپڑیوں کا درد یکساں ہے۔ یہ زبان دل و دماغ میں موجزن خیالات کی تصویر کشی کرتی ہے یہی سبب ہے کہ یہ سرحدوں سے آزاد ہے۔ اس زبان کے الفاظ دنیا کی سبھی زبانوں میں اپنی تاثیر کے باعث جگہ بنا رہے ہیں۔ گویا اردو کا رشتہ عالمی سطح پر قائم ہو چکا ہے۔ اس لیے آئندہ 28-26 فروری 2020 کو عالمی اردو کانفرنس کا انعقاد بہ موضوع 'ہندوستانی اور بیرونی زبانوں سے اردو کا لسانی و ادبی رشتہ' ہوگا۔

17/دسمبر 2019 بروز منگل، قومی اردو کونسل کے صدر دفتر جسولہ میں سہ روزہ عالمی اردو کانفرنس کے اہتمام کے سلسلے میں میٹنگ میں ان خیالات کا اظہار پروفیسر شاہد اختر کی صدارت میں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے ایڈوائزری کمیٹی کے سامنے کیا۔ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے پچھلی چھ کانفرنسوں کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ پچھلی کانفرنسوں کے موضوعات میں قدرے یکسانیت تھی۔ لہٰذا ساتویں عالمی کانفرنس کا موضوع ایسا متعین کیا جائے جس سے زبانوں کے عالمی رشتے پر روشنی پڑے۔ اردو زبان کی تشکیل میں السنۂ عالم کا خاکہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے پانچ ذیلی عنوانات طے کیے، جن کا احاطہ کانفرنس میں پڑھے جانے والے مقالے کریں گے جو درج ذیل ہیں۔

1. اردو اور دیگر زبانوں کے درمیان لسانی و ادبی رشتوں کا تاریخی پس منظر
2. اردو اور دیگر زبانوں کے درمیان لسانی و ادبی رشتوں کی نوعیت
3. اردو اور دیگر زبانوں پر مرتب ہونے والے لسانی و ادبی اثرات کی توضیحات
4. اردو اور دیگر زبانوں پر سیاسی، سماجی اور معاشرتی اثرات سے بدلتے لسانی و ادبی رشتے
5. اردو اور دیگر زبانوں کے درمیان لسانی و ادبی رشتوں کا مستقبل

کانفرنس میں ہندوستان کی تمام ریاستوں کے علاوہ بیرونی ممالک کے دانشوروں، ناقدین اور ماہرین لسانیات کی شرکت متوقع ہے۔

ممبران کمیٹی کے مشوروں سے موضوع کی تعیین عمل میں آئی۔ نیز متوقع مندوبین کی فہرست تیار کی گئی۔ میٹنگ میں پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر مظفر علی شہ میری، پروفیسر کمل کشور گوئنکا، پروفیسر محمد اسد الدین، پروفیسر محمد شبیر، ڈاکٹر خواجہ افتخار احمد، ڈاکٹر فضل الرحمٰن، ڈاکٹر مسرور احمد بیگ، کونسل کے ریسرچ آفیسر ڈاکٹر کلیم اللہ، ڈاکٹر انوار الحق، ڈاکٹر فیاض عالم، ڈاکٹر جاوید اقبال، ڈاکٹر شاہد اختر اور ڈاکٹر عبدالرشید اعظمی نے شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 17 دسمبر 2019

کتابوں کے اجرا کی تقریب

دھلی : اردو پوری دنیا میں پھیل رہی ہے۔ یہ اردو کا وہ ادارہ ہے جو دنیا کے ان تمام لوگوں کے لیے ہے جو اردو زبان کی توسیع کا کام کرتے ہیں۔ اب قومی اردو کونسل اردو زبان کی توسیع و ترقی کا عالمی مرکز بن چکا ہے۔ آج کا پروگرام قومی نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے۔ یہ باتیں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے صدر دفتر میں منعقدہ کتابوں کی رسم اجرا کے موقعے پر کہیں۔ اس موقعے پر کناڈا سے تشریف لائے معروف محقق و نقاد سید تقی عابدی کی کتاب 'باقیات و نادرات فیض احمد فیض' اور موریشس سے تشریف لائے ڈاکٹر آصف علی محمد کی کتاب 'ماریشس میں اردو' نیز' تاشیانہ شمتالی کی

کتاب 'جوش اور اقبال کا تقابلی مطالعہ' کا اجرا ڈاکٹر شیخ عقیل احمد اور پروفیسر انور پاشا کی موجودگی میں عمل میں آیا۔

رسم اجرا سے قبل سید تقی عابدی نے اپنی تصنیف 'باقیات و نادرات فیض احمد فیض' کے بارے میں قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی نیز اس کے ماخذ و منابع اور مواد کی فراہمی میں درپیش مشکلات سے حاضرین کو آگہی دی۔

ماریشس سے تشریف لائے ڈاکٹر آصف علی محمد نے ماریشس میں اردو کی صورت حال پر مبسوط گفتگو کی اور ہندوستان میں اپنے تعلیمی سفر کی روداد سناتے ہوئے کہا کہ ہم ہر سال ہندوستان آتے ہیں اور یہاں کے دانشوروں اور اہل کمال سے علمی قوت لے کر تازہ ہوتے ہیں۔

صدر نشیں پروفیسر انور پاشا نے بالترتیب سید تقی عابدی، ڈاکٹر آصف علی اور تاشیانہ شمتالی کی کتابوں پر اظہار خیال کیا۔ انور پاشا نے قومی اردو کونسل میں سفیران اردو کی آمد پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ برصغیر کے بعد اردو کا اگر کوئی گھر ہو سکتا ہے تو وہ ماریشس ہے۔ اردو وہاں کی تہذیبی و ثقافتی شناخت بن چکی ہے۔ آخر میں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر شیخ عقیل احمد نے مہمانانِ گرامی ڈاکٹر سید تقی عابدی، ڈاکٹر آصف علی محمد، تاشیانہ شمتالی اور پروفیسر انور پاشا و دیگر خواتین و حضرات کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 24 دسمبر 2019

ایرانی وفد کو استقبالیہ

نئی دھلی: ہندوستان اور ایران کے درمیان تہذیبی اور ثقافتی رشتے ہزاروں سال سے قائم ہیں۔ ان رشتوں کو مضبوط و مستحکم کرنے میں اردو اور فارسی نے اہم کردار

ادا کیا ہے۔ اردو شاعری کا سرچشمہ فارسی شاعری ہے۔ ایران و ہندوستان کے مابین ہر سطح پر خوشگوار تعلقات کو آگے بڑھانے کے لیے قومی کونسل اور ایران کلچرل ہاؤس نے ان دونوں زبانوں کے فروغ کے لیے کئی اہم معاہدے کیے ہیں۔ یہ باتیں قومی کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے ایران کے کلچرل کونسلر ڈاکٹر علی ربانی کے لیے منعقد کی جانے والی استقبالیہ تقریب کے دوران کہیں۔ انھوں نے کہا کہ دونوں ممالک نے اپنے اپنے ملکوں میں اردو اور فارسی زبان وادب کے فروغ وارتقا کے لیے اپنے دائرۂ اختیار میں رہتے ہوئے باہمی مفاہمت سے کئی اہم تجاویز اور منصوبوں کو حتمی شکل دی ہے۔ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کہا کہ اس ایم او یو کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کی ہزاروں سالہ پرانی تہذیب اور اس کے فلسفے سے ایران کی نئی نسل کو متعارف کرایا جاسکے۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستانی اور ایرانی تہذیب وثقافت کے درمیان اتنی قربت و مماثلت ہے کہ ان کے مابین فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر علی ربانی اور ڈاکٹر عقیل احمد نے اپنے مشترکہ بیان میں کہا کہ معاہدے کا بنیادی مقصد اردو، فارسی اور باہمی کلچر کو فروغ دینا ہے۔ انھوں نے کہا کہ معاہدے میں طے ہوئی باتوں کے مطابق قومی کونسل اور اسلامک کلچر اینڈ ریلیشن آرگنائزیشن ان کتابوں کی فہرست ایک دوسرے کو مہیا کرنے کا بندوبست کریں گے جو کتابیں اردو اور فارسی میں ترجمہ کی جا چکی ہیں۔ تاکہ ان کتابوں کی اشاعت کو یقینی بنایا جاسکے جن کا ابھی تک ترجمہ نہیں ہوا ہے اور جن کی اشاعت عمل میں نہیں آئی ہے۔ انھوں نے اپنے مشترکہ بیان میں مزید کہا کہ ہم ایک دوسرے کو لوجسٹک سپورٹ فراہم کریں گے تاکہ دونوں ممالک میں ہونے والے ادبی و ثقافتی پروگراموں و سیمناروں کے انعقاد میں معاونت حاصل ہوسکے۔ نیز ہم ایسا تعلیمی اور تدریسی مواد تیار کرکے شائع کریں گے جس سے حسب ضرورت استفادہ کیا جاسکے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اسلامک کلچر اینڈ ریلیشن آرگنائزیشن ایران سے منسلک نمائش اور خطاطی کے ماہرین قومی کونسل کو فراہم کرے گی تاکہ قومی کونسل کے ذریعے چلائے جارہے خطاطی سینٹرس کے لیے تربیتی کیمپ کا انعقاد کیا جاسکے۔ قومی کونسل کے تحت چلنے والے فارسی سینٹرس میں فارسی پڑھانے والے اساتذہ کے لیے اسلامک کلچر اینڈ ریلیشن آرگنائزیشن فارسی کے ماہرین کی مدد سے ریفریشر کورس کا اہتمام کرے گی۔

اس موقعے پر ایران کے کلچرل کونسلر ڈاکٹر علی ربانی نے کہا کہ ہندوستان میں فارسی کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ اس ملک میں فارسی آٹھ سو سال تک تہذیبی اور ثقافتی زبان رہی ہے۔ درحقیقت فارسی ہندوستان کی میراث ہے اور فارسی سے اردو نے جنم لیا ہے۔ آخر میں قومی کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر عقیل احمد نے ڈاکٹر علی ربانی کی خدمت میں گلدستہ پیش کیا اور شکریہ ادا کیا۔ استقبالیہ تقریب میں کونسل کا عملہ موجود تھا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 31 دسمبر 2019

ایرانی کلچرل ہاؤس کے مابین ایم او یو پر دستخط

نئی دھلی: ایران اور ہندوستان کے درمیان ازمنۂ قدیم سے ہی تہذیبی، لسانی اور ادبی سطح پر لین دین کا رشتہ رہا ہے۔ اسی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے آج ایرانی کلچرل ہاؤس نئی دہلی (حکومت ایران) کے کلچرل کونسلر ڈاکٹر علی ربانی اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (حکومت ہند) کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد کے مابین کئی نکات پر ایرانی مندوبین اور کونسل کے ارکان کی موجودگی میں کونسل کے صدر دفتر میں باضابطہ ایم

او یو پر دستخط کیے گئے۔ اس ایم او یو کا بنیادی مقصد دونوں زبانوں کا فروغ اور تہذیبی ولسانی نقطۂ نظر سے نئی نسل کو آگاہ کرنا ہے۔ اس موقع پر قومی اردو کونسل کے ڈائریکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے تمام مندوبین کا گلدستہ پیش کرکے استقبال کرتے ہوئے کہا کہ آج کا دن اس اعتبار سے تاریخی اہمیت کا حامل ہے کہ آج دو قدیم تہذیبوں اور زبانوں

کا سنگم ہوا ہے۔انھوں نے کہا کہ ہم ایرانی کلچرل ہاؤس میں اردو کا سینٹر قائم کرنے جارہے ہیں جس میں اردو کو فارسی میڈیم کے ذریعے پڑھایا جائے گا۔تا کہ فارسی والے براہ راست اردو زبان وادب کی تفہیم کرسکیں۔ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے مزید کہا کہ ہر ماہ ایرانی کلچرل ہاؤس اور قومی اردو کونسل کے اشتراک سے ادبی پروگرام کا انعقاد بھی کیا جائے گا۔

ایران کے کلچرل کونسلر ڈاکٹر علی ربانی نے اپنے خطاب میں کہا کہ فارسی اور اردو انسانی اقدار کی زبانیں ہیں،ان میں ایک دوسرے کو اپنانے کی صلاحیت موجود ہے۔ان زبانوں کے ذریعے ہم دنیا میں امن وآشتی کا ماحول تیار کرسکتے ہیں۔ایرانی کلچرل ہاؤس اور قومی اردو کونسل کے اشتراک سے ماہانہ ادبی نشست کے انعقاد کے حوالے سے انھوں نے کہا کہ ہندوستان اور ایران کے درمیان جو مفاہمت نامے پر دستخط ہوئے ہیں، وہ ہمیں اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ ہم اس طرح کے پروگراموں کو آگے بڑھائیں۔

ایرانی وفد میں شامل شکر الٰہی نے کہا کہ اردو اور فارسی کے درمیان کئی مشترک نکتے موجود ہیں جن میں ایک 'رسم الخط' ہے اور دوسرا 'خوشخطی' ہے۔ہمیں ان کے تحفظ کے لیے کوشاں رہنا چاہیے۔محترم علی رضا نے کہا کہ ہند اور ایران میں تہذیبی وثقافتی اشتراک ہے اور نہ صرف اردو زبان پر بلکہ ہندوستان کی دوسری زبانوں پر بھی فارسی کے اثرات ہیں۔ہماری ذمے داری ہے کہ ہم اپنی ثقافتی، تہذیبی اور لسانی اقدار کی حفاظت کریں۔

ڈاکٹر ولی پور نے کہا کہ صوفیا نے اردو اور فارسی جیسی زبانوں کے ذریعے اخلاق، تہذیب اور امن وانسانیت کی تعلیم دی ہے۔انھوں نے کہا کہ امن ہماری بڑی طاقت ہے۔گاندھی جی نے برٹش حکام کے خلاف آزادی کی لڑائی لڑی مگر اسلحہ اور تشدد کے ذریعے نہیں بلکہ اخلاق، تہذیب، انسانیت اور عدم تشدد کے ذریعے۔امن ومحبت کے کلچر کو فروغ دینا آج کی بہت بڑی ضرورت ہے۔اس موقع پر ایک شعری نشست کا انعقاد ہوا جس میں ایرانی وفد میں شامل ڈاکٹر احمد علی، ڈاکٹر ولی اللہ اور مہدی باقر نے بھی اپنا کلام پیش کیا۔ایرانی شعرا کے علاوہ کونسل سے وابستہ کئی شعرا نے بھی اپنی شاعری سے سامعین کو محظوظ کیا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 6 جنوری 2020

داستان گوئی اردو ادب کا سرمایۂ افتخار ہے: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

نئی دھلی: موجودہ وقت میں گاندھی کے سپنوں کے بھارت کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔گاندھی دراصل ایک نظریہ ہے۔اس نظریہ کے ذریعے ہم ملک میں امن

وآشتی کی فضا قائم کرسکتے ہیں۔گاندھی جی محبت اور اہنسا کے متوالے تھے اور اردو زبان انہی خیالات کی ترجمانی بھی کرتی ہے۔یہ باتیں 'عالمی کتاب میلہ' پرگتی میدان میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام منعقدہ پروگرام 'داستان گوئی' (داستان گاندھی) میں اردو کونسل کے وائس چیئرمین پروفیسر شاہد اختر نے کہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو داستان گوئی کی روایت بہت پرانی ہے لیکن بدلتے وقت میں یہ فن قصۂ پارینہ بن گیا، البتہ حالیہ دنوں میں اس فن کو فروغ ملا ہے جو ایک خوش آئند بات ہے۔

قومی اردو کونسل کے ڈائریکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ کوئی بھی فن نیا اور پرانا نہیں ہوتا بلکہ اس کا انحصار پیشکش پر ہوتا ہے۔فوزیہ داستان گو اور فیروز خان نے جس لب ولہجہ اور انداز میں داستان پیش کی، وہ قابل تعریف ہے۔انھوں نے کہا کہ داستان گوئی اردو ادب کا سرمایۂ افتخار ہے۔ہمیں اس وراثت کو محفوظ رکھنے اور آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔انھوں نے کہا کہ داستانیں گنگا جمنی تہذیب کی آئینہ دار ہیں۔ان کے ذریعہ ہندوستانی تہذیب وثقافت کو بہتر طور پر سمجھا جاسکتا ہے۔

اس موقعے پر داستان گاندھی کے ہدایت کار پروفیسر دانش اقبال نے داستان گوئی کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو کی۔انھوں نے کہا کہ داستان گوئی ایک مشکل فن ہے، تاہم اس فن کے ذریعے سامعین تک اپنی بات پہنچانا فن کاروں کا فریضہ ہے۔پروگرام کو فیروز خان اور فوزیہ داستان گو نے پیش کیا۔فوزیہ ہندوستان کی پہلی خاتون داستان گو ہیں۔وہ اس سے قبل 'مہابھارت'، 'رادھا کرشن' اور 'اپنے رام جی' جیسی داستانیں پیش کرکے شہرت حاصل کرچکی ہیں۔ان دونوں فن کاروں نے 'داستان گاندھی' کے ذریعے گاندھی جی کی پوری زندگی کا خاکہ انتہائی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا۔سامعین ان کی پیش کش اور انداز بیاں سے لطف اندوز ہوتے رہے اور ساتھ ہی داد وتحسین سے بھی نوازتے رہے۔

پروگرام کی نظامت ڈاکٹر عبدالحی کی جبکہ اظہار تشکر ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی نے کیا۔ اس موقعے جو اہم شخصیات موجود رہیں، ان میں پروفیسر نصیر احمد خان، ایڈوکیٹ جناب اے رحمٰن اور این بی ٹی کے ایڈیٹر ڈاکٹر شمس اقبال اور جناب کمل سنگھ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 7 جنوری 2020

گاندھی جی کے نظریے کی اساس ستیہ اور اہنسا ہے: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

نئی دھلی: کتاب کی ایک سطر انسان کی زندگی بدل سکتی ہے اور مہاتما گاندھی کی پوری زندگی کسی عظیم کتاب سے کم نہیں ہے۔یہ بات اس لیے کہی جاسکتی ہے کہ ان کے افکار و خیالات اور عملی زندگی نے لاکھوں کروڑوں لوگوں کی زندگیاں بدل دی ہیں۔ان خیالات کا اظہار وزیر مملکت برائے فروغ انسانی وسائل حکومت ہند عزت مآب سنجے دھوترے نے پرگتی میدان میں منعقدہ عالمی کتاب میلے میں قومی اردو کونسل کے پروگرام بعنوان 'گاندھیائی فلسفۂ تعلیم اور مادری زبان' میں کیا۔انھوں نے کہا کہ گاندھی جی صدی کی سب سے عظیم شخصیت ہیں۔ان کی عظمت کا اعتراف پوری دنیا کرتی ہے۔انھوں نے مزید کہا کہ ہمیں اپنے بچوں کو مادری زبان میں تعلیم دینے کی ضرورت ہے۔

انھوں نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ کتابوں کی ریڈرشپ میں بتدریج کمی واقع ہورہی ہے۔ ہمیں نئی نسل کو کتابوں کی طرف راغب کرنا چاہیے۔ پروگرام میں نیشنل بک ٹرسٹ اور قومی اردو کونسل سے شائع ہونے والی کئی اہم کتابوں کا اجرا بھی بدست وزیر مملکت عمل میں آیا۔

اس موقعے پر قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ مہاتما گاندھی نے اپنی فکر سے نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا کو متاثر کیا ہے۔ انھوں نے ستیہ اور اہنسا کو اپنے فلسفے اور فکر کی بنیاد بنایا اور اس کے ذریعے امن و بھائی چارے کا پیغام دیا انھوں نے مزید کہا کہ گاندھی جی نے ہندوستانی زبانوں کے تعلق سے بھی اپنے عمدہ خیالات اور مضبوط نظریات پیش کیے اور مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے پر زور دیا۔

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کہا کہ ہمیں غیر ملکی زبانوں سے مرعوب ہونے کی ضرورت نہیں۔ دنیا میں ایسے بہت سے ممالک ہیں جو اپنی مادری زبان کے بل بوتے پر ترقی یافتہ ممالک کے دوش بدوش کھڑے ہیں۔ این بی ٹی کے چیئر مین پروفیسر گووند پرساد شرمانے کتاب میلے کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ عالمی کتاب میلہ 1972 سے بدستور منعقد ہورہا ہے۔ 2013 سے ہر دو سال پر عالمی کتاب میلے کا اہتمام کیا جارہا ہے۔ اس بار اس کتاب میلے میں 600 سے زائد ناشرین نے شرکت کی جب کہ اس میں 23 سے زیادہ غیر ملکی ناشرین کی شمولیت رہی۔ این بی ٹی کے ڈائریکٹر لفٹیننٹ یوراج سنگھ ملک نے کہا کہ اردو ایک ایسی زبان ہے جس کے اندر بے پناہ نزاکت اور رچاؤ ہے۔ یہ اتحاد و محبت کی زبان ہے۔ ہمیں اس کی حفاظت کرنی چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ گاندھی ایک سوچ ہے۔ ہمیں اپنے اندر گاندھی کی اس سوچ کو جگانے کی ضرورت ہے۔

اس موقعے پر پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ گاندھی جی کے افکار و خیالات کی ضرورت کل بھی تھی اور آج کے حالات میں اس کی ضرورت اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔ معروف صحافی سید قربان علی نے مہاتما گاندھی کی زندگی کے اہم نکات پر روشنی ڈالی اور کہا کہ گاندھی جی نے 1916 میں اس بات کی وضاحت کی تھی کہ اگر ہم اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کررہے ہوتے، تو شاید آج ہم آزاد ملک میں ہوتے۔ پروفیسر رضوان قیصر نے مہاتما گاندھی کی گجراتی میں لکھی ہوئی کتاب 'ہند سوراج' کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو کی۔ انھوں نے کہا کہ گاندھی جی کے چشمہ کے پیچھے جو وژن ہے، ہمیں اسے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

قومی اردو کونسل کے وائس چیئر مین پروفیسر شاہد اختر نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ آج دنیا کے سامنے جو مسائل درپیش ہیں، ان کا حل گاندھی جی کے نظریات سے ہی ممکن ہے۔ ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی نے مہمانان اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 12 جنوری 2020

کیرالہ کے کوزی کوڈ میں انٹریکٹیو سیشن

کوزی کوڈ: کیرالہ اردو کا ایک بڑا مرکز بن سکتا ہے کیونکہ یہاں تعلیم کا معیار بہت اچھا ہے اور تعلیم کی شرح 100 فیصد ہے۔ یہاں کے لوگوں کے ہاتھوں میں اردو کا مستقبل محفوظ ہے۔ ساری دنیا میں کیرالہ سے اردو کی شمع روشن ہوگی۔ یہ باتیں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کوزی کوڈ، کیرالہ میں مدارس کے ذمے داران، غیر سرکاری تنظیموں اور اداروں کے ساتھ ایک انٹریکٹیو سیشن کے دوران کہیں۔ انھوں نے کہا کہ یہاں کے کچھ علاقوں کی مادری زبان اردو ہے لیکن وہ اپنا کام اردو میں نہیں

کر پارہے تھے، اب ایک طویل جدوجہد کے بعد انھیں اردو زبان میں کام کرنے کا حق حاصل ہوا ہے، اس لیے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ وہ نہ صرف کیرالہ میں اردو کے فروغ کے لیے کوشش کریں گے بلکہ ساری دنیا میں ان کے ذریعے اردو کی شمع روشن ہوگی۔ انھوں نے مزید کہا کہ یہاں کی ریاستی حکومت سے ہم نے درخواست کی ہے کہ یہاں پرائمری سطح پر اردو تعلیم کا نظم کیا جائے۔ یہاں تقریباً دو ہزار اردو اساتذہ ہیں اور ان کی اپنی یونین بھی ہے۔ ان کے اشتراک سے ہم یہاں اردو اساتذہ کے لیے ایک تربیتی پروگرام بھی جلدی ہی منعقد کریں گے۔ یہاں کی لائبریریوں میں ہم قومی اردو کونسل سے کتابیں بھی بھیجیں گے۔ انھوں نے کونسل کا تعارف بھی پیش کیا۔ ساتھ ہی مختلف اسکیموں اور پروگراموں کی تفصیلات بھی بتائیں۔ انھوں نے کہا کہ کونسل سے کمپیوٹر کورس، خطاطی اور گرافک ڈیزائننگ، مالی تعاون اسکیم کے تحت مسودے کی اشاعت، پروجیکٹ، کتابوں کی خریداری، قومی و عالمی سمیناروں کا انعقاد اور فاصلاتی تعلیم کے تحت اردو، عربی اور فارسی کے ڈپلومہ کورس جیسے پروگرام اور اسکیمیں چلائی جاتی ہیں، جن سے کیرالہ کے لوگوں کو فائدہ اٹھانا چاہیے۔ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کہا کہ یہاں کے مختلف اردو پروگراموں میں قومی اردو کونسل ہر ممکن تعاون دے گی۔

ریاستی حکومت کی جانب سے کرائے جانے والے کلچرل پروگراموں میں بھی کونسل مدد کرے گی۔ اس انٹریکٹیو پروگرام میں ہی اردو کے ایک شیدائی نے جلد از جلد کوزی کوڈ سے ایک اردو اخبار جاری کرنے کی یقین دہانی کرائی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 12 دسمبر 2020

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

اتر پردیش:

خلیل الرحمٰن بینا بجنوری اور مشکور حسن شوق امروہوی

نجیب آباد: انجمن ترقی اردو ہند (شاخ ضلع بجنور) اتر پردیش کے زیر اہتمام اردو ادب کی نامور شخصیات مرحوم خلیل الرحمٰن بینا بجنوری اور مشکور حسن شوق امروہوی کی یاد میں ایک تعزیتی اجلاس، سمینار اور رسم الخط کی بقا پر ایک تقریب منعقد کی گئی جس کو خطاب کرتے ہوئے مقررین نے اردو کی بقا اور رسم الخط کی بقا کے لیے اپنے بچوں کو اردو پڑھائے جانے، گھروں کے اندر اردو ماحول بنانے، بول چال میں اردو استعمال کیے جانے، اردو اخبارات کو اپنے گھروں میں جاری کرانے، کم از کم ایک گھنٹہ اردو کے لیے نکالے جانے پر زور دیا۔ اس موقعے پر محفل مشاعرہ کا بھی انعقاد کیا گیا جس میں شعرائے کرام نے اپنا کلام پیش کر کے خوب داد و تحسین حاصل کی۔ رحمت کالونی بجنور میں منعقدہ سمینار بجنور ضلع کے شعرائے کرام کے شعری و نثری مجموعہ بینا بجنوری کے مجموعہ کلام مضراب اور نقش کا لجر، طیب آزاد کے منظوم ترجمہ پنج سورہ اور سورۃ البقرہ کی، محمد احمد کے نقوش دانش اور ڈاکٹر آفتاب نعمانی کے شعری مجموعہ لفظ لفظ آفتاب، ریاض حنفی کے تشنگی ہوتے ہوئے ناظم اشرف کے شاعری تک آگئے کی رونمائی معزز شخصیات نے کی۔ پروگرام کے کنوینر امیر نہٹوری کی نظامت میں منعقدہ سمینار کو خطاب کرتے ہوئے پروگرام کے صدر خورشید محسن زیدی ایڈووکیٹ، سرپرست زاہد حسین، نگر پالیکا بجنور کے چیئر پرسن شوہر شمشاد انصاری، جاوید آفتاب صدیقی نے اپنے خطاب میں بینا بجنوری اور شوق امروہوی کو خراج عقیدت پیش کیا اور کہا کہ سب سے بڑا خراج عقیدت یہی ہوگا کہ ہم اردو کی ترقی کے لیے کام کریں اور جو مشن شوق امروہوی نے اور بینا بجنوری نے ادھورا چھوڑا ہے اس کو آگے بڑھانے کا کام کریں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' لکھنؤ، 24 نومبر 2019

تحقیق میں سرقہ سے اجتناب لازمی

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) کے یو جی سی ایچ آر ڈی سنٹر کے تحت شعبۂ عربی میں جاری 21 روزہ تربیتی پروگرام میں ریسرچ اسکالروں سے خطاب کرتے ہوئے پروفیسر صلاح الدین عمری نے کہا کہ فکری چوری مادّی چوری سے زیادہ معیوب ہے کیونکہ یہ کئی نسلوں کو متاثر کرتی ہے۔ انھوں نے قدیم عربی مصادر کے حوالے سے سرقہ کے مترادف کلمات کا ذکر کیا اور اپنی گفتگو کا اختتام مشہور عربی تنقید نگار میخائل نعیمہ کے اس قول پر کیا کہ ''تقلید مقلد کے افلاس کی دلیل ہے۔'' پروفیسر محمد ثناء اللہ ندوی نے کہا کہ متن کی قرأت بڑی اہم ہوتی ہے اور جب تک محقق متن، طرز تحریر اور اس کی فنی باریکیوں سے آگاہ نہ ہو اس کی صحیح قرأت نہیں کر سکتا اور نہ ہی کسی اہم نتیجہ تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ اسی بحث کو پروفیسر محمد اظہر (ویسٹ ایشین اینڈ افریقن اسٹڈیز) نے آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ عربی زبان کم از کم 23 ملکوں کی سرکاری زبان ہے اور وہاں زبان و ادب کی تحقیق سے مکمل آگہی ہندوستانی اسکالروں کے لیے لازمی ہے تاکہ عربی زبان میں نئے رجحانات سے واقفیت حاصل ہو سکے اور انھیں افکار و نظریات کی روشنی میں ریسرچ کو ممتاز بنانے میں مدد ملے۔

شعبۂ عربی کے پروفیسر محمد سمیع اختر نے مشہور مصری اسکالر محمود محمد شاکر کے منہج تحقیق کو پیش کیا اور ریسرچ اسکالروں کو بتایا کہ ان کا طریقۂ تحقیق یہ تھا کہ وہ متن کو کئی بار پڑھتے اور بین السطور مخفی حقائق کو سمجھنے کی کوشش کرتے اور مضبوط و مستحکم انداز میں اپنی آرا کو پیش کرتے۔ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے پروفیسر مجیب الرحمٰن ندوی نے سرقہ کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ آج علمی، ادبی اور فکری سرقہ عام ہو گیا ہے، اس میں ریسرچ اسکالر و سپروائزر برابر کے شریک ہیں۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 24 دسمبر 2019

اردو کانفرنس

دیوبند: اردو ہر ہندوستانی کی مشترکہ زبان ہے اور پانچ ریاستوں میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے، اردو کو نقصان پہنچانے میں جتنا ہاتھ سیاسی رہنماؤں کا ہے اس سے کہیں زیادہ اس کے ذمے دار ہم خود ہیں، ہمیں اس زبان کو زندہ رکھنے کے لیے خود آگے آنا ہوگا۔ ان خیالات کا اظہار حافظ محمد عثمان (سابق اطلاعات کمشنر حکومت اتر پردیش) نے مظفر نگر میں منعقد اردو کانفرنس میں کیا۔ حافظ عثمان اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن شاخ مظفر نگر کے زیر اہتمام منعقد پروگرام میں خطاب کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ ہماری قوم تعلیم کے میدان میں پچھڑ رہی ہے، لہٰذا ہمیں اپنی نوجوان نسلوں کے روشن مستقبل کے لیے تعلیمی میدان میں آگے آنا ہوگا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (شعبہ اردو) کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر مشتاق صدف نے کہا کہ زبانوں کی بھی موت ہوتی ہے، تاریخ شاہد ہے کہ جب جب قوموں کی تہذیب رو بہ زوال ہوتی ہے تو اس قوم کے ساتھ اس کی زبان بھی مٹ جاتی ہے، حالانکہ ابھی اردو کے ساتھ یہ نوبت نہیں آئی، انھوں نے کہا کہ لوگ کہتے ہیں کہ اردو مٹ رہی ہے مگر ایسی کوئی بات نہیں۔ اردو ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ پوری دنیا میں مقبولیت حاصل کر رہی ہے۔ پروگرام کی صدارت کر رہے اردو ادیب پروفیسر جے پی سویتا نے کہا کہ اردو بہت شیریں اور گنگا جمنی تہذیب کی زبان ہے، انھوں نے آزادی سے پہلے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ہم سب کی زبان اردو تھی مگر ملک کے بٹوارے کے بعد ہماری زبان پاکستان کی قومی زبان بن گئی جس سے ہمارے ملک میں اردو کا نقصان ہوا اور اردو ایک فرقے کی زبان بن کر رہ گئی، مگر مجھے آج بھی فخر ہے کہ میری مادری زبان اردو ہے اور ہم اردو کے ساتھ سوتیلے رویہ کو برداشت نہیں کریں گے۔ ضلع صدر کلیم تیاگی نے بتایا کہ ہم نے تقریباً 150 ایسے طلبا و طالبات کو اعزاز سے نوازا ہے جنھوں نے ہائی اسکول اور انٹر میں 75 فیصدی سے زیادہ نمبر حاصل کیے ہیں۔ کنور نسیم شاہد (سرپرست اردو ٹیچرس ایسوی ایشن علی گڑھ)، محبوب عالم ایڈوکیٹ، امیر اعظم ایڈوکیٹ، معصوم علی تیاگی پرنسپل، حاجی اوصاف احمد نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ تنظیم کی جانب سے ہونہار طلبا و طالبات کو اعزازی مومنٹو اور سرٹیفکٹ سے نوازا گیا۔ اس دوران حافظ محمد عثمان و ڈاکٹر مشتاق صدف کو علامہ اقبال ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ اس کے علاوہ کنور نسیم شاہد، پروفیسر جے پی سویتا، کو فخر اردو ایوارڈ سے نوازا گیا۔ تنظیم کے خازن بدر الزماں خان کو ان کی اردو خدمات

کے پیش نظر اس سال کا اسپیشل اعزاز تنظیم کی جانب سے دیا گیا اور دیگر تمام ممبران کو بھی اعزازی مومنٹو دیے گئے، اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن اور یونائیٹڈ مسلم آف انڈیا دہلی کی جانب سے شائع ہونے والے یادگار مجلّے کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ پروگرام کی نظامت کلیم تیاگی نے کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 11 دسمبر 2019

الہ آباد میں طبی کنونشن کا انعقاد

الہ آباد: آل انڈیا یونانی طبی کانگریس (اتر پردیش) کے زیراہتمام الہ آباد میں منعقد ہوئے طبی کنونشن میں ریاست بھر سے بڑے پیمانے پر یونانی ڈاکٹروں نے حصہ لیا۔ کنونشن کی صدارت محکمہ یونانی خدمات، حکومت اتر پردیش کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد سکندر حیات نے کی۔ انھوں نے کہا کہ ریاست میں اگرچہ یونانی شفاخانوں کی تعداد بڑھانے کی سخت ضرورت ہے اور ہم اس کے توسیعی منصوبوں پر کام کر رہے ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ حکومت اتر پردیش کی جانب سے ہمیں بھرپور تعاون حاصل ہے۔ اس موقعے پر آل انڈیا یونانی طبی کانگریس کے سکریٹری جنرل ڈاکٹر سید احمد خاں نے کہا کہ تحقیق اور تحریک کی بنیاد پر ہی طب یونانی کے فروغ کا انحصار ہے اور ہمیں حکومت کے ذریعے فراہم کردہ سہولیات سے بھرپور استفادہ کرنا چاہیے۔ اسٹیٹ یونانی میڈیکل کالج کے پرنسپل ڈاکٹر انوار قریشی نے اکیڈمک صلاحیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے یونانی ڈاکٹروں کی حوصلہ افزائی کی۔ کنونشن میں جسٹس عتیق الدین نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی اور اپنے تجربات شیئر کیے۔ انھوں نے کہا کہ طب یونانی میں صحت کو بنائے رکھنے کے لیے بہت زیادہ نسخے موجود ہیں اور ان پر تحقیق بھی ہو رہی ہے جو خوش آئند ہے۔ کنونشن میں ڈاکٹر سلمان خالد نے ذیابیطس پر اور ڈاکٹر قمر الحسن لاری نے بلڈ پریشر پر بہت ہی معلوماتی لیکچر پیش کیے اور آسان یونانی نسخے بھی بتائے۔

آل انڈیا یونانی طبی کانگریس اتر پردیش کے سرپرست

الہ آباد میں طبی کنونشن کا انعقاد

اور معروف طبیب ڈاکٹر ٹی یو صدیقی نے افتتاحی تقریب کی نظامت کی اور ڈاکٹر سلمان خالد اور ڈاکٹر قمر الحسن لاری کے لیکچر پر تبصرہ بھی کیا۔ ڈاکٹر خورشید عالم نے کنونشن کے دوسرے مرحلہ کی نظامت بحسن و خوبی انجام دی۔ تمام شرکا کا شکریہ ڈاکٹر محمد ارشد نے ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 19 دسمبر 2019

بہار:

اررریہ میں فروغ اردو سمینار

اررریہ: محکمہ راج بھاشا اردو ڈائرکٹوریٹ کی ہدایت پر شہر کے قلب میں قائم ٹاؤن ہال کے وسیع و عریض ہال میں ضلع اردو سیل کے زیراہتمام فروغ اردو سمینار کا اہتمام کیا گیا۔ پروگرام کا باضابطہ آغاز ضلع مجسٹریٹ ویدناتھ یادو، ڈی ڈی سی انعام الحق انصاری، ضلع اردو سیل کے انچارج اور سینئر ڈپٹی کلکٹر سنجے کمار، آرگنائزر خالد حسین، محمد فاروق وغیرہ نے مشترکہ طور پر شمع روشن کرکے کیا۔ نظامت ہارون رشید غافل نے کی۔ آرگنائزر محمد فاروق نے سمینار کی غرض و غایت بیان کی۔ اردو مترجم خالد حسین نے کہا کہ اردو ایک ترقی یافتہ اور عام بول چال کے لیے سہل زبان ہے۔ اس کی ترقی اور فروغ کے لیے ہم سبھی پابند عہد ہیں۔ اردو مترجم صابر عالم نے کہا کہ اردو مرحلہ وار بہار میں ترقی کے منازل طے کر رہی ہے۔ ڈی ڈی سی انعام الحق انصاری نے ضلع مجسٹریٹ ویدناتھ یادو کا استقبال کیا۔ اردو سیل کے انچارج سنجے کمار نے خطبہ استقبالیہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان دنیا کی بہترین زبانوں میں سے ایک ہے۔ یہ محبت کا درس، اخوت کا پیغام اور آپسی بھائی چارہ کے فروغ کی زبان ہے۔ انھوں نے ہال میں موجود اساتذہ اور اردو دوست کے ازدحام پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ آج آپ کی شرکت سے پتہ چلا کہ اردو واقعی ترقی کر رہی ہے۔ ضلع مجسٹریٹ ویدناتھ یادو نے سمینار سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان کی طرح چاشنی اور شگفتگی کسی اور زبان میں نہیں ہے۔ انھوں نے اپنے بارے میں بتاتے ہوئے کہا کہ پہلے میں یونہی نغمہ سنتا تھا، سر اور لے سے محظوظ ہوجایا کرتا تھا مگر اب نغمہ، گیت اور غزل کے اردو الفاظ کے معانی سمجھنے لگا ہوں، تو سننے کا لطف دوبالا ہوجاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اپنی زبان سے صرف وہ لوگ ہی محبت کرسکتے ہیں جو دوسری کسی زبان سے محبت کریں گے اور اردو محبت کا درس دیتی ہے۔ انھوں نے اساتذہ کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ زندہ قومیں اپنی زبان اور تہذیب کی رکھوالی خود کرتی ہیں۔ اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کے لیے والدین اور سرپرست اپنے بچوں کو لازمی طور پر بطور مضمون اردو کو پڑھوائیں۔ اردو دنیا کی سب سے خوبصورت اور پیاری زبان ہے جس کی خوشبو ہر سو پھیلی ہوئی ہے۔ اس کے بعد سمینار کا آغاز ہوا جس میں معروف افسانہ نگار رفیع حیدر انجم نے اردو کی تاریخ، ارتقا اور امکانات پر سیر حاصل گفتگو کی۔ دوسرے مقالہ نگار الحاج غلام سرور نے کہا کہ اررریہ کی سرزمین اردو شعر و ادب کے لیے زرخیز ہے، یہاں سے اردو کے ایسے جیالے پیدا ہوئے ہیں، جنھوں نے اردو کے لیے بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اردو کے لیے ہمیں مزید جدوجہد کرنے کی ضرورت ہے۔ ادیب و شاعر رضی احمد تنہا نے مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اردو کے فروغ کے لیے اردو آبادی کو بیداری کا ثبوت دینا ہوگا۔ اردو کو اپنی روزمرہ کی گفتگو میں شامل کریں، یہی اردو کی ترقی ہوگی۔ نظامت بہار اسٹیٹ اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن کے ضلع صدر عبدالغنی نے کی۔ خالد حسین کے اظہار تشکر پر پروگرام اختتام پذیر ہوا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 6 دسمبر 2019

راجستھان:

ملٹی میڈیا ڈیجیٹل نمائش

جودھپور: سرکار اسکیمیں بناسکتی ہے، ان کی تشہیر کرسکتی ہے لیکن ان کی کامیابی کی کنجی عوام کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ ہندوستان کی ترقی، ہندوستانیوں کے اتحاد ہی میں مضمر ہے۔ ہندوستان کے بہتر مستقبل کے ضامن نئی نسل کے لوگ ہیں کیونکہ ہندوستان کی بڑی آبادی نوجوانوں پر مشتمل ہے۔ ان خیالات کا اظہار حکومت ہند کی وزارت اطلاعات و نشریات کے فیلڈ پبلسٹی بیورو کی طرف سے پانچ روزہ ملٹی میڈیا ڈیجیٹل نمائش کے اختتامی جلسے میں مولانا آزاد یونیورسٹی جودھپور کے وائس چانسلر پدم شری پروفیسر اختر الواسع نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے اپنے خطاب

میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں ماحولیات، صحت، جدید تکنیک اور اپنے ملک کے تحفظ کے تئیں بیدار اور سرگرم رہنا ہوگا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ دستور ہند کی پابندی اور سربلندی دونوں ہماری ذمے داری ہے۔ اس موقعے پر بی ایس ایف کے ڈی آئی جی شری مہندر سنگھ آئی ٹی بی پی کے کمانڈنگ افسر ڈی پی ایس راوت انڈین ریلویز سروسز کے سینئر رگھوویر سنگھ چارن بھی شامل ہوئے۔ پروگرام اور اپنے ڈپارٹمنٹ کی سرگرمیوں کا تعارف کراتے ہوئے مرکزی اسسٹنٹ ڈائرکٹر محترمہ مجنوبینا نے وضاحت کے ساتھ بتایا کہ سرکاری اسکیموں کی اہمیت کیا ہے اور ان کو کس طرح فروغ دیا جارہا ہے۔ اس موقعے پر فٹ انڈیا، اسکاؤٹ، جل یودھا، ڈیجیٹل انڈیا، میک ان انڈیا، آیوشمان بھارت، سوچھ بھارت، اسکل انڈیا اور لاسٹک کے استعمال نہ کرنے کی اسکیموں پر خاصا زور دیا گیا۔ آج کے اختتامی اجلاس میں مہمانِ خصوصی کے ہاتھوں مختلف اسکولوں اور کالجوں کے بچوں کو خصوصی انعامات دیے گئے۔ پروگرام میں بہت بڑی تعداد میں اساتذہ، طلبہ و طالبات اور معززین شہر کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔ ان میں مارواڑ مسلم ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے زیراہتمام چلنے والے اسکولوں اور دیگر اداروں کے طلبہ و اساتذہ اور ذمے داروں نے خصوصی دلچسپی کے ساتھ مختلف پروگراموں کو کامیاب بنانے میں اہم رول انجام دیا۔ پروگرام کی نظامت انوراگ پانڈے ریجنل پبلسٹی افسر نے کی اور شری کے آر سونی نے سب کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 6 دسمبر 2019

مغربی بنگال:

آل انڈیا یونانی طبی کانگریس کی جانب سے 35واں نیشنل سمینار

کولکاتا: عالیہ یونیورسٹی، کولکاتا میں آل انڈیا یونانی طبی کانگریس مغربی بنگال کے زیراہتمام 35واں نیشنل یونانی سمینار زیر صدارت پروفیسر مشتاق احمد منعقد ہوا۔ سمینار کو کامیاب بنانے میں سنٹرل کاؤنسل آف انڈیا، حکومت ہند اور اسٹیٹ کاؤنسل آف یونانی میڈیسن، حکومت بنگال کا اشتراک انتہائی اہم تھا۔ سنٹرل کاؤنسل آف انڈیا کے آبزرور کے طور پر ڈاکٹر آدم سسودیا (راجستھان) نے شرکت کی۔ پروگرام کا آغاز پروفیسر قیصر عزیز کی تلاوت قرآن پاک سے ہوا۔ پروگرام کے مہمان خصوصی ڈاکٹر محمد سکندر حیات صدیقی (ڈائرکٹر یونانی خدمات حکومت اترپردیش) نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ نیشنل یونانی یونیورسٹی اور ایمس یونانی کا قیام ناگزیر ہو چکا ہے۔ انھوں نے کہا کہ آل انڈیا طبی کانگریس کی تحریک پر ملک میں پانچ ریاستوں نے گورنمنٹ یونانی میڈیکل کالج قائم کیے اور اترپردیش وراجستھان میں علاحدہ محکمہ یونانی قائم ہوا جو یقیناً خوش آئند ہے۔ طبی کانگریس کی تحریک ملک گیر سطح پر منظم انداز میں کام کررہی ہے۔ پروفیسر مشتاق احمد نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ اس عظیم الشان سمینار کے انعقاد کا سہرا ڈاکٹر مجیب الرحمن (ممبر سی سی آئی ایم) کے سرجاتا ہے۔ انھوں نے یہ تاریخی تقریب منعقد کرکے یونانی ڈاکٹروں کو یہ پیغام دیا ہے کہ سرکاری امداد کے بغیر بھی بڑے سے بڑا پروگرام منعقد کیا جاسکتا ہے۔ مہمان ذی وقار کے طور پر ڈاکٹر سریش اگروال (وائس چانسلر پریاگ یونیورسٹی، جھارکھنڈ) نے کہا کہ طب یونانی کے فروغ کے لیے میں فیکلٹی آف یونانی میڈیسن قائم کرنے کا اعلان کرتا ہوں۔ یہ صدیوں پرانی پیتھی ہے اور اس کے ذریعے عوام الناس کی بھلائی ہورہی ہے۔ آل انڈیا یونانی طبی کانگریس مغربی بنگال کے جنرل سکریٹری اور ممبر سی سی آئی ایم مغربی بنگال ڈاکٹر مجیب الرحمن نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے مغربی بنگال میں طب یونانی کی صورت حال پر روشنی ڈالی۔ اس موقعے پر پروفیسر فضل اللہ قادری، پروفیسر زید عباس، ڈاکٹر سید عارض قادری، ڈاکٹر ظفر اقبال، ڈاکٹر محمد منہاج الدین خان، ڈاکٹر محمد نظام الدین، حکیم منظر صادق، ڈاکٹر پی این کانجی لال، ڈاکٹر امتیاز حسین وغیرہ نے بھی اظہار خیال کیا جبکہ ڈاکٹر سعدیہ فاطمہ اور ڈاکٹر وشنو گوپیال ستیہ نے علاج بالتدبیر پر بہت ہی پرمغز مقالہ پیش کیا۔ نظامت کے فرائض پروفیسر افتخار احمد نے انجام دیے۔ اس عظیم الشان سمینار کے انعقاد پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے آل انڈیا یونانی طبی کانگریس کے سکریٹری جنرل ڈاکٹر سید احمد خاں نے کہا کہ یہ امر یقیناً قابل رشک ہے کہ ملک میں نامساعد حالات کے باوجود زبردست سردی میں اطبائے یونانی نے اپنا حوصلہ دکھایا اور اتحاد کا مظاہرہ کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 31 دسمبر 2019

ہماچل پردیش:

انٹرمیڈیٹ کے اردو نصاب کی ترتیب و تعین قدر پر قومی ورکشاپ کا انعقاد

سولن: وزارت فروغ انسانی وسائل کی حکومت ہند کے محکمہ اعلیٰ تعلیم کے ادارے 'اردو تدریسی و تحقیقی مرکز' سولن (ہماچل پردیش) میں ایک ہفت روزہ ورکشاپ بعنوان 'انٹرمیڈیٹ اردو کورس: ترتیب و تدوین اور تعین قدر' کا انعقاد ڈاکٹر طارق خان، کارگزار پرنسپل کی زیر صدارت ہوا۔ ورکشاپ کے کنوینر ڈاکٹر ابوارشد نے جلسے کی نظامت کی۔ ڈاکٹر ابوارشد نے ورکشاپ کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ اس ورکشاپ کا مقصد انٹرمیڈیٹ سطح کے طلبہ کے لیے گذشتہ ورکشاپ میں تیار کیے گئے نصاب کی ترتیب و تدوین کرنا ہے، جس میں ہمیں زبان کے تقاضوں اور موجودہ رائج اصلاحات کا خیال رکھنا ہے۔ ڈاکٹر طارق خان نے کہا کہ اردو کی بدقسمتی ہے کہ اس کے سیکھنے کے لیے کوئی معیار متعین نہیں ہے۔ زبانوں کے مختلف ماہرین، اپنے اپنے طور پر معیار قائم کرتے ہیں۔ اس سے دیگر زبانوں کے طلبا کو زبان سیکھنے اور کوئی ایک معیار قائم کرنے میں بڑی دقت ہوتی ہے۔ ہمیں اس ورکشاپ کے ذریعے یکساں معیار کی ایسی کتاب تیار کرنی ہے جس میں اختلافات کم سے کم ہوں۔ ڈاکٹر طارق نے سی آئی آئی ایل (میسور) کے دیگر منصوبوں کے تعلق سے بھی اظہار خیال کیا۔ اس موقعے پر پروفیسر اسلم جمشید پوری (میرٹھ) نے اردو زبان کی اہمیت و افادیت کے علاوہ اس کے تدریسی پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ اس افتتاحی اجلاس میں ڈاکٹر زبیر شاداب (علی گڑھ)، احمد بدر (جمشید پور) اور ڈاکٹر معراج الحسن (مرادآباد) نے اردو زبان کے تدریسی مسائل اور تدارک پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ جلسے میں ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی (امروہہ) ڈاکٹر سید تنویر حسن (امروہہ)، ڈاکٹر عبدالرشید (دہلی)، ڈاکٹر آفتاب عالم، ڈاکٹر آفتاب عالم نجمی (علی گڑھ)، ڈاکٹر عائشہ (امروہہ)، ڈاکٹر محمد مونس (پٹیالہ)، ڈاکٹر نصرت جہاں (کولکاتا)، ڈاکٹر حنا آفرین وغیرہ نے شرکت کی اور اپنے مفید مشوروں سے نوازا۔

ورک شاپ میں ایک ادبی نشست کا انعقاد بھی عمل میں آیا۔ نشست کی صدارت معروف اسکالر اور ادیب ڈاکٹر معراج الحسن اور نظامت معروف شاعر و ناقد ڈاکٹر زبیر شاداب نے کی۔ ادبی نشست میں پورے ہندوستان سے تشریف لائے اسکالرز اور دانشوروں نے شرکت کی۔ پہلے دور میں آفتاب عالم نجمی (علی گڑھ)، ڈاکٹر ابوارشد اعظمی (سولن)، ڈاکٹر عبدالرشید اعظمی (دہلی)، ڈاکٹر احمد بدر (جمشید پور) نے غزلیں اور نظمیں سنا کر سامعین کو مسحور کردیا۔ ڈاکٹر آفتاب نجمی نے 'گھر سے پنگھٹ، پنگھٹ سے گھر' اور 'تم' نظمیں اور زبیر شاداب نے 'زندگی' نظم بھی پیش کی۔ نشست کے دوسرے دور میں ڈاکٹر آفتاب عالم نجمی نے اپنا افسانہ 'پودا' پیش کیا، پھر معروف افسانہ نگار اسلم جمشید پوری نے اپنا افسانہ 'گئودان سے پہلے' سنایا۔

افسانے میں گائے کو لے کر موجودہ صورت حال کی عکاسی کی گئی تھی۔ صدارت کرتے ہوئے ڈاکٹر معراج الحسن نے 'گئو دان سے پہلے' کو موجودہ عہد کا ایسا افسانہ قرار دیا جس میں عصری حسیت کی بہترین غمازی کی گئی تھی۔ انھوں نے مزید کہا کہ یہ اسلم جمشید پوری کا بہترین کامیاب افسانہ ہے۔ انھوں نے 'پودا' کو بھی مخصوص نقطۂ نظر کا ایک بہترین افسانہ قرار دیا۔ بعد ازاں صدر محترم نے اپنا ایک مقالہ 'شعر برائے زندگی یا شعر برائے غزل' پڑھ کر سنایا، جسے خوب پسند کیا گیا۔ ڈاکٹر ابوار شد اعظمی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 6و8 دسمبر 2019

ہریانہ :

الطاف حسین حالی پر سمینار

ہریانہ: پانی پت کے عالمی شہرت یافتہ مصلح قوم، شاعر الطاف حسین حالی پر ایس ڈی پی جی کالج میں ایک روزہ

سمینار و مشاعرہ کا انعقاد ہوا۔ حالی کا سنہ پیدائش 1837 اور یوم وفات 31 سمبر 1914 ہے۔ اس مناسبت سے خراج عقیدت کے طور پر منعقد سمینار و مشاعرہ کی صدارت ڈائرکٹر ہریانہ اردو اکادمی ڈاکٹر چندر ترکھانے فرمائی۔ افتتاحی موقعے پر ڈاکٹر چندر ترکھا نے اکادمی کا تعارف پیش کیا اور کارگزاریوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ہمیں محبت کے چراغوں کی لو کی حفاظت کرنی ہے۔ پانی پت میں اس قسم کی ادبی تقریبات کا انعقاد ہمیں حوصلہ بخشتا ہے۔ مہمان کی حیثیت سے شریک ہوئے ممبر پارلیمنٹ سنجے بھاٹیا نے کہا کہ وہ سرکار سے بات کریں گے کہ سرکار حالی کے نام سے یونیورسٹی قائم کرے۔ اپنے اظہار خیال میں سنجے بھاٹیہ نے یہ بھی پیغام دیا کہ حالی کی انسانیت پر موقوف تعلیمات سے مستفیض ہو کر ہی قوم کی زبوں حالی دور کی جاسکتی ہے۔ سمینار میں بھارتیہ جنتا پارٹی مہیلا مورچہ کی صدر ڈاکٹر ارچنا گپتا اردو کے مشہور ادیب ندیم اور جھیکش ڈاکٹر شاہ نواز بھی اس بزم کا حصہ بنے۔ جبکہ مشاعرے میں ڈاکٹر کے کی رشی، ڈاکٹر نفس انبالوی، سراج پیکر، کمار پانی پتی، نشچل بھٹناگر دیگر اکادمی کارکنان اور ذمہ داران موجود رہے۔ ایس ڈی کالج کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ایس این گپتا اور پرنسپل ڈاکٹر انوپم اروڑا نے مہمانوں کو پودے پیش کر کے پرتپاک استقبال کیا۔ اس ایک روزہ تقریب کی نظامت راجیو رنجن کی نظامت کے دوران شرکا کو راجیو رنجن نے بتایا کہ حالی عظیم شخص، ماہر تعلیم، بڑے شاعر، عمدہ ناقد اور ملک وقوم کے لیے دل میں درد رکھتے تھے، بھائی چارگی کی بہترین مثال تھے، حالی جیسے لوگ دنیا میں کبھی کبھی جنم لیتے ہیں۔ اس موقعے پر ڈاکٹر چندر ترکھا کے ذریعے لکھی گئی الطاف حسین حالی کی شخصیت اور فن کا محاصرہ کرنے والی کتاب کا بھی رسم اجرا عمل میں آیا، جسے اردو اکادمی ہریانہ نے اپنے اشاعتی سلسلے کے تحت شائع کیا ہے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 4 جنوری 2020

اعزاز و اکرام :

ساہتیہ اکادمی کے ایوارڈ کے لیے پروفیسر شافع قدوائی (اردو) منتخب

نئی دهلی: ساہتیہ اکادمی ایوارڈ کے لیے ناموں کا اعلان کر دیا گیا ہے جس میں ہندی کا ساہتیہ اکادمی ایوارڈ نند کشور اچاریہ کو، انگریزی کا ممبر پارلیمنٹ ڈاکٹر ششی تھرور کو، اردو کے لیے پروفیسر شافع قدوائی کو، پنجابی زبان کے لیے کرپال کازک اور سنسکرت کے لیے پینامد ھوسودن سمیت 23 ہندوستانی زبانوں کے تخلیق کاروں کو سال

2019 کے لیے ساہتیہ اکادمی ایوارڈ دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ ساہتیہ اکادمی کے سکریٹری کے سرینواس راؤ نے ایک بیان جاری کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس بار شعری مجموعہ، چار ناول، چھ کہانی کا مجموعہ، تین مضامین کا مجموعہ اور ایک غیر افسانہ نثر، خودنوشت اور سوانح عمری کے لیے 7 ایوارڈ دیے جا رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ایوارڈز کی سفارش 23 ہندوستانی زبانوں کی کمیٹیوں نے کی تھی اور انھیں ساہتیہ اکادمی کے صدر ڈاکٹر چندر شیکھر قمبار کی زیر صدارت اکادمی کے ایگزیکٹو بورڈ کے اجلاس میں منظور کیا گیا۔ سری نواس راؤ کے مطابق پروفیسر شافع قدوائی کو 'سوانح سرسید: ایک جدید (سوانح عمری) کے لیے ایوارڈ سے نوازا جائے گا۔ یہ ایوارڈ یکم جنوری 2013 سے 31 دسمبر 2017 تک شائع ہونے والی کتابوں کو دیا گیا ہے۔ ایوارڈ یافتہ افراد کو ایک تمغہ، شال اور ایک لاکھ روپے کی رقم سے نوازا جائے گا۔ یہ اعزاز اس سال 25 فروری 2020 کو دہلی میں منعقدہ ساہتیہ اکادمی کی تقریب میں دیا جائے گا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 19 دسمبر 2019

پروفیسر شاہد مہدی

امروهه: جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر، سینئر آئی ایس افسر اور ملک کے کئی ثقافتی اداروں بالخصوص انڈیا

ہیریٹیج سینٹر کی سرپرستی کرنے والی اہم شخصیت پروفیسر شاہد مہدی کو جامعہ ہمدرد کا چانسلر منتخب ہونے پر پدم شری ڈاکٹر محسن ولی نے مبارکباد پیش کی ہے۔ اس سلسلے میں ایک تہنیتی جلسہ کا انعقاد دہلی کے انڈیا انٹرنیشنل سینٹر میں کیا گیا جس میں اظہار خیال کرتے ہوئے پدم شری ڈاکٹر محسن ولی نے کہا کہ پروفیسر شاہد مہدی ایک علم دوست شخصیت ہیں، جنھوں نے ہمیشہ قوم کو تعلیم یافتہ بنانے کے لیے نئی نسل میں تعلیم کے سلسلے میں بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی۔ 1963 کے آئی ایس بیچ میں ان کو دوسرا مقام حاصل ہوا تھا۔ ہماری تنظیم کو آپ کی ہمیشہ سرپرستی حاصل رہی اور آپ نے ملک کے اہم عہدے پر فائز رہ کر کارہائے نمایاں انجام دیے اور آپ کو جامعہ ہمدرد کی اہم ذمے داری سپرد کی گئی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہاں بھی آپ کی کامیابی کا سفر جاری رہے گا۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 15 دسمبر 2019

حیدرآبادی شاعرہ سرشتاوانی کولی

حیدرآباد: حیدرآبادی شاعرہ کو 60 لاکھ روپے آسٹریلیائی اسکالرشپ حاصل ہوئی۔ واضح رہے کہ 19 سالہ شاعرہ

سرشتا وانی کوہلی کو آسٹریلیا کی یونیورسٹی آف وولونگونگ سے یہ ایوارڈ ملا ہے۔ قابل ذکر ہے کہ انھوں نے اپنی پہلی نظموں کی کتاب 'وائلڈ ونگس' شائع کی تھی۔ اس خصوص میں ویڈیو اپلی کیشن داخل کرنے کے بعد ان کا انتخاب کیا گیا۔ انھوں نے موضوع 'میں دنیا کو کس طرح بدلوں گی' پر ویڈیو اپلی کیشن داخل کیا تھا جس میں انھوں نے کہا تھا کہ وہ اپنی تحریروں کے ذریعے دنیا کو بدلیں گی۔ قابل ذکر ہے کہ اس تحریر پر ہی ان کا انتخاب کیا گیا۔ انھوں نے آگے کہا کہ وہ پہلی ہندوستانی لڑکی ہیں جن کو اس یونیورسٹی سے رواں سال یہ اسکالرشپ ملی ہے۔ کوہلی، بنگلورو کی یونیورسٹی آف ریوا سے لا کی تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ وہ مارچ 2020 میں آسٹریلیا کا سفر کریں گی۔

روز نامہ 'میرا وطن' دہلی، 30 دسمبر 2019

عائشہ سمن

لکھنؤ: بزم اردو لکھنؤ کی جانب سے ممبئی سے تشریف لائیں مہمان شاعرہ پروفیسر عائشہ سمن کے اعزاز میں ایک تقریب کا انعقاد بعنوان 'محفل سمن' بزم اردو لکھنؤ کی جوائنٹ سکریٹری محترمہ تسنیم رحمٰن کی رہائش گاہ پر ہوا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر رخسانہ نکہت لاری نے لکھنؤ کے شعری پس منظر کا جامع انداز میں تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ لکھنؤ کے شعرو سخن میں ماضی کے بہ نسبت حال میں کافی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں، موجودہ عہد کی جدید شاعرانہ فکر نے شعری مزاج کو بالکل بدل کر رکھ دیا ہے۔ محترمہ تسنیم رحمٰن نے مہمان شاعرہ پروفیسر عائشہ سمن کے کلام پر سیر حاصل گفتگو کی اور ان کے طرز سخن کو ایک منفرد لب ولہجہ کا نام دیا۔ تعلیم گاہ نسواں انٹر کالج کی پرنسپل محترمہ تبسم قدوائی نے کہا کہ کسی بھی شاعر یا شاعرہ کے کلام کا اندازہ اس کی فکر اور شعور ادراک سے ہوتا ہے۔ جس کی فکر جتنی زیادہ بلند ہوگی اس کی شاعری اسی درجے میں شعور ادراک کی حامل ہوگی۔ جس کی تازہ مثال پروفیسر عائشہ سمن کی شاعری ہے۔ اس اعزازی نشست میں پروفیسر عائشہ کے کلام کو خوب داد و تحسین سے نوازا گیا۔ پروفیسر عائشہ نے اپنا شعری مجموعہ حاضرین کو پیش کیا۔ نظامت کے فرائض محترمہ تبسم قدوائی نے انجام دیے۔ اظہار تشکر تسنیم رحمٰن نے کیا۔

روز نامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 9 دسمبر 2019

ڈاکٹر آفتاب احمد نعمانی

دھامپور: اردو ادب انجمن ویلفیئر سوسائٹی کے زیر اہتمام ایک اعزازیہ تقریب اور مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا جس میں معروف صحافی شاعر ڈاکٹر آفتاب نعمانی کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں بے باک صحافی اور جدید شاعر اعزاز سے اور آکاش وانی الہ آباد کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر لوکیش شکلا کو کوی سمان کے اعزاز سے شال اوڑھا کر امتیازی نشان دے کر سرفراز کیا گیا۔ شعرائے کرام نے اپنا عمدہ کلام پیش کرکے خوب داد و تحسین حاصل کی۔ اعزازیہ تقریب کو خطاب کرتے ہوئے پروگرام کے صدر ڈاکٹر فریدالدین نے کہا کہ اردو زبان کسی مذہب کی ملکیت نہیں ہے بلکہ ہر بولنے اور سمجھنے والے کی زبان ہے۔ اردو تمام زبانوں کا مرکب ہے۔ یہ بہت شیریں زبان ہے بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ اردو کے بغیر دوسری زبانوں کو عمدگی کے ساتھ بولا نہیں جاسکتا ہے۔ رویندر رستوگی نے اپنے خطاب میں کہا کہ موجودہ حالات بڑے دکھ بھرے ہیں، ان سے مقابلہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں ملک کی گنگا جمنی تہذیب کو برقرار رکھنا ہے۔ شاعر اور ادیب اپنی غزلوں کے ذریعے اتحاد کا پیغام دیں۔

روز نامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 17 دسمبر 2019

ڈاکٹر طارق اشرف

نئی دھلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کے لائبریرین ڈاکٹر طارق اشرف کو نئی دہلی کے مینجمنٹ لائبریریز نیٹ ورک نے سال 2019 کے لیے 'بہترین لائبریرین ایوارڈ' سے نوازا ہے۔ اس ایوارڈ کو لائبریری پیشے کے سب سے پروقار ایوارڈ میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ ایوارڈ ڈاکٹر اشرف کو ان کی عمدہ خدمات کے اعتراف اور لائبریری پیشے میں ان کی نمایاں کارکردگی کو دیکھتے ہوئے دیا گیا ہے۔ ایوارڈ کی تقریب پارول یونیورسٹی، وڈودرا میں منعقد ہوئی۔ یہ ایوارڈ شال، توصیفی سند اور دس ہزار روپے کی رقم پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر اشرف لائبریری آٹومیشن، ڈیجیٹائزیشن اور معلومات خواندگی کے شعبے میں باقاعدگی سے سمینار/تربیت اور ورکشاپس کا انعقاد کرتے رہے ہیں۔ ڈاکٹر اشرف نے مختلف قومی اور بین الاقوامی جرائد میں 45 سے زائد مضامین نیز تحقیقی مقالے تحریر کیے ہیں اور یو جی سی کے آن لائن لرننگ پروگرام ای پی جی پاٹھ شالہ کے 8 ماڈیولز سمیت 16 کتابیں/ کانفرنس پروسیڈنگ وغیرہ کی تصنیف و تدوین کی ہے۔ ان کے تحقیقی کام کو وسیع پیمانے پر شناخت ملی ہے اور محققین نے بطور حوالہ اس کا استعمال کیا ہے۔ انھوں نے مختلف پیشہ ورانہ گرانٹس اور دعوت ناموں پر امریکہ، جاپان، متحدہ عرب امارات، سنگاپور، ہانگ کانگ، فلپائن، جرمنی، اٹلی، جنوبی کوریا، پولینڈ اور ملائشیا وغیرہ کا سفر کیا ہے۔ ڈاکٹر اشرف نے دہلی یونیورسٹی سے لائبریری اور انفارمیشن سائنس میں ماسٹر اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے۔

روز نامہ 'میرا وطن' دہلی، 3 جنوری 2020

اے رحمان کی کتاب 'نقطہ نظر' کا اجرا

رسم اجرا:

نقطہ نظر

نئی دھلی: پرگتی میدان میں چل رہے عالمی کتاب میلے میں نیشنل بک ٹرسٹ کے ثقافتی پروگرام کے تحت عالمی اردو ٹرسٹ کے زیر اہتمام انقلاب کے ایڈیٹر (نارتھ) شکیل حسن شمسی کی صدارت میں ایک مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس کی نظامت ڈاکٹر وسیم راشد نے کی اور معروف ماہر لسانیات اور ناقد پروفیسر نصیر احمد خاں بطور مہمان خصوصی شریک ہوئے۔ مشاعرے میں جن شعرا اور شاعرات نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا ان کے نام ہیں: علینا عترت، اتر ونا شرما، نینا سحر، وسیم راشد، صبا عزیز، سنیتا رینا، سریتا جین، چاندنی پانڈے، پی پی سریواستو رند، پروفیسر اخلاق آہن، پروفیسر احمد محفوظ، افضل منگلوری، معین شاداب، مشتاق صدف، فاروق ارگلی، انجم جعفری، عامر سلیم خاں، اسلم راشد، منیر ہمدم، ایم آر قاسمی، بنت ان نایاب، رؤف رامش، تابش خیر آبادی، امیر امروہوی، جاوید قمر، ڈاکٹر وجے متل، منوج شاشوت اور اے جا گیات۔ اس موقعے پر عالم اردو ٹرسٹ کے چیئرمین اے رحمان کی ایک کتاب بعنوان 'نقطہ نظر' کا اجرا بدست شکیل حسن شمسی عمل میں آیا جو اردو اخبار 'انقلاب' اور 'میرا وطن' میں شائع ہوئے ان کے مضامین کا انتخاب ہے جسے کتابی شکل میں شائع کیا گیا۔

روز نامہ 'میرا وطن' دہلی، 13 جنوری 2019

ڈاکٹر امام اعظم کے مونوگراف 'مظہر امام' کا اجرا

ناصر امروہوی کے شعری مجموعہ 'میں اور تم' کا اجرا

اسٹریٹجک ہیومن ریسورسز مینجمنٹ، ٹیکسٹ اینڈ کیس اسٹڈیز

علی گڑھ: فضا تبسم اعظمی کی معرکۃ الآرا تصنیف بعنوان 'اسٹریٹجک ہیومن ریسورسز مینجمنٹ، ٹیکسٹ اینڈ کیس اسٹڈیز' کا اجرا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر طارق منصور کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ کیمبرج یونیورسٹی پریس سے شائع ہوکر منظر عام پر آنے والی اس کتاب میں عملی تجربات، مثالیں اور واقعات طلبا اور ہیومن ریسورسز سے

وابستہ مینجروں کے لیے نہایت مفید اور کارآمد ہیں۔ اس کتاب کی مصنفہ اور اے ایم یو کے شعبۂ بزنس ایڈمنسٹریشن سے وابستہ فضا تبسم نے اس موقعے پر کہا کہ ''کتاب لکھنا ایک مشکل عمل ہے، کسی تصنیف کے لیے متعلقہ موضوع پر اپنے خیالات و نظریات کو جمع کرنا پڑتا ہے اور پھر اس موضوع کے جملہ تقاضوں کی تکمیل کی جاتی ہے۔'' فضا تبسم نے کہا کہ ''میری بھرپور کوشش رہی ہے کہ ہندوستان کے تناظر میں ہیومن ریسورسز مینجمنٹ کے موضوع پر بھرپور اور تازہ معلومات پیش کروں۔'' اجرا کی اس تقریب میں متعدد اہم شخصیات موجود تھیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 9 دسمبر 2019

میں اور تم

امروھہ: شہر کے معروف نوجوان شاعر ڈاکٹر ناصر امروہوی کا اولین شعری مجموعہ 'میں اور تم' دہلی میں چل رہے اردو زبان و ادب کے سہ روزہ جشن 'جشن ریختہ' میں ایک سادہ اور پروقار تقریب میں منظرِ عام پر آیا۔ نایاب بک سینٹر پر اس مجموعے کا اجرا جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق صدر شعبہ اردو پروفیسر خالد محمود کے دست مبارک سے ہوا۔ اس موقعے پر گوا سے تشریف لائیں معروف شاعرہ فوزیہ رباب مہمان خصوصی کے طور پر موجود تھیں۔ ریختہ فاؤنڈیشن کے ایڈیٹر سالم سلیم اور معروف شاعرہ شبنم صدیقی مہمان ذی وقار تھے۔ نظامت کے فرائض نوجوان شاعر سید شیبان قادری نے انجام دیے۔ واضح ہو کہ دیوناگری رسم الخط میں یہ مجموعہ غزلوں، نظموں اور متفرق اشعار پر مشتمل ہے۔ اس سے قبل اردو زبان و ادب سے متعلق ناصر امروہوی کی دو کتابیں منظر عام پر آکر مقبولیت حاصل کرچکی ہیں۔ پروفیسر خالد محمود نے کہا کہ دیوناگری میں مجموعے کی اشاعت اس امر کی غماز ہے کہ شاعر اپنا اردو کلام اردو زبان و شاعری کے ان شائقین تک پہنچانا چاہتا ہے جو اردو رسم الخط سے ناواقف ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اردو شاعری کے شائقین کو چاہیے کہ وہ اردو رسم الخط سیکھیں، کیونکہ کسی بھی زبان کی بقا اس کے رسم الخط میں ہے۔ فوزیہ رباب نے کہا کہ ناصر امروہوی کی شاعری روایت اور جدت کا حسین امتزاج ہے۔ آخر میں ڈاکٹر خالد مبشر اور محمد انس فیضی نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 16 دسمبر 2019

درخشاں ستارے

نئی دھلی: ساحر داؤدنگری کی تنقیدی کتاب 'درخشاں ستارے' کا اجرا عمل میں آیا۔ مشتاق احمد نوری کی رہائش 'نورستان' عظیم آباد کے ادبا اور شعرا سے کھچاکھچ بھری ہوئی تھی۔ خورشید اکبر کی صدارت میں اس کتاب کا اجرا اسلم حسن ایڈیشنل کمشنر ایکسایز، مشتاق احمد نوری، قاسم خورشید، ناشاد اورنگ آبادی، فخرالدین عارفی، حسن ظفر صدیقی اور جنوں اشرفی کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ سب سے پہلے مشتاق احمد نوری نے مہمانوں کا استقبال کیا اور ساحر داؤدنگری کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا کہ ساحر بنیادی طور پر صحافی ہیں اور انصاری اطہر حسین کی حیثیت سے دہلی 'صدائے انصاری' نکالتے ہیں جس کے شمارے صحافتی اور ادبی اعتبار سے اپنی مثال آپ ہیں لیکن ساحر داؤدنگری کے قلمی نام سے وہ شاعری کرتے ہیں اور ادبی مضامین لکھتے ہیں۔ ان کی شاعری میں عصر کا عکس دیکھا جاسکتا ہے وہ دھیمے لہجے میں بڑی بات کہنے کے ہنر سے واقف ہیں۔ ان کا شعری مجموعہ شائع ہوچکا ہے جس پر انھیں بہار اردو اکادمی کا انعام بھی ملا ہے۔ اچانک تنقیدی مضامین کا مجموعہ درخشاں ستارے لاکر انھوں نے سب کو حیرت زدہ کردیا ہے۔ اس کتاب میں 23 مضامین شامل ہیں جو شاعروں، افسانہ نگاروں اور صحافیوں کا جائزہ پیش کرتے ہیں۔ فخرالدین عارفی نے اپنے مخصوص لہجہ میں بہترین نظامت کرتے ہوئے ساحر داؤدنگری کے کام کو سراہا اور مسکراتے ہوئے کہا کہ جس طرح آپ نے مشتاق احمد نوری کو ان کے فکشن میں دریافت کیا ہے تو ان کا یہ حق بھی بنتا ہے کہ یہ کتاب انھیں ہی معنون کی جائے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 15 دسمبر 2019

مظہر امام

دربھنگہ: مانو کولکاتا ریجنل سینٹر میں ڈاکٹر امام اعظم (ریجنل ڈائرکٹر) کی کتاب 'ہندوستانی ادب کے معمار: مظہر امام' (مونوگراف، ساہتیہ اکادمی) کی رونمائی دربھنگہ سے تشریف لائے معروف ناقد، محقق، شاعر اور صحافی پروفیسر مشتاق احمد (پرنسپل، سی ایم کالج، دربھنگہ و مدیر اعزازی 'جہان اردو' دربھنگہ) کے ہاتھوں انجام پائی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر افتخار احمد (صدر، شعبۂ فارسی، مولانا آزاد کالج، کولکاتا)، جناب ایم نصراللہ نصر (ہوڑہ)، ڈاکٹر محمد مظہر قادری (اے آر ڈی، مانو کولکاتا)، جناب صابر رضا شمسی (مٹیابرج)، شاہد اقبال، راحیل شاداب، محمد جاوید رضا و دیگر حضرات موجود تھے۔ محفل کی صدارت ڈاکٹر امام اعظم نے کی جبکہ پروفیسر مشتاق بحیثیت مہمانِ خصوصی اور ڈاکٹر افتخار احمد بحیثیت مہمانِ اعزازی موجود تھے۔ ڈاکٹر امام اعظم کی زیر نظر کتاب مظہر امام پر ان کی چوتھی کتاب ہے۔ اس سے قبل 'نصف ملاقات' (مرحوم مشاہیر کے خطوط مظہر امام کے نام)، 'مظہر امام کی تخلیقات کا تنقیدی مطالعہ' اور 'مظہر امام: شخصیت سیریز' (برائے اتر پردیش

امتیاز غدر کے ناول 'علی پور بستی' کا اجرا

اردو اکادمی) شائع ہو چکی ہیں۔ اخیر میں شاہد اقبال کے کلمات تشکر کے ساتھ محفل برخاست ہوئی۔

روزنامہ 'تاثیر' دربھنگہ، 27 دسمبر 2019

علی پور بستی

نئی دہلی: ایوانِ غالب میں امتیاز غدر کے ناول 'علی پور بستی' کی رسم اجرا کا انعقاد حالی پبلشنگ ہاؤس اور سہ ماہی ادب سلسلہ کے زیر اہتمام کیا گیا۔ رسم اجرا بدست فقیر اردو فاروق ارگلی، ناول نگار مشرف عالم ذوقی، ناول علی پور بستی کے مصنف امتیاز غدر، ادیب و صحافی حبیب سیفی، شاعر بشیر چراغ، ادیب و ناقد عمران عظیم، محمد سرفراز عالم، ایڈووکیٹ رئیس فاروقی، انصاری اطہر حسین و مدیر ادب سلسلہ سلیم علیگ عمل میں آئی۔ تقریب کی نظامت ریسرچ اسکالر نوجوان غلام نبی کمار نے انجام دی۔ فاروق ارگلی کے مطابق ناول لکھنا آسان کام نہیں، ایسی تحریریں بیداری کا فریضہ انجام دیتی ہیں اور قوم کی ترجمانی کرتی ہیں۔ بہر حال امتیاز غدر اور ناول کے نام میں موزونیت بھی چیز دیگر ہے۔ امتیاز غدر چونکہ درس و تدریس سے وابستہ ہیں اس لیے انھوں نے یہ کام بہت ہی سلیقگی سے کیا ہے۔ عمران عظیم کا خیال تھا کہ امتیاز غدر نے اپنے افسانوں کی طرح ناول میں غلط مردم شماری کے نتائج کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کا خمیازہ صحیح لوگوں کو بھگتنا پڑتا ہے۔ خورشید اکبر کی زبانی ناول کو صرف مردم شماری تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔ قوم کی پستی اور زبوں حالی بھی اس ناول کا اہم حصہ ہے۔ بشیر چراغ کے مطابق احتجاجی لہجہ اگر ادیب کے یہاں پایا جاتا ہے تو اس سے بڑی بات اور کیا ہو سکتی ہے، جو قلمکار اپنا کام بہ احسن انداز انجام دیتا ہے۔ 'نیر ادب' سلسلہ کے مدیر سلیم علیگ نے اظہار تشکر کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 29 دسمبر 2019

'درخشاں ستارے' اور 'دارالعلوم وقف دیوبند اور حکیم الاسلام'

دیوبند: دارالعلوم وقف دیوبند کے استاذ مولانا محمد اسلام قاسمی کی 'درخشاں ستارے' اور 'دارالعلوم وقف دیوبند اور حکیم الاسلام' نامی دو کتابوں کا اجرا دارالعلوم وقف دیوبند کے مہتمم مولانا محمد سفیان قاسمی کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس موقعے پر مولانا محمد سفیان قاسمی نے صاحب کتاب کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ مولانا ایک قدیم منجھے ہوئے صاحب طرز و صاحب فکر و نظر ادیب ہیں، ان کے مضامین کی انفرادیت کے گواہ ہندوستان کے مختلف رسائل و مجلات ہیں۔ ان کی تحریری بانکپن اور سلاست و روانی کا زمانہ قائل ہے۔ انھوں نے ہر موضوع پر لکھا اور خوب لکھا ہے۔ ہر موضوع کا کلی جزئی احاطہ کرنا ان کی تحریر کا خاص اسلوب ہے۔ بھٹکل سے تشریف لائے جناب مولانا عبدالمتین منیری نے مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مولانا محمد اسلام قاسمی کا قلم عربی و اردو دونوں زبانوں میں یکساں طور پر ہمیشہ رواں رہا ہے۔ متعدد عناوین و موضوعات پر ان کی تحریریں دیکھی اور پڑھی جاتی ہیں۔ جب وہ کسی موضوع پر لکھتے ہیں تو اس تفصیل سے لکھتے ہیں کہ موضوع کا مکمل حق ادا ہو جائے۔ ان کی تحریریں ہمیشہ جامعیت کے ساتھ شستہ و شائستہ رہی ہیں۔ مؤلف کتاب مولانا محمد اسلام قاسمی نے حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ دارالعلوم دیوبند اور خانوادۂ قاسمی خصوصاً حضرت حکیم الاسلام پر مفصل سوانح حیات اور بہت سی تحریرات منظر عام پر آ چکی ہیں لیکن میری خواہش تھی کہ ذاتی طور پر حضرت کی عظیم و ناقابل فراموش خدمات کو سپرد قلم کروں اور اس سلسلے میں جو بہت سی یادیں اور نقوش ذہن و قلوب پر نقش تھے ان سے نسل نو کو متعارف کراؤں۔ یہی مقصد اس کتاب کی تالیف کا محرک بنا۔ دوسری کتاب 'درخشاں ستارے' ان درسگاہوں اور اساتذۂ کرام کے تذکروں پر مشتمل ہے جن سے میں نے اکتساب فیض کیا جنھیں میں نے عرصے سے جمع کیا تھا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 3 دسمبر 2019

کوئی آنکھوں میں رہتا ہے

دیوبند: آل انڈیا بزم عنوان چشتی کے زیر اہتمام محلہ پٹھانپورہ لام پر واقع سماجی کارکن مسعود خاں رانا کی رہائش گاہ پر ایک پروگرام کا انعقاد کیا گیا، جس میں شاعر ڈاکٹر صادق دیوبندی کے مجموعہ کلام پر مشتمل ان کی نئی کتاب 'کوئی آنکھوں میں رہتا ہے' کا اجرا عمل میں آیا۔ پروگرام کا افتتاح سماجی کارکن ارون اگروال نے فیتہ کاٹ کر کیا۔ صدارت پروفیسر تنویر چشتی نے کی جبکہ شمع روشن شاعر و کوی ڈاکٹر شمیم دیوبندی نے کی۔ اس موقعے پر پروفیسر تنویر چشتی نے ڈاکٹر صادق دیوبندی کو ان کی تیسری تخلیق پر انھیں مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر صادق دیوبندی نئی نسل کے بہترین شاعر ہیں، ان کی شاعری سامعین کے دل و دماغ پر گہرا اثر کرتی ہے، ان کی اس کتاب کے لیے انھیں مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ دہلی سے آئے مہمان خصوصی شاعر شاہد انجم نے کہا کہ ڈاکٹر صادق دیوبندی ادبی میدان میں نمایاں مقام حاصل کر رہے ہیں، ان کی سنجیدہ شاعری سے نئی نسل متاثر ہو رہی ہے۔ علاوہ ازیں سماجی کارکن ارون اگروال اور ضرار بیگ نے بھی اپنے خطاب کے دوران ڈاکٹر صادق دیوبندی کو ان کی نئی کتاب کے لیے مبارکباد پیش کی۔ پروگرام کی نظامت جگر دیوبندی نے کی۔ آخر میں چاند دیوبندی نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 3 دسمبر 2019

پرچھائیاں

رامپور: متعدد افسانوں کی خالق معروف ادبی شخصیت خورشید جہاں کے پہلے ناول 'پرچھائیاں' کی رسم رونمائی ایک پروقار تقریب کے دوران عمل میں آئی۔ جیمس واٹ جونیئر ہائی اسکول گھیر کٹے باز خاں میں منعقد ادبی تقریب کی صدارت ماہر تعلیم و سابق پرنسپل حامد انٹر کالج اسرار احمد نے کی۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے معروف افسانہ نگار، ناول نگار و اسکرپٹ رائٹر ایس فضیلت اور مہمان ذی وقار کے طور پر انجینئر انور کیفی (مرادآباد)، پروفیسر الف ناظم (گورنمنٹ گرلز پی جی کالج رامپور) اور رابع حسن (محقق و افسانہ نگار مرادآباد) جلوہ افروز رہے جبکہ نظامت کے فرائض معروف محقق و پروفیسر مرادآباد مسلم ڈگری کالج ڈاکٹر رباب انجم نے اپنے منفرد انداز میں ادا کیے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر شریف احمد قریشی پرنسپل ہیرا لال میموریل ڈگری کالج مہدی پور، ملک نے اپنا کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ دنیائے علوم و فنون میں ریاست رامپور کو عہد نوابین ہی میں جو نمایاں مقام حاصل ہو گیا تھا وہ ارتقائی منازل طے کرتا ہوا بڑی حد تک آج بھی برقرار ہے۔ ڈاکٹر شریف قریشی نے مزید کہا کہ 'پرچھائیاں' خورشید جہاں کا پہلا ناول ہے، جس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے اردگرد کے ماحول

معاشرے اور زندگی کی صداقتوں کو بڑی خوبی سے اجاگر کیا ہے۔ ان کے لہجے میں مقامی الفاظ کی پٹ بھی ہے، شفافیت بھی ہے، بے باکی بھی ہے اور کہیں کہیں ایک خاص قسم کا تیکھاپن بھی ہے۔ انھوں نے سماج اور معاشرے کو جیسا دیکھا، بھرا بھٹکتا اور محسوس کیا، اسی کی پرچھائیوں کو 'پرچھائیاں' کی شکل میں ڈھال دیا۔ آخر میں تقریب کے روح رواں ڈاکٹر اطہر مسعود خاں، سلیم خاں اور تقریب کے کنوینر فیصل شاہ خاں ایڈوکیٹ نے سبھی کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 9 دسمبر 2019

وفیات :

پروفیسر سید محمد عقیل رضوی

الہ آباد: ممتاز ترقی پسند ادیب، نقاد اور دانشور پروفیسر سید محمد عقیل رضوی کا انتقال 20 دسمبر کو ہوگیا۔ وہ 91 برس کے تھے۔ الہ آباد کے دریاباد میں واقع اپنی رہائش گاہ پر

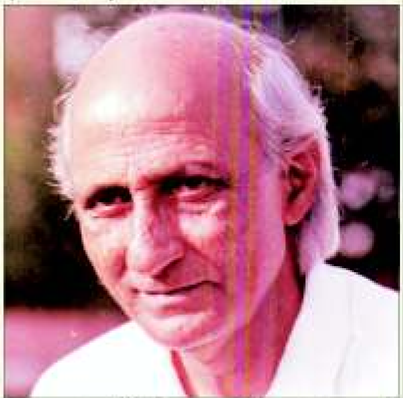

انھوں نے آخری سانس لی۔ پروفیسر عقیل رضوی کا شمار ترقی پسند تنقید کے معماروں میں ہوتا ہے۔ ترقی پسند تحریک اور ترقی پسند ادب کے دفاع میں ان کی تحریریں ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ وہ ایک درجن سے زائد کتابوں کے مصنف تھے۔ انھوں نے اردو مثنوی پر خصوصیت کے ساتھ کام کیا۔ مثنوی کی تنقید کے تعلق سے ان کی تصانیف کی بہت اہمیت ہے۔ اس سلسلے میں قابل ذکر کتابوں میں 'اردو مثنوی کا ارتقا' بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ ان کی دیگر کتابوں میں 'اصول تنقید'، 'ترقی پسند تنقید کی تنقیدی تاریخ'، 'تنقید اور عصری آگاہی'، سماجی تنقید اور تنقیدی عمل'، 'غزل کے نئے جہات' اور 'مرثیہ کی سماجیات' وغیرہ شامل ہیں۔ 1854 میں پروفیسر عقیل رضوی کی الہ آباد یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں تقرری ہوئی اور 1990 میں آپ وہاں سے ریٹائرڈ ہوئے۔ آپ کئی برس تک شعبے کے صدر بھی رہے۔ سید رضوی کے شاگردوں کی طویل فہرست ہے۔ آپ نے کئی رسالے بھی نکالے۔ ان میں 'شب رنگ' اور 'اندازے' قابل ذکر ہیں۔ پروفیسر عقیل رضوی کی وفات 'اردو دنیا' کا بڑا خسارہ ہے۔ عقیل رضوی کی رحلت پر بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے سابق صدر پروفیسر یعقوب یاور سمیت بڑی تعداد میں ادبی وسماجی شخصیات نے اظہار تعزیت کیا ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 21 دسمبر 2019

شاہین سہسرامی

سہسرام: معروف شاعر شاہین سہسرامی کا 11 دسمبر کو انتقال ہوگیا۔ مرحوم کی عمر 89 سال تھی۔ وہ دو سال سے صاحب فراش تھے۔ ان کے دو شعری مجموعے بھی ہیں، پہلا چاندنی کے پھول اور دوسرا آتش گل۔ مرحوم ایک معزز سرکاری ملازم تھے۔ ان کے شاگرد معروف شاعر شکیل سہسرامی نے بتایا کہ انھوں نے صحافت بھی کی، جوانی کے دنوں میں وہ کلکتہ کے ایک اردو اخبار سے بھی وابستہ رہے۔ پسماندگان میں چار بیٹے اور ایک بیٹی شامل ہیں۔ ان کے جنازے کی نماز بدھ 11 دسمبر کو بعد نماز ظہر احاطہ قدیریہ وحیدیہ محلہ کرن سرائے سہسرام میں ادا کی گئی ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 11 اکتوبر 2019

افضل جائسی

پریاگ راج: ملک کے معروف اور بزرگ شاعر افضل جائسی کا 17 دسمبر کو انتقال ہوگیا۔ ان کی نماز جنازہ بعد نماز ظہر بیدن ٹولہ کے کشادہ میدان میں ادا کی گئی اور مرحوم کے جسد خاکی کو حسن منزل کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ مرحوم کے جنازے میں کثیر تعداد میں ائمہ مساجد، دانشوران، عالم دین، شعرا اور معزز شخصیات نے شرکت کی۔ مرحوم کی عمر تقریباً 80 سال تھی، وہ کچھ دنوں سے علیل رہنے لگے تھے۔ ان کے پسماندگان میں تین بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔ اہلیہ کا پہلے ہی انتقال ہو چکا تھا۔ ان کی خوش اخلاقی اور زندہ دلی کی وجہ سے اہل محلہ کے علاوہ پورا شہر انھیں قدر کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ مرحوم دل لکھنوی، حق کانپوری، ماہر الحمیدی، ڈاکٹر اقبال ماہر، ڈاکٹر انعام حنفی، عتیق الہ آبادی، حمید قیصر، شفیق الہ آبادی، مبارک شاد، عزیز الہ آبادی وغیرہ کے ہم عصروں میں سے تھے۔ مرحوم ایک اچھے شاعر ہونے کے ساتھ عمدہ انسان بھی تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 دسمبر 2019

خراج عقیدت :

ڈربی شاعر کلب نے منائی امراؤ جان کی برسی

وارانسی: امراؤ جان کی برسی ڈربی شاعر کلب نے جمعرات کو منائی۔ درگاہ فاطمان کے نزدیک مزار پر گل پوشی کرنے، فاتحہ پڑھنے وشمع روشن کرنے چند لوگ ہی پہنچے۔ برسی کے موقعے پر ڈربی شاعر کلب کے صدر شکیل احمد جادوگر نے کہا کہ اپنے زندگی کے آخری دنوں میں امراؤ جان بنارس آگئی تھیں اور انھوں نے یہیں پر آخری سانس لی تھی۔ ان کی وصیت کے مطابق اس زمانہ میں لوگوں نے درگاہ فاطمان کے بغل میں کالی مسجد کے قبرستان میں سپرد خاک کیا۔ شکیل احمد جادوگر نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ مزار تک جانے کے لیے رہنما بورڈ لگنا چاہیے تاکہ آنے جانے والے لوگوں کو اس بات کی اطلاع ہوجائے کہ یہیں پر امراؤ جان کا مزار ہے۔ گلپوشی کرنے والوں میں چشتی بنارسی، حیدر مولائی، آفاق حیدر، راجیو ورما سمیت ایک درجن لوگ موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 27 دسمبر 2019

غالب کے 222ویں یوم ولادت کی تقریب

نئی دهلی: غالب اکادمی، نئی دہلی میں ہر سال کی طرح اس سال بھی غالب کے 222 ویں یوم ولادت کے

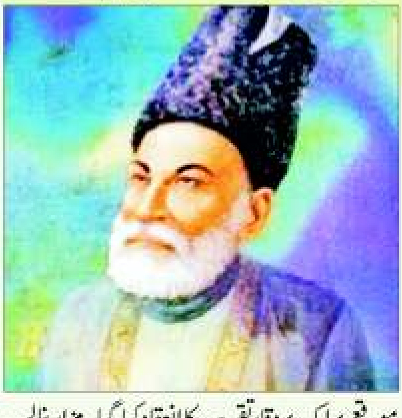

موقعے پر ایک پروقار تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ مزار غالب پر ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں نے گل پوشی اور فاتحہ خوانی کی۔ تقریب کی صدارت پروفیسر شمیم حنفی نے کی۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ ہم غالب کے بارے میں ہر سال تقریب کرتے ہیں، ہر سال ایک نئی بات معلوم ہوتی ہے۔ غالب پرانے نہیں پڑتے۔ ان کے کلام میں ہمیشہ تازگی پائی جاتی ہے۔ غالب دنیا کے بڑے شاعر تھے۔ ان کے معاصرین میں ہندوستان کا کوئی شاعر ان کے مدمقابل نہیں تھا۔ غالب کی شاعری دیواریں نہیں بناتی وہ دروازے بناتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری کے ترجمے ہر زبان میں ہوتے ہیں۔ غالب صرف زبان کے شاعر نہیں تھے، صرف فارسی دانی کی وجہ سے مشہور نہیں ہوئے۔ غالب اپنے ویژن کی وجہ سے زندہ ہیں۔ ان کا

وژن انسان دوستی ہے، انسان دوستی کی ضرورت ہمیشہ ہے اور رہے گی۔ اس لیے غالب آج کا شاعر ہے۔ اس موقعے پر بنارس کے سوامی نے کہا کہ غالب صوفی مزاج تھے۔ حضرت نظام الدین اولیا، امیر خسرو اور پھر غالب سے ہمارا رستہ قائم ہوتا ہے۔ غالب کی شاعری کو ہم ٹکڑوں میں نہیں دیکھ سکتے۔ ان کی شاعری میں سب کچھ موجود ہے اس لیے وہ عاشق نہیں معشوق ہے۔ اس کے چاہنے والے بے شمار ہیں۔ اس موقعے پر امبیڈکر یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر پروفیسر سلیل مسرا نے غالب کے فلسفیانہ پہلو پر لیکچر دیتے ہوئے کہا کہ غالب کے یہاں عالمگیریت ہے وہ کسی ایک وقت، جگہ سے وابستہ نہیں تھا۔ غالب کے یہاں کعبہ ہے تو کلیسا بھی ہے دہر بھی ہے۔ وہ غموں کے ساتھ دنیا میں جشن کے ساتھ جیتا ہے۔ آخر میں محفل کلام غالب آراستہ کی گئی سب سے پہلے ڈاکٹر آلوک گیتے چند نے غالب کے دو غزلیں موسیقی کے ساتھ پیش کیں اور بعد میں ممبئی کی غزل سنگر مدھو پارنا نے اپنے مخصوص لہجے میں غالب کی غزلیں موسیقی کے ساتھ پیش کر کے سامعین کو محظوظ کیا۔ اس محفل میں دہلی کی اہم شخصیات موجود تھیں۔

روز نامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 29 دسمبر 2019

سید ذوالفقار حسین عابدی صبا امروہوی

امروھہ: امروہہ کے بزرگ شاعر اور درس و تدریس سے وابستہ سید ذوالفقار حسین عابدی صبا امروہوی کے انتقال پر عالمی مرثیہ سینٹر کے چیئرمین ڈاکٹر عظیم امروہوی نے تعزیت پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ صبا امروہوی کی شکل میں رثائی ادب کا ایک قدر دان چلا گیا، وہ ایک بزرگ شاعر تھے اور بڑی عقیدت سے محمدؐ و آل محمدؐ کی ثنا کرتے تھے۔ انھوں نے ہر صنف سخن میں نمایاں خدمات انجام دیں لیکن وہ رثائی ادب کے دلدادہ تھے، مسلسل ہماری مقامی منقبتی محافل میں شرکت کرتے تھے، ان کے انتقال کے بعد ان کی کمی بہت محسوس کی جائے گی۔ ڈاکٹر عظیم امروہوی نے بتایا کہ صبا امروہوی رثائی ادب کے قدر دان تھے۔ ان کی شاعری مقدار کے حساب سے کم ہو سکتی ہے لیکن معیار کے حساب سے ان کا کلام میں کبھی نہیں رہا، وہ اپنی شاعری کو منظر عام پر نہیں لاتے تھے کیونکہ ان کے مزاج میں گوشہ نشینی تھی وہ کبھی شہرت کے پیچھے نہیں بھاگے جس کی وجہ سے ان کو وہ مقام اور شہرت نہیں ملی جس کے وہ حقیقی حقدار تھے۔

روز نامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 26 دسمبر 2019

جون ایلیا

امروھہ: مشہور و معروف شاعر جون ایلیا کے یوم پیدائش پر جون ایلیا کے آبائی مکان محلہ لکڑہ میں ایک پروگرام کا

انعقاد کیا گیا جس میں جون ایلیا کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ پروگرام کی صدارت ہاشمی ایجوکیشنل گروپ کے چیئرمین ڈاکٹر سراج الدین ہاشمی نے کی، مہمان خصوصی کے طور پر رخسار کمال نے شرکت کی۔ نظامت نوجوان شاعر سید شیبان قادری نے کی۔ اس موقعے پر بولتے ہوئے اسلم بقائی اور شباب انور نے کہا کہ جون ایلیا مشاعروں کے بڑے مقبول شاعر تھے۔ جس مشاعرے میں شرکت کرتے، مشاعرہ اپنے نام کرا لیتے۔ شعر پڑھنے کا ان کا انداز انوکھا اور انتہائی دلکش تھا۔

ڈاکٹر سراج الدین ہاشمی نے کہا کہ جون ایلیا، یہ نام سن کر ذہن میں ایک ایسے انسان کی تصویر گردش کرنے لگتی ہے جو دنیا سے بے نیاز، بے پروا، اپنی ہی دنیا میں مگن رہنے والا تھا جس کی شخصیت نرالی تھی، شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری کی گونج بھی لاکھوں شعرا میں الگ سنائی دیتی ہے۔ سید شیبان قادری نے کہا کہ جون ایلیا، یعنی ایک ایسا شاعر تھا جس نے دنیا کو شاعری کے ایک نئے ڈھنگ سے روشناس کرایا اور لفظوں کو ایک نیا پیراہن عطا کر کے لوگوں کو حیران کر دیا۔ جون ایلیا کی شاعری کی ایک بہت بڑی خوبی یہ بھی تھی کہ وہ اپنے محبوب سے براہ راست مخاطب ہونا پسند کرتے تھے۔ انھوں نے دوسرے شاعروں کی طرح بادلوں، ہواؤں اور پھول و خوشبو کو ذریعہ خطابت سے پرہیز کیا۔

ڈاکٹر ناصر امروہوی نے کہا کہ تلخ حالات ہوں اور اپنی طبیعت و احساس کا اظہار کرنا ہو، تو انھوں نے اپنے محبوب کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھ کر بات کی اور وہ بھی بالکل مختلف انداز میں۔ رخسار کمال نے کہا کہ جون ایلیا کی شاعری کا کینوس بہت وسیع ہے، وہ اپنے منفرد لب و لہجہ اور شخصیت کی بدولت ہر خاص و عام میں مقبول ہوئے۔

ان کے لہجے میں بے باکی، انانیت، بے ساختگی اور خودداری نظر آتی ہے۔

روز نامہ 'میرا وطن' دہلی، 16 دسمبر 2019

انور جلال پوری

امروھہ: مشہور و معروف ناظمِ مشاعرہ و شاعر انور جلال پوری کے یومِ وفات پر بزمِ زندہ دلانِ امروہہ کی جانب سے ہاشمی کالج میں ایک پروگرام کا انعقاد کیا گیا جس میں انور جلال پوری

کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ پروگرام کی صدارت ہاشمی ایجوکیشنل گروپ کے چیئرمین ڈاکٹر سراج الدین ہاشمی نے کی۔ مہمانِ خصوصی سابق چیئرمین ڈاکٹر افسر پرویز اور انوار صمدانی رہے۔ نظامت نوجوان شاعر سید شیبان قادری نے کی۔ اس موقعے پر بولتے ہوئے ڈاکٹر افسر پرویز نے کہا کہ میرے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ انور جلال پوری ایک اچھے شاعر اور ناظم مشاعرہ تھے یا ایک بہترین نثر نگار۔ سچی بات یہ ہے کہ وہ جتنے اچھے شاعر اور ناظم تھے اتنے ہی اچھے نثر نگار بھی تھے۔ انھوں نے جس طرح شاعری اور نظامت میں اپنا ایک انفرادی رنگ قائم کیا تھا اسی طرح نثر نگاری میں بھی ان کی اپنی انفرادیت ہے۔ انوار صمدانی نے کہا کہ انور جلال پوری نے اپنی پوری زندگی مشاعروں کی نذر کر دی۔ ان کا قلم مشاہداتِ ذات کو اس طرح صفحہ قرطاس پر بکھیر دیتا تھا کہ ایک بے حد خوبصورت تصویر ہمارے سامنے آجاتی تھی۔ سید شیبان قادری نے کہا کہ انور جلال پوری مشاعرے کی نظامت کا ایک روشن حوالہ تھے۔ انور جلال پوری کے انتقال کو 2 سال کا وقفہ بیت چکا ہے لیکن ان کی نظامت آج تک لوگوں کے ذہن کے پردے پر فلم کی مانند چل رہی ہے۔ ڈاکٹر سراج الدین ہاشمی نے کہا کہ عالمی شہرت یافتہ شاعر اور نقیب مشاعرہ انور جلال پوری کا انتقال اردو شعر و سخن کا ایک ناقابل تلافی خسارہ ہے۔ انور جلال پوری نے اردو زبان و ادب کی ثروت میں گراں قدر اضافہ کیا ہے جسے ادبی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ انھوں نے بھگوت گیتا اور گیتا نجلی

جیسے شاہکاروں کے ترجمے اردو میں کیے جو ہر طبقے میں قدر کی نگاہ سے دیکھے گئے۔ آخر میں ان کی مغفرت کے لیے دعا کی گئی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر رضوانہ کلثوم، آصف علی، نیلم رستوگی، سشما شرما، راج کمار، ونے کمار، یوگیندر کمار، وید پرکاش، سلمان عباسی وغیرہ موجود رہے۔

روزنامہ 'میراوطن' دہلی، 3 جنوری 2020

عالمی اردو نامہ

برطانیہ میں شاعری کے ذریعے علاج کرنے والا دواخانہ

لندن: برطانیہ کے ایک چھوٹے سے شہر میں سڑک کنارے ایک دکان ہے جس کے باہر 'پوئٹری فارمیسی' یعنی شاعری دواخانہ لکھا ہے۔ یہ شاعرانہ کلینک شراپ شائر کے علاقے بشپ کاسل میں واقع ہے۔ یہ دنیا کی پہلی دکان ہے جس کی مالکن ڈیبر ایلما خود شاعری کرتی ہیں اور یہاں آنے والے مریضوں سے ان کی کیفیت کا مکمل احوال سننے کے بعد انھیں کاغذ پر چھپا شاعری کا نسخہ بطور دوا تجویز کرتی ہیں۔ یہ نسخہ مریض ریفریجریٹر یا اپنے پڑھنے کی میز کے پاس لگا سکتے ہیں تاکہ بار بار دیکھ کر اسے پڑھا جا سکے۔ ان کی دکان میں لوگوں کے 'موڈ' کے لحاظ سے کتابیں بھی رکھی ہوئی ہیں کیونکہ وہ سمجھتی ہیں کہ شاعری، شکستہ دل، اداس لمحات اور پریشان خیالی سمیت جیسے کئی نفسیاتی عارضوں کا بہترین علاج ہے۔ ڈیبرا نے بتایا کہ درست شخص کے لیے درست شاعری کا انتخاب ہی اصل کام ہے۔ اس کے لیے پہلے میں مریض سے تفصیلی بات چیت کرتی ہوں۔ مجھ سے شاعری کا نسخہ لے جانے والے خواتین و حضرات اس کے مالک ہوتے ہیں اور جسے وہ گھر لے جاکر بار بار پڑھ سکتے ہیں۔ وہ کئی برس سے ڈیمنشیا کے مریض کے لیے شاعری تجویز کر رہی ہیں۔ وہ ہر مریض کی بات غور سے سنتی ہیں اور انھیں کاغذ پر منتقل کرتی ہیں تاکہ مریض کی ہر بات کو اہمیت دی جا سکے۔ انھوں نے ایک ایمبولینس بھی خریدی ہے جس پر 'ایمرجنسی شاعر' لکھا ہے اور وہ ملک بھر میں گھوم کر لوگوں کو شفائیہ شاعری تقسیم کرتی ہیں۔ ان کے خیال میں جس طرح دعا کا اثر ہوتا ہے، اسی طرح شاعری کا بھی مثبت اثر ہوتا ہے۔ دنیا کے ماہرین اب اس جانب غور کر رہے ہیں کہ فنونِ لطیفہ اور شاعری بھی انسانی مزاج پر اچھا اثر ڈال سکتی ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 1 جنوری 2020

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

150 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر............................ بتاریخ.................................... بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/150 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: SYNB0009009 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.:sales@ncpul.in

دستخط

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

لفظ (کچھ نظمیں اور غزلیں)

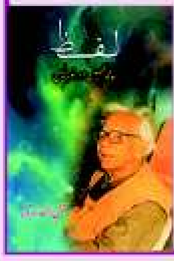

مصنف: آل احمد سرور

دوسری طباعت: 2019

صفحات: 95

قیمت: 70 روپے

کہانی رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی

مصنف: میر انشاء اللہ خاں انشا دہلوی

پہلی اشاعت: 2019

صفحات: 30

قیمت: 35 روپے

مثنوی مولانا روم (جلد اوّل، دوم، سوم، چہارم، پنجم، ششم)

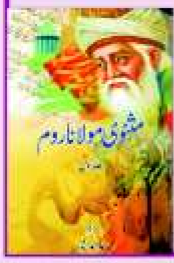

مترجم: سید احمد ایثار

پہلی اشاعت: 2019

صفحات: 223 (جلد اوّل)، 191 (دوم)، 251 (سوم)، 200 (چہارم) 238 (پنجم)، 256 (ششم)

قیمت: 780 روپے (فی سیٹ)

صحت الفاظ

مصنف: سید بدر الحسن

ساتویں طباعت: 2019

صفحات: 253

قیمت: 90 روپے

مولانا ابوالکلام آزاد: ایک مطالعہ

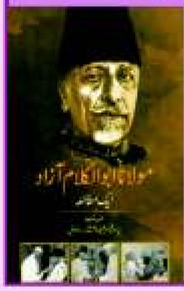

مرتب: پروفیسر عبدالستار دلوی

دوسری طباعت: 2019

صفحات: 474

قیمت: 215 روپے

قطبی علاقے کیا ہیں؟

مصنف: ہایانون

اردو مترجم: انیس الحسن صدیقی

پہلی اشاعت: 2019

صفحات: 20

قیمت: 20 روپے

کہکشاں (اقبال کے بعد نظمیہ شاعری)

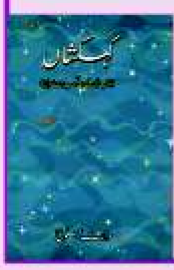

مصنف: وارث علوی

پہلی اشاعت: 2019

صفحات: 527

قیمت: 240 روپے

عام لسانیات

مصنف: پروفیسر گیان چند جین

تیسری طباعت: 2019

صفحات: 910

قیمت: 395 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

URDU DUNIYA Monthly, February-2020, Vol.22, Issue:02
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2020-22
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:**24/01/2020**
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025